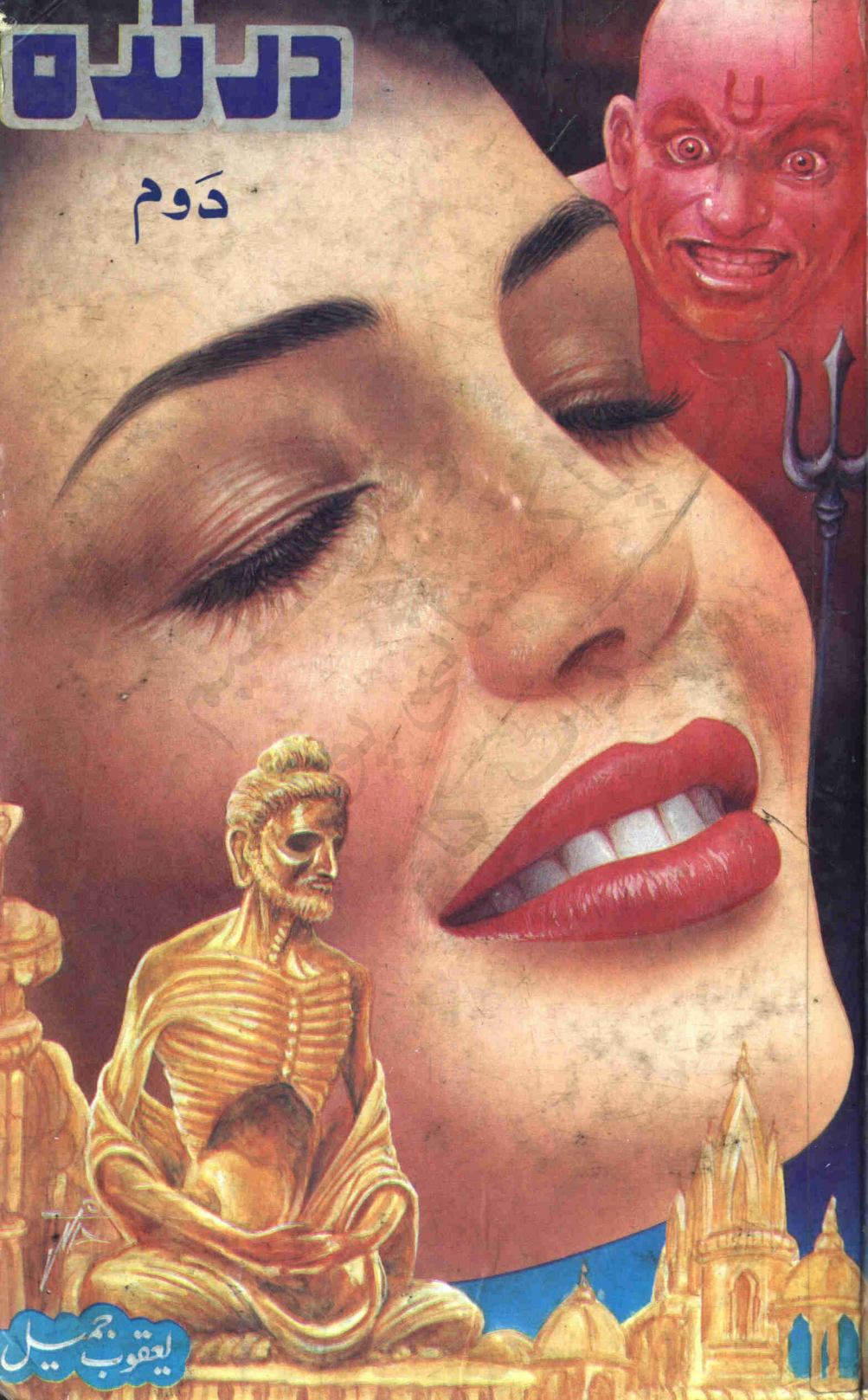


# درشہ

دوم



ایقوب جمیل

بڑے ہی غیر یقینی سے حالات پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ ایک طرف ”ٹائم بم“ کی فائل لے کر میلے میں چلے جانے والا سندھی سیٹھ رام چندر بدھ سے قبل واپس آنے والا نہیں تھا اور دوسری طرف ایک لاکھ بیس ہزار روپے کے عوض کچھ اہم معلومات فراہم کرنے کے لیے اسی چینی نے رگھوپتی کو منگل کے روز ملنے کے لیے کہا تھا۔ چینی نے ٹیلی فون پر رگھوپتی سے ملنے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ بھی بدھ تک کے لیے ملتوی ہو گیا تھا۔ کیونکہ چیانگ نے سلطانہ بیگم کے گھر کا جو نمبر لکھایا تھا وہ منگل کے روز آؤٹ آف آرڈر تھا۔ اس لیے ملاقات کی جگہ کے بارے میں کوئی بات چیت نہیں ہو سکتی تھی۔

وجہ اور رگھوپتی نے کئی بار ڈائل گھا کر نمبر ملانے کی کوششیں کیں لیکن ہر بار انکمیج جیسی ٹون ہی سنائی دیتی رہی۔ تنگ آکر انہوں نے ایسیجیج کے آپریٹر سے مدد مانگی لیکن آپریٹر نے بھی معذوری ظاہر کر دی تھی۔ البتہ آپریٹر نے ان سے یہ ضرور کہا تھا کہ یا تو وہاں کا فون خراب ہے یا پھر گھر والوں نے کریڈل نیچے رکھ دیا ہے۔ رگھوپتی کو اس بات پر یہ شک ہوا کہ کوئی گزبڑ ضرور ہے لیکن وجہ نے چونک کر کہہ دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ اگر واقعی فون خراب ہے تو اس کا علم جولی کو تو ہونا ہی چاہیے کیونکہ وہ بھی اسی گھر میں رہتی ہے۔“

پھر جب انہوں نے آسٹریلیا ایبسی کا فون ملا کر جولی سے رابطہ قائم کیا تو دوسری جانب سے جولی نے کہا تھا۔ ”میں ایک گھنٹے سے تم لوگوں کو فون کر رہی ہوں یہ بتانے کے لیے کہ سلطانہ بیگم کے گھر کا فون صبح سے خراب ہے۔ وہ صبح کو بار بار بڑبڑا رہی تھی آج ٹیلیفون کا اہم کام تھا اور یہ آج ہی خراب ہو گیا ہے۔ میں نے بھی یہاں سے کوشش کی تھی لیکن ابھی تک فون کی خرابی دور نہیں ہوئی ہے۔“

”تمہیں؟“ جولی کو ساتھ لے جانا کچھ مناسب نہیں لگا تھا اس لیے وجہ نے جواب سوچ لیا۔ ”تم نیچے جا کر آشا سے باتیں کرو۔ جب سے رگھوپتی میاں آیا ہے اس وقت سے اس نے اپنا منہ نہیں دکھایا۔ ہم نے اپنا کھانا اوپر منگوایا تو بھی اس نے

یہ سنتے ہی رگھوپتی کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے رلیسور پر اپنا ہاتھ اس طرح رکھ دیا کہ یہاں کی آواز دوسری جانب سنائی نہ دے۔ اس احتیاط کے بعد وہ جولی سے بولا۔ ”تمہاری اس سلطانہ کی آواز میں بڑی مٹھاس ہے۔“ جواب میں جولی یہ کہنا چاہتی تھی کہ آواز پر ہی جب یہ حالت ہے تو اسے دیکھ لینے کے بعد تو بے ہوش ہی ہو جاؤ گے۔ وہ بہت خوبصورت ہے مگر عمر میں تم سے ساٹھ آٹھ برس بڑی ہے لیکن جولی کو بولنے کا موقع ہی نہیں ملا کیونکہ دوسری جانب سے چیاگ کی آواز پہچان لینے کے بعد رگھوپتی نے اس سے باتیں کرنا شروع کر دیں

رگھوپتی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ صادق علی کو شاباش دینا چاہتا تھا لیکن شاید کام ہو جانے سے پہلے ایسا کرنا اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا اس لیے وہ



محسوس ہوئی تھی اور شاید اسی لیے اس کا شک دور ہو گیا۔ ”تو آپ ہی ہیں پرشورام۔۔۔“ صادق علی نے جب وہ فائل مجھے دی تھی تو اس وقت مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس میں اتنا مسالہ بھرا ہوا ہو گا۔ ”ہم“ کی سرخی پڑھ کر میں نے سوچا تھا کہ اندر کوئی جاسوسی کہانی ہو گی اس لیے سفر کے وقت اسے ساتھ لے گیا تھا تاکہ راستے میں پڑھوں گا۔ اصل میں جاسوسی کہانیاں پڑھنے کا مجھے شروع ہی سے شوق ہے۔ اس ردی میں بھی جب کوئی اچھی کہانی نظر آ جاتی ہے تو پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں اور جب تک ختم نہ کر لوں اس وقت تک چین نہیں آتا۔“

ٹھیک اسی وقت کولڈ ڈرنک کی تین بوتلیں لے کر ہوٹل کا ایک لڑکا اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی رام چندر نے ہوشیاری سے بات بدل دی اور ہنستے ہوئے بولا۔ ”بس جناب اسی دو مہینے تک دہلی میں شدید گرمی پڑتی ہے۔ ویسے تو آپ کے الہ آباد میں بھی کافی گرمی پڑتی ہے۔“

”لیکن اپنے وطن کی گرمی کے ہم عادی ہوتے ہیں۔“ وجے نے یہ بات اس طرح کہہ دی جیسے وہ الہ آباد کا ہی رہنے والا ہو۔ اس فائل کو حاصل کرنے کے لیے وہ بے چین تو تھا ہی لیکن اپنی بے چینی کا وہ اظہار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”سیٹھ صاحب اب مجھے یہ تو بتائیے کہ آپ کو ٹائم بم میں کون سی بات پر زیادہ مزہ آیا؟“

”مزہ کیا؟ مجھے تو سخت صدمہ ہوا ہے۔“ رام چندر نے جواب دیا۔ جسے سن کر وجے ذرا الجھن میں پڑ گیا اور سوچنے لگا کہ اس نے فائل میں لکھی ہوئی کہانی پڑھی تو نہیں ہے لیکن اسے رام چندر پر تو یہی ظاہر کرنا ہو گا کہ وہی اس کہانی کا مصنف ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے کہا۔ ”تب تو میری محنت بے کار نہیں گئی میری تو خواہش بھی یہی تھی کہ اس کہانی کے پڑھنے والے کو ذرا دکھ اور صدمہ پہنچے۔“

”اور تو اور پڑھتے پڑھتے بار بار ذہن میں یہی سوال ابھرتا رہتا ہے کہ ہم جس شخص کو اس قدر عظیم آدمی سمجھ رہے ہوتے ہیں وہ اندر سے بدکردار اور قابل نفرت بھی ہو سکتا ہے؟ رعایا کو اپدیش دینے والا غریبوں سے ہمدردی جتانے والا اور ان کے حقوق کے لیے لڑنے والا ان سب کاموں کی آڑ میں کتنے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب

ابھی آجائیں گے۔“

دونوں ان بنڈلوں پر بیٹھ گئے تو صادق نے پنکھا چلا دیا اور ٹھیک اسی وقت رام چندر اندر داخل ہو کر بولا۔ ”معاف کیجئے گا آپ لوگوں کو اس طرح اندر بیٹھا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے صادق کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”صادق جاؤ مہمانوں کے لیے کولڈ ڈرنک کا بول دو اور پھر تم باہر ہی بیٹھنا۔“

”ٹھیک ہے سیٹھ۔“ کہہ کر صادق وہاں سے کھسک گیا۔ اس کے جانے کے بعد رام چندر نے اخباروں کا ایک بنڈل ان کے سامنے رکھ دیا اور پھر اس پر بیٹھنے کے بعد بولا۔ ”آپ اگر پرشورام ہیں تو یہ صاحب۔۔۔“ اس نے رگھوپتی کی طرف دیکھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”یہ میرے گھرے دوست ہیں۔“ وجے نے نام ظاہر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ”اس فائل کے متعلق انہیں سب کچھ معلوم ہے۔“

رام چندر سیٹھ نے باری باری دونوں کو اس طرح دیکھا جیسے کوئی اہم سودا طے کرنا چاہتا ہو۔ ”لیکن آپ ہی پرشورام ہیں ایسا تو لگتا نہیں ہے۔“ یکایک اس نے وجے کی جانب گردن گھما کر کہا۔

یہ سن کر وجے اور رگھوپتی دونوں ہی چونک پڑے۔ انہیں رام چندر سیٹھ بہت ہی چالاک اور عیار شخص نظر آنے لگا تھا مگر وجے کو تو جواب دینا ہی تھا۔ اس لیے وہ جلدی سے بولا۔ ”لیکن آپ نے ایسا کیسے سمجھ لیا سیٹھ صاحب؟“

”اس تحریر کو پڑھنے کے بعد تو یہی لگا تھا کہ اسے کسی بہت ہی دکھی مصنف نے لکھا ہو گا۔“ رام چندر سیٹھ ہنس کر بولا۔

”لیکن مصنفوں کا دکھ ان کے جسم پر نہیں بلکہ ان کے دلوں میں ہوتا ہے۔“ یہ فقرہ کہہ دینے کے بعد وجے کو اپنے آپ پر حیرت سی ہونے لگی کہ اتنی اچھی اور خالص ادبی بات اس نے کس طرح کہہ ڈالی؟ ”لگتا ہے آپ نے پوری فائل پڑھ لی ہے؟“ وجے نے مسکراتے ہوئے آگے کہا۔ ”کہتے پڑھتے وقت کہیں بوریت تو محسوس نہیں ہوئی؟“

اس کے اس سوال میں رام چندر سیٹھ کو واقعی کسی ادیب کے تجسس کی جھلک

ہندی پر پہنچنے کے لیے کیا اتنی گھٹیا اور ذلیل حرکتیں بھی کر سکتا ہے؟ جیسا کہ دیش کے اس لیڈر نے کیا ہے۔ انتقام لینے والے نے تو اتنا بھیانک انتقام لیا کہ وہ عورتوں کے قاتل ہی نہیں رہا لیکن اس کے دل کی شیطانی خواہش اور بھڑک اٹھی اور وہ لڑکیوں کو اپنی ترقی کے لیے زینے کے طور پر استعمال کرنے لگا۔



کرتا پھرتا ہے اور کوئی اسے روکنے والا ہی نہیں ہے۔“ کہہ کر سندھی سیٹھ رام چندر نے ٹھنڈا پانی حلق سے اتارنے کے لیے کولڈ ڈرنک کی بوتل کو منہ لگا لیا مگر اس وقت وجے کے منہ سے نکل گیا۔ ”یہ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟“ مگر پھر فوراً ہی اسے سنبھل جانا پڑا کیونکہ اچانک ہی اسے خیال آگیا کہ اس طرح کے سوالات سے تو اس کا اپنا بھانڈا ہی پھوٹ جائے گا کہ وہ اس کہانی کا مصنف نہیں ہے۔ بہتر تو یہی ہے کہ کچھ پوچھنے کی بجائے چپ چاپ اس کی باتیں سن کر کچھ جان لیا جائے اور پھر آخر میں فائل واپس مانگ لی جائے۔

”ارے مہربان! ایک غریب برہمن خاندان میں پیدا ہونے والا، مصیبتوں اور تکلیفوں میں پڑھ لکھ کر جوان ہونے والا اور جس نے اپنے دل میں اپنے دیش کے لوگوں کی خدمت کا جذبہ لے کر اپنا گھر بار چھوڑ دیا ہو وہ شخص اس قدر بدکردار کیسے بن گیا ہو گا؟ جوان لڑکی کو دیکھ کر اپنے اصول اپنی شرافت اور اپنی حیا شرم کو ایک طرف رکھ کر شکاری کتے کی طرح ان کے پیچھے کیسے پڑ جاتا ہو گا؟“ رام چندر کے ایک ایک لفظ پر رگھوپتی کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اور رام چندر کو جو جو باتیں یاد آتی جا رہی تھیں وہ انہیں دہراتا جا رہا تھا لیکن اسے بھی کوئی سوا سیر مل گیا۔ ”رام چندر نے ایک پل ٹھہر کر آگے کہا۔ ”اس نے ایک لڑکی پر حملہ کیا تو لڑکی کے بھائی کو اس کی خبر ہو گئی۔ دوسرا کوئی ہوتا تو غصے میں اسے قتل کر دیتا لیکن اس نے تو بڑی گہرائی سے اپنا انتقام لیا۔“ یہ سن کر رگھوپتی اور وجے دنگ رہ گئے اور رگھوپتی پوچھ بیٹھا۔

”پھر کیا ہوا رام چندر جی؟“

اس کا سوال سن کر رام چندر چونک پڑا اور اس نے شک کی نظروں سے وجے کی جانب دیکھا۔ وجے اس کی نظروں کو دیکھ کر کانپ گیا لیکن فوراً ہی سنبھل کر بولا۔ ”رام چندر جی اصل میں میرے اس دوست نے ابھی تک اسے پڑھا نہیں ہے اور میری ایک خاصیت ہے کہ میں اپنی لکھی ہوئی تحریر کسی کو نہیں سنا تا۔“

”تمہاری بات درست ہے پر شورام۔“ رام چندر نے دھیرے سے کہا۔ ”جو مزہ پڑھنے میں ہے وہ سننے میں کہاں ہے؟ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں اس کے ایک واقعے نے تو میرے دل پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ آدمی

نام سننے کے لیے بے تاب تھا وہی الٹا اس سے پوچھ رہا تھا ”آخر فائل میں سے نام کا نکلا کس نے کاٹ لیا ہو گا؟ اور اب وہ رام چندر کو کیا جواب دے؟ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ یکایک رام چند کی آواز پھر اس کی سماعت سے نکلرائی۔“ وپسے آپ نے اس کے نام والا نکلا پھاڑ کر اچھا ہی کیا ہے کیونکہ اگر فائل کسی اور کے ہاتھ میں چلی جاتی تو وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا اور ایسا ہو جاتا تو وہ کمائی کتابی صورت میں کبھی بھی شائع نہیں ہو سکتی تھی۔“

”پہلے اس کا نام میں نے قلم سے کاٹ دیا تھا۔ اب وجے کو اپنا جھوٹ جاری رکھنا پڑا۔“ پھر خیال آیا کہ اس کو پڑھ لینا بھی آسان ہو سکتا ہے اس لیے کانڈ کا نکلا ہی پھاڑ ڈالا۔ مگر اس وقت یہ کہاں معلوم تھا کہ۔

فائل جج جج ہی کھو جائے گی۔“

”لیکن رام چندر جی یہ بات بڑی اچھی ہوئی کہ وہ فائل ایک جاہل صادق علی کے ہاتھ لگی اور اس نے آپ جیسے پڑھے لکھے اور شریف آدمی کے ہاتھ میں اسے سوپ دیا۔“ کافی دیر بعد رگھوپتی نے کچھ کنا ضروری سمجھا۔ اس لیے بول پڑا۔ ”آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ فائل واپس ہی نہ کرتا۔“

”ارے ایسا ہو سکتا ہے؟“ رام چندر سیٹھ کے اس جملے نے انہیں خاصی الجھن میں ڈال دیا۔ ایک پل کے لیے تو دونوں کو ہی یوں لگا تھا کہ رام چندر ابھی اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ فائل ان کے حوالے کر دے گا لیکن اس کی اگلی بات نے ان دونوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ رام چندر اپنے مخصوص لہجے میں کہہ رہا تھا ”دیوی دیوتاؤں کے درشن کر لینے کے بعد آدمی کا دل بہت پاک صاف ہو جاتا ہے اس لیے یا ترا سے واپس آتے ہی میں نے سب سے پہلا کام بھی یہی کیا کہ وہ فائل جس کی تھی اسے لوٹا دی۔“

یہ سنتے ہی وجے کو یوں لگا کہ وہ جس کانڈ کے بنڈل پر بیٹھا ہے اس کے اندر کوئی زور دار بم پھٹا ہو۔ مگر اس سے زیادہ زور دار جھٹکا تو رگھوپتی نے محسوس کیا تھا۔ رام چندر کسی اور ہی خیال میں کھویا ہوا تھا۔ اس لیے وہ ان دونوں کی طرف دھیان نہیں دے سکا تھا۔

پہلے تو اس نے اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کو پھنسیا اور لڑکیوں کا نشہ پلا کر وہ خود وزیر بن گیا اس کے بعد اس نے صوبائی وزارت سے نکل کر سینٹرل گورنمنٹ میں آنے کے لیے دہلی پر اپنی نگاہیں جما دیں۔ پھر سینٹرل کے ایک سینئر وزیر کو لڑکیاں سپلائی کر کے اس نے اسے مٹھی میں کر لیا۔ بس پھر کیا تھا؟ اس نے دہلی کی منسٹری پر بھی قدم جما لیے اور اپنے آپ کو اس قدر مضبوط بنا لیا جیسے زندگی بھر کے لیے وزیر بن گیا ہو۔ اس طرح پچیس سال گزر گئے اس درمیان نہ جانے کتنے ہی وزیر آ کر چلے گئے لیکن اس کی کرسی اپنی جگہ پر مضبوطی سے جمی رہی۔“

رام چندر ایک سانس میں اتنی ساری باتیں کہہ کر ہانپنے لگا۔ وہ سانس لینے کے لیے رکا تو وجے کی بے چینی قابو سے باہر ہو گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جلد سے جلد فائل مل جائے تو وہ اس کا نام جان سکتا تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ رام چندر نے اسے ایک اور جھٹکا لگایا۔ ”لیکن پرشورام جی آپ نے لوگوں کی پیاس بڑھا کر انہیں پیاسا رکھ دیا۔ پڑھتے پڑھتے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ اس درندہ صفت آدمی کا نام جاننے کے لیے جلدی سے آخری صفحہ دیکھ لوں لیکن چون کہ میں جاسوسی اور سہنس قسم کی کمائیوں کا پڑھنے والا ہوں اس لیے درمیان میں کمائی کو چھوڑ دینا مجھے پسند نہیں آیا۔ پھر آخری صفحے تک تو پڑھنے میں مزہ آتا ہے مگر جب آخری فقرہ آیا کہ اس درندے کا نام ہے۔ تو بس وہیں اس آخری صفحے کا ایک نکلا پھٹ گیا تھا۔“ رام چندر اپنا منہ بگاڑ کر بولا ”کانڈ کو عین اسی جگہ سے پھٹا ہوا دیکھ کر میرا سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ اب تو جناب آپ ہی مجھے اس شیطان کا نام بتا دیں۔“

یہ سنتے ہی وجے کی کمر ڈھیلی ہو گئی۔ وہ خود جس کے منہ سے اس درندے کا

مجھے یہ بات ذرا پہلے معلوم ہو جاتی تو یہاں آکر میں آپ کا وقت نہ برباد کرتا۔  
 ”ارے جناب میرا وقت کہاں برباد ہوا ہے۔“ وجے کو اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے دیکھ کر رام چندر نے اس کے دونوں ہاتھ احترام سے تھام لیے اور التجا آمیز لہجے میں بولا۔ ”لیکن جانے سے پہلے مجھے اس درندے کا نام ضرور بتاتے جائیں۔“  
 وجے کی پیشانی پسینے سے بھگ گئی اسے یہ آخری لمحہ بھی کسی نہ کسی طرح سنبھالنا ہی تھا اس لیے وہ بولا۔ ”سیٹھ جی آپ یہ اطمینان رکھیے کہ کتاب شائع ہونے سے پہلے اس شخص کا نام آپ کو سب سے پہلے بتا دوں گا مگر ابھی نہیں۔“  
 ”کوئی بات نہیں۔“ رام چندر نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ ”واقعی کتاب شائع ہونے تک اس نام کو خفیہ رکھنے میں ہی سلامتی اور بہتری ہے۔“

اس وقت تک رگھوپتی اپنے دل کی بے چینی کو چھپاتا ہوا رام چندر رومی والے کی دکان سے باہر نکل چکا تھا لیکن وجے نے جاتے جاتے دھیمی آواز میں رام چندر سے پوچھ ہی لیا۔ ”فائل لینے کے لیے وہ اکیلی ہی آئی تھی یا کوئی اور بھی...؟“  
 ”وہ اکیلی ہی تھی۔“ رام چندر نے جواب دیا۔ ”یکسی میں آئی تھی اور یکسی میں بیٹھے بیٹھے ہی اس نے مجھ سے فائل لی تھی مگر ہاں آپ کی بہن بھی آپ کی طرح شرمیلی سی تھی۔ مجھے بخشش دینا اسے اچھا نہیں لگا ہو گا اس لیے مندر کے چندے کے طور پر سوا سو روپے مجھے دے گئی تھی۔ آپ میری طرف سے اس کا شکریہ ادا کر دیجئے گا۔“

یہ سن کر وجے نے ایک آخری سوال بھی پوچھ لیا۔ ”رام چندر جی وہ دیکھنے میں کیسی تھی؟“

”کیا مطلب؟“ رام چندر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اچانک ہی بول اٹھا۔ ”ارے ہاں اس کے چہرے کے خدوخال بالکل آپ جیسے ہی تھے اس کی شکل و صورت بہت ملتی تھی آپ سے۔“

وجے اس قدر تیزی سے باہر نکل گیا جیسے رام چندر کی بات نے اسے بہت زور سے دھکا دیا ہوا۔ اس کے نکل جانے کے بعد بھی دیر تک رام چندر ان دونوں کو دور جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

”پہلے تو یہ بات میری سمجھ میں ہی نہیں آئی کہ میں فائل کا کیا کروں؟“ تھوڑی دیر بعد رام چندر نے پھر کہا۔ ”تب میں نے فائل کے آخری صفحے پر لکھا ہوا نام پڑھا وہاں لکھا تھا ”بسواس پبلشر۔“

اتنا سنتے ہی وجے کا نعیم دھونکنی کی طرح اونچا نیچا ہونے لگا اور وہ پلکیں جھپکائے بغیر رام چندر کے چہرے کو گھور رہا تھا۔ چند لمحوں کی تاخیر کے بعد رام چندر آگے بولا۔ ”چاندنی چوک کے پتے کے نیچے ٹیلیفون نمبر بھی لکھا ہوا تھا اڑتیس، اٹھاسی اٹھاسی۔۔۔“

یہ بسواس پبلشر کے مالک بی کے اگروال کا فون نمبر تھا۔ اور اگروال کا خیال آتے ہی وجے کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ اس نے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے بالکل کنارے پر آکر اس کی کشتی ڈوب گئی ہو۔

”پھر جب میں نے وہ فون بر ملایا تو دوسری جانب سے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔“ رام چندر نے آگے بتایا۔ ”میں نے اسے بتایا کہ مجھے پرشورام سے کام ہے تو اس نے کام کی نوعیت جاننے کی کوشش کی۔ تب میں نے اس سے اتنا ہی کہا کہ ان کی ایک امانت میرے ہاتھ میں آگئی ہے۔ بس اتنا سنا تھا کہ وہ بے چین سی ہو گئی اور کہنے لگی۔۔۔۔ بھائی صاحب آپ کے لاکھ لاکھ احسانات ہوں گے فائل کے گم ہو جانے کے بعد سے تو میرے بھائی پرشورام کی حالت بہت ہی خراب ہو گئی ہے آپ جہاں کہیں گے وہیں آکر میں خود فائل لے جاؤں گی۔“

”تب تو وہ آکر فائل لے گئی ہو گی؟“ وجے نے ڈوبتی اور کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”اور آپ نے فائل اسے دی دے؟“

رام چندر سیٹھ نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا تو وجے کو اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا اور پھر اس کے منہ سے نکل گیا ”تو ہمیں دیر ہو گئی۔“

”کیا مطلب؟“ رام چندر نے چونک کر اس کے طرف دیکھا۔ ”کیا مجھے وہ فائل آپ کی بہن کو نہیں دینی چاہیے تھی؟ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ۔۔۔۔“

”نہیں نہیں سیٹھ جی۔۔۔ آپ بے فکر رہیں۔“ وجے کو اپنے آپ پر قابو پا کر حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ”فائل آپ نے محفوظ ہاتھوں میں ہی پہنچائی ہے۔ لیکن اگر

”لیکن جولی یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ جولی کو ساری بات بتا دینے کے بعد وجہ نے اپنی الجھن کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”اس رام چندر رومی والے نے جب بسواس پبلشر کے مالک اگر وال کا نمبر ملایا تھا تو دوسری جانب سے فون اٹھانے والی روکھی کیسے ہو سکتی تھی؟“

فائل کی جانب سے ناامید ہو کر واپس آنے والے وجہ کو اس راز نے بہت زیادہ پریشان کر رکھا تھا۔ اسی لیے وہ سوچ کر کہتا جا رہا تھا۔ ”پیر کے روز جب میں نے فون پر روکھی سے بات کی تھی تو اس نے مجھے پرشورام ہی سمجھا تھا اور اسی حیثیت سے اس نے مجھے اگر وال سے ہوشیار رہنے کا مشورہ دیا تھا اور اب وہ خود اگر وال کے دفتر میں کیا کرنے لگی ہوگی؟“

”فرض کر لو کہ وہ کسی کام سے وہاں گئی ہوگی لیکن اگر وال کا فون اس نے کیوں اٹھایا؟“ جولی نے دلیل پیش کرتے ہوئے پوچھا۔ ”مگر کیا تمہیں اس کا یقین ہے کہ وہ نمبر اگر وال کے دفتر کا ہی تھا؟“

”یقین؟ وجہ اپنا سر کھجانے لگا پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”فائل کے کور کے آخری صفحے پر بسواس پبلشر کا نام لکھا ہوا تھا۔ جس کے نیچے وہ ٹیلیفون نمبر درج تھا اور اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بسواس پبلشر کا ہی فون نمبر ہے؟“ وجہ بولتے بولتے اچانک اس طرح اٹک گیا جیسے اس کی نظریں اگر وال کے دفتر میں پہنچ گئی ہوں۔ تھوڑی دیر تک اس کی آنکھوں کی پتلیاں گردش کرتی ہوئیں اگر وال کے دفتر کا منظر تازہ کرتی رہیں۔ پھر اچانک اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور وہ کھولی خونی سی آواز میں بولا۔ ”تمہارا اندازہ درست ہے جولی میں دوبارہ اگر وال کے دفتر میں جا چکا ہوں لیکن اس کی میز پر یا میز کے آس پاس مجھے کہیں بھی کوئی فون نظر نہیں آیا تھا۔“

”تب تو پھر وہ نمبر اس کے گھر کا ہی ہو گا۔“ جولی نے کہا۔ ”اور پرشورام نے یاد رکھنے کے لیے اسے فائل پر نوٹ کر لیا ہو گا۔“

”تمہاری یہ بات دل کو لگتی ہے۔“ وجہ نے ٹیلیفون کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں نمبر ملاتا ہوں ابھی پتا چل جائے گا کہ دوسری جانب سے اگر وال کی آواز سنائی دیتی ہے یا کسی اور کی؟“

تھری ایٹ... ڈبل ایٹ ڈبل ایٹ ڈائل کرنے کے بعد وجہ نے ریسیور کان سے لگا لیا اور دوسری جانب سے آنے والی آواز انتظار کرنے لگا۔ لیکن مسلسل اس کی ٹون سن کر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور ایک بار پھر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ”صرف آدھے گھنٹے کی تاخیر ہوئی تھی اور اس عرصے میں بازی پلٹ گئی۔ ہم اگر آدھے گھنٹے قبل رام چندر کے پاس پہنچ جاتے تو اس وقت فائل ہمارے ہاتھ میں ہوتی۔“

”کیا خبر... یہ ہمارے فائدے میں ہی ہو؟“ جولی نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کیا اس سندھی سیٹھ نے تمہارا چہرہ دیکھنے کے بعد کہا تھا کہ ٹیکسی میں آنے والی لڑکی کی صورت شکل تم سے ملتی جلتی تھی؟“

”ہاں جولی... اس نے تو یہ بھی مان لیا کہ میں پرشورام ہوں اور وہ لڑکی پرشورام کی بہن تھی۔“ اتنا کہہ کر وجہ نے ہاتھ بڑھا کر پھر ریسیور اٹھا لیا اور نمبر ملانے کے بعد جولی سے بولا۔ ”اگر وال بہت چالاک آدمی ہے۔ ممکن ہے اس نے کسی کو پرشورام کی بہن بنا کر فائل لانے کے لیے بھیج دیا ہو گا۔“ وجہ نے یہ کہہ کر دیا لیکن اسے جولی کا جواب سننے کا موقع ہی نہیں ملا کیونکہ ٹھیک اس وقت دوسری طرف کی گھنٹی بجنے لگی تھی اور پھر ”ہیلو“ کی آواز سن کر وہ بدحواس ہو گیا آواز کسی عورت کی ہی تھی اور بالکل ویسی ہی آواز تھی جیسی اس نے پیر کے روز فون پر سنی تھی۔

”ہیلو...“ کہہ کر اس نے پوچھا۔ ”تھری ایٹ ڈبل ایٹ ڈبل ایٹ...؟“

”جی ہاں...“ بہن کی آواز سن کر وجہ بے چین سا ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا بولے اور کیا پوچھے؟ آخر وہ بڑے ہی جذباتی لہجے میں بولا۔

”مجھے پہچانا؟“

”آواز تو کچھ جانی پہچانی سی لگتی ہے۔“ روکھی کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”مگر یاد نہیں آرہا ہے آپ کون ہیں؟“

”سراغ“ وجے اور جولی نے ایک ساتھ ہی پوچھا۔ ”کیسا سراغ؟“  
 ”کیوں؟ کیا اس سندھی سیٹھ نے فائل لے جانے والی لڑکی سے جس فون نمبر پر بات کی تھی وہ نمبر یاد نہیں ہے؟“ تھری ایٹ ڈبل ایٹ ڈبل ایٹ بس اب ”ون ٹائن سیون“ پر آپریٹر کو یہ نمبر دے کر گھر کا پتا پوچھ لو تو اپنی دوڑ بھاگ ختم۔“ رگھوپتی نے کہا اور ہاتھ روم میں گھس گیا۔

وجے اور جولی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہی رہ گئے۔ جیسے ایک دوسرے سے کہہ رہے ہوں ہم نے تو رگھوپتی کو روکھی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور نمبر کے ذریعہ پتا چلانے کے بعد وہ سیدھے وہیں چلنے کی ضد کرے گا۔  
 رگھوپتی نے ہاتھ روم کا دروازہ اندر سے بند کر کے اپنے لونگ بوٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر اپنا پستول نکال لیا اور پھر جلدی سے اسے اپنی پتلون کی جیب میں سرکا دیا وہ چیانگ سے ملنے پستول ساتھ لے کر گیا تھا اور اس کی خبر اس نے وجے کو نہیں ہونے دی تھی۔

”کیوں؟ فون نہیں لگ رہا ہے کیا؟“ ڈرائنگ روم میں واپس آکر رگھوپتی نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر آگے کہا۔ ”آج فائل کا پتا لگائے بغیر چین سے بیٹھوں گا بھی نہیں اور کسی کو بیٹھنے بھی نہیں دوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے خود ہی آپریٹر سے رابطہ قائم کرنے کے لیے ڈائل گھمایا تو وجے اور جولی کو یوں لگا کہ اگر پتے کے ساتھ رگھوپتی کو روکھی کا نام معلوم ہو گیا تو کیا ہو گا۔ ممکن ہے روکھی نے اپنا نام بدل لیا ہو لیکن اس کا پتا معلوم ہو جانے کے بعد تو وہ وہاں جانے کی ضد ضرور کرے گا۔ رگھوپتی کی یہ خاصیت تھی کہ اگر وہ کسی بات پر اڑ جاتا تو اسے روکنا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔

”ہیلو انکوائری“ دوسری طرف سے کسی نے فون اٹھایا تو رگھوپتی نے جلدی سے کہا۔ ”پلیز مجھے تھری ایٹ ڈبل ایٹ ڈبل ایٹ کا پورا پتا آپ دے سکتے ہیں؟“ دوسری طرف سے ہولڈ کرنے کے لیے کہا گیا تو اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”تھینک یو آئی ایم ہولڈنگ۔“

اس کے بعد وہ پتا نوٹ کرنے کے لیے بک اور بال پین تیار رکھ کر بیٹھ گیا۔  
 ”سوری جناب...“ تھوڑی دیر بعد اس نے آپریٹر کی آواز سنی... ”یہ نمبر ہماری

”جی..... میں.....“ وجے کو شش کے باوجود اپنی بات مکمل نہ کر سکا اور دوسری جانب سے ”سوری رائگ نمبر“ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔  
 ”وہی تھی..“ وجے نے ریسپور کو کریڈل پر رکھتے ہوئے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ”وہی آواز اور اس کے لہجے میں وہی بنارس انداز....“  
 ”اس کا مطلب کیا ہوا؟ کچھ سمجھ میں آیا؟“ جولی نے دھیان سے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا؟“

”یہی کہ ہمیں روکھی کا پتا مل گیا ہے۔“

”ارے ہاں۔“ وجے کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

تب یقیناً روکھی نے ہی ہماری فائل کو بچا لیا ہے۔ سندھی سیٹھ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کی شکل مجھ سے ملتی تھی۔“

”میں نے کہا تھا نا کہ بازی پلٹ گئی ہے تو شاید اپنے فائدے میں ہی ہو گی۔“  
 جولی نے دھیرے سے اس کے قریب آکر اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا دروازہ کھلا چھوڑ کر پیار کر رہے ہو۔“ یہ آواز سن کر دونوں چونک پڑے۔ کمرے کے دروازے پر رگھوپتی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ واپس چلا جاؤں یا اندر آ جاؤں؟“

”آجائیں۔ جولی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”کافی بنانے کے لیے میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔“

جولی جھوٹ بول رہی ہے رگھوپتی۔“ وجے مذاق کے موڈ میں آکر بولا۔ ”یہ فائل کھو دینے کی وجہ سے مجھ سے جھگڑ رہی تھی۔“

”آسٹریلیا کی لڑکیاں جھگڑنے کے لیے بھی پیار و محبت کا سہارا لیتی ہیں۔ یہ تو میں نے آج پہلی بار ہی دیکھا ہے۔“ رگھوپتی صوفے پر بیٹھنے کی بجائے اندر والے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ”جولی فائل بھلے گم ہو گئی لیکن فائل لے کر جانے والی کا سراغ ہمیں لگ گیا ہے۔“



لسٹ میں نہیں ہے اس لیے ہم پتا نہیں بتا سکتے۔۔۔“  
 ”لسٹ میں نہیں ہے؟“ رگھوپتی نے ذرا اونچی آواز میں ناراضگی کا اظہار کیا اور ریسپور رکھ کر وجے سے بولا۔ ”آپرٹرنے معذرت کی ہے وہ پتا نہیں بتا سکتا کیونکہ فون ان کی لسٹ پر نہیں ہے۔“

”ڈونٹ وری۔۔۔“ جولی نے اطمینان کا سانس لے کر اسے تسلی دی۔ ”کل میں اسی سے اس نمبر کا پتا معلوم کر لوں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ وجے نے فوراً ہی اس کی تائید کر کے بات کا رخ موڑنے کی غرض سے کہا۔ ”اب یہ بتاؤ رگھوپتی تم تو اس چینی سے ملنے گئے تھے کیا ہوا وہاں؟ چیانگ سے ملاقات ہوئی یا نہیں؟ بات کچھ آگے بڑھی؟“

”ہاں“ رگھوپتی پھر جوش میں آگیا۔ ”ہم جتنی غرض اسے بھی ہے۔ ٹیلیفون خراب ہونے کی وجہ سے ملاقات میں جو ایک روز تاخیر ہو گئی تھی اس کے لیے اس نے بھارت کے تمام سرکاری محکموں کو خوب خوب گالیاں سنائی ہیں۔“

”سلطانہ بیگم کی موجودگی میں؟ جولی نے پوچھا۔“

”ہاں“ رگھوپتی ہنس کر بولا۔ ”تمہاری سلطانہ بیگم کو اس کی گالیاں سننے میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔“

”لیکن یہ تو بتاؤ کہ آگے کیا ہوا؟“ وجے نے پوچھا۔

”کل ایک لاکھ روپے لے کر جانا ہے۔“

”صرف یہی طے کرنے کے لیے تمہیں بلایا تھا؟“ وجے نے اسے ٹٹولنے کے

غرض سے پوچھا۔ ”اس چینی کے پاس واقعی کچھ ہے بھی؟ اور کیا کہا اس نے؟“

”اس کے پاس کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔“ رگھوپتی نے کہا۔ ”لیکن نوٹوں کی شکل

دیکھے بغیر وہ شاید اپنا منہ نہیں کھولے گا۔“

”اور فرض کرو کہ وہ ہمارے لاکھ روپے ہڑپ کر کے غائب ہو گیا تو؟ اس اجنبی

ملک میں ہم کیا کر سکیں گے؟“ وجے نے کہا تو جواب میں رگھوپتی تھوڑی دیر تک

وجے کو گھورتا رہا پھر اچانک اپنی پتلون کی جیب سے پستول نکال کر بولا۔ ”یہ دیکھو

وجے... میں ہمیشہ اسے ساتھ لے کر ہی گھومتا ہوں۔“

پستول دیکھ کر وجے اور جولی دونوں ہی چونک پڑے۔ پھر اس سے پہلے کہ کوئی کچھ پوچھتا رگھوپتی خود بول پڑا۔ ”نیپال سے چلتے وقت ہی میں نے طے کر لیا تھا کہ ضرورت پڑ جائے تو دوسرے کی زندگی کے ساتھ بھی جوا کھیل لیا جائے گا۔“

یہ سن کر وجے کوئی دلیل پیش نہیں کر سکا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اگر اس نے زیادہ بحث کی تو کہیں رگھوپتی یہ نہ سمجھ لے کہ وہ اسے لاکھ روپیا دینے سے گھبرا رہا ہے۔ اسی لیے اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے رگھوپتی میں کل ہی بینک سے روپیا نکال کر لے آؤں گا۔ کتنے بچے روپے پہنچانے ہیں؟“

”جگہ اور وقت کے بارے میں کل فون پر بتائے گا۔“ کہہ کر رگھوپتی نے جولی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”تمہاری وہ سلطانہ بیگم چینی زبان میں چیانگ سے کہہ رہی تھی کہ آج کل میری پیگ گیسٹ شام کے وقت یہاں نہیں ہوتی ہے پھر بھی میں اس سے معلوم کر لوں گی اس کے بعد ہی تم اسے وقت دینا۔“ اتنا کہہ کر رگھوپتی مسکرا دیا پھر آگے بولا۔ ”اسے شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ تھوڑی بہت چینی میں بھی سمجھ لیتا ہوں۔“

”اچھا تو یہ بات ہے؟“ جولی گھمبیر لہجے میں بولی۔

”کیا؟“ وجے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”آج کل میں گھر ذریعے جاتی ہوں تو وہ مجھ سے کیوں پوچھ گچھ نہیں کرتی؟“

کہہ کر جولی نے آگے کہا۔ ”اب تو کل صبح میں خود ہی کہہ دوں گی کہ شام سے

لے کر آدھی رات تک میں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہوں گی۔“

”دیر ی گڈ۔“ رگھوپتی بولا۔ ”تب تو وہ مجھے شام کو ہی بلا لیں گے۔“

”بس تو اسی بات پر کافی ہو جائے۔“ وجے نے کہا تو جولی ہنستی ہوئی کھڑی ہو گئی

اور تب ہی رگھوپتی نے دھماکہ کرتے ہوئے ان دونوں کو چونکا دیا۔

”وجے ایک بات تو کہنا بھول ہی گیا تھا۔“

”کیا“

”میں نے رانا کو یہاں دیکھا ہے۔“ رگھوپتی بولا۔

”رانا؟“ وجے نے حیرت سے پوچھا۔ ”کون رانا؟“

بدھ کی رات کو دیر تک رگھوپتی اور وجے باتیں کرتے رہے اور سوچتے رہے۔  
وجے نے تو اپنے دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ رگھوپتی کے لیے کل بینک میں سے لاکھ  
روپيا نکلوانے کے ساتھ ساتھ وہ شوبھا کو دینے کے لیے بھی ایک لاکھ روپے نکلوا لے  
گا۔ وہ شوبھا کو روپيا دیتے وقت کہے گا کہ اب تم مجھے میری بسن کا پتا دو میں تمہیں  
اس کی قیمت دے رہا ہوں۔ اس رقم کا جو جی میں آئے کرو انتقام لینا ہے تو انتقام لو  
اور کاروبار کرنا ہے تو کاروبار کر لو۔

مگر دوسری طرف رگھوپتی یہ سوچ رہا تھا کہ لاکھ روپيا وصول کرنے کے بعد بھی  
وہ چینی چینگ اسے روکھی تک نہیں پہنچائے گا کیونکہ اس نے تو صاف صاف کہہ دیا  
تھا کہ تم ہو جانے والی کس کا شکار بنی ہیں اور میں اسی شخص کی جانب اشارہ کرنے کی  
قیمت لے رہا ہوں لڑکیاں کہاں ہیں؟ اور ان کی کیا حالت ہوئی ہے اس کے بارے میں  
میں کچھ نہیں جانتا۔۔۔

”رگھوپتی تمہیں نیپال سے آئے ہوئے تین روز ہو چکے ہیں۔“ اچانک وجے  
نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم نے وہاں کی کوئی خیر خیریت نہیں بتائی۔۔۔“  
”میں کہنا تو چاہتا تھا وجے لیکن تم نے پوچھا ہی نہیں۔“ رگھوپتی نے دھیرے  
سے کہا۔

”میں پوچھنا تو چاہتا تھا لیکن جان بوجھ کر ٹال رہا تھا۔“ وجے بھاری اور گھمبیر  
آواز میں بولا۔۔۔ کہ اگر کوئی افسوس ناک بات سننے کو مل گئی تو دل کی بے چینی اور  
بڑھ جائے گی اور جب تک آدمی کا دل و دماغ ٹھکانے پر نہ ہو وہ کوئی کام بھی نہیں کر  
سکتا۔“ اتنا کہہ کر وجے خاموش ہو گیا تب رگھوپتی نے اس کی جانب کھٹک بول لی اور  
بولا۔ ”ویسے تو ان دس دنوں میں تمہارا سوتلا بھائی کھیل دو تین بار مجھے پاس آکر کہہ  
گیا تھا کہ میری ماں نے آپ کو گھر بلایا ہے ان سے آکر ضرور مل جائیے گا لیکن پھر  
بھی میرا جی نہیں چاہتا تھا۔ مگر یہاں آنے سے قبل میں ان سے جا کر مل آیا تھا۔“  
”پتا جی سے ملاقات ہوئی؟“ وجے کی آواز میں تھر تھراہٹ تھی۔ ”مجھے تو انہی  
کی خیریت معلوم کرنی تھی۔“

”اتوار کے روز جب میں گھر پہنچا تو کھیل مجھے فوراً ہی تمہاری سوتیلی ماں کے

”وہی جس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ نیپال رائل بینک کاکیش لوٹنے کے  
لیے ہوائی جہاز کو ہائی جیک کیا تھا۔“ رگھوپتی نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”تمہیں  
میں نے کھٹمنڈو سے فون پر بتایا تو تھا کہ بینک کاکیش لوٹنے والے بھارت میں کہیں  
ہیں۔۔۔“

”تو اس کا مطلب ہے ابھی وہ لوگ گرفتار نہیں ہوئے ہیں؟“ وجے نے پوچھا۔  
”نہیں۔۔۔ اپنی گرفتاری سے پہلے وہ لوگ تمہیں پکڑنا چاہتے ہیں۔“ رگھوپتی  
بولا۔

”کیا؟“ وجے بری طرح اچھل پڑا اس پر اس بات کا گہرا اثر ہوا تھا۔

”وہ لوگ۔۔۔ مجھے۔۔۔ مگر کیوں؟“

”کھٹمنڈو سے تمہارے جانے کے بعد وہ مجھے فون کرتے رہتے تھے۔“

”مگر کیوں؟ کیا پوچھتے تھے وہ؟“ وجے پریشان سا ہو گیا۔

”وہ مجھ سے پوچھتے تھے کہ تمہارا دوست وجے بھارت میں کہاں ہے؟“

”میں نے انہیں بتایا کہ مجھے اس کا کوئی علم نہیں ہے مگر آپ کو اس سے کیا  
کام ہے؟“

تو جواب میں ان کی دھمکیاں سننے کو ملتیں کہ کوئی بات نہیں ہے ہم خود ہی  
اسے ڈھونڈ لیں گے۔

”لیکن مجھے پکڑ کر انہیں کیا ملے گا؟“ یہ بول کر وجے رک گیا اور پھر کچھ سوچ

کر بولا ”اچھا تو اب سمجھا۔ الہ آباد کی پولیس نے مجھے بینک کاکیش لوٹنے والے ڈاکو

کی حیثیت سے ایک رات حوالات میں رکھا تھا مجھے کھٹمنڈو سے لے کر دیکھ کر پولیس کو

شک ہو گیا تھا۔ اور شاید اسی بات کی ان لوگوں کو خبر ہو گئی ہو گی اور شاید اس لیے وہ

لوگ مجھ سے یہ معلوم کرنا چاہتے ہوں گے کہ پولیس نے مجھ سے ان کے بارے میں

کیا کیا سوالات پوچھے تھے؟ میں نے کسی کا نام ظاہر تو نہیں کیا یہی جاننے کے لیے

انہیں میری تلاش ہو سکتی ہے“ وجے نے یہ بات کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دینے کی

کوشش تو کی تھی لیکن اس کا دل ایک انجانے خوف سے کانپنے لگا تھا۔

”تو کیا میری سوتیلی ماں یہ سمجھتی ہے کہ اپنے جس پتا جی کا دل میں نے اس حد تک دکھایا ہے وہ پتا جی صرف میرے ایک خط سے مجھے معاف کر کے اپنا دیا ہوا استغنی واپس لے لیں گے؟“ بولتے بولتے وجے ایک پل کے لیے رکا پھر آگے بولا ”مگر ایسا کرنے کی بجائے وہ کھیل کو راج پروہت کی گدی پر بیٹھانے کی بات کیوں نہیں سوچتے؟“

”وہ ایسا ہی سوچ رہے ہیں۔“ رگھوپتی نے جلدی سے کہا۔ ”لیکن کھیل ابھی صرف بائیس سال کا ہے اور راج پروہت کی گدی پر بیٹھنے کے لیے یہ عمر کافی نہیں ہے۔ تمہاری سوتیلی ماں تو صرف اتنا چاہتی ہے کہ تمہارے پتا جی کسی طرح دو تین سال اور اس گدی کو سنبھالے رہیں پھر جب کھیل کی عمر اس لائق ہو جائے تو اسے گدی پر بیٹھا دیا جائے۔“

”رگھوپتی میں پتا جی کو ضرور خط لکھوں گا۔“ وجے نے تھوڑی دیر بعد جواب دیا۔ ”میں ان سے معافی مانگوں گا عاجزی کروں گا کہ راج پروہت کی گدی کو نہ چھوڑیں کھیل کے ساتھ نا انصافی نہ کریں۔ لیکن میں یہ جھوٹ بولنے کا گناہ کیسے کروں کہ میں پاپ کی دولت کو خیرات کر کے اس کے بوجھ سے آزاد ہو گیا ہوں؟“

رگھوپتی تھوڑی دیر تک خاموش رہا اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ وجے سے اس بات پر لڑ پڑے کہ جس سوتیلی ماں نے تمہیں اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہو اس کی بات ماننے کی اب ضرورت ہی کیا ہے؟ لیکن یہ بات کہنے کی بجائے اس نے وجے کی سوتیلی ماں اندرانی کی کسی ہوئی ایک دوسری بات وجے کو بتا دی۔ وہ بولا۔ ”تمہاری سوتیلی ماں گناہ اور ثواب پر کب یقین رکھتی ہے وجے؟“

”کیا مطلب؟“ وجے نے چونک کر پوچھا۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ رگھوپتی بولا۔ ”اس نے تو تمہاری پاپ کی دولت میں سے اپنے بیٹے کھیل کا بھی حصہ مانگا ہے۔“

”میری پاپ کی دولت؟“

”ہاں۔۔۔ مہاراجا کے گناہوں کا بوجھ اپنے سر لے کر تم لکھ پتی بن چکے ہو نا۔۔۔ بے چاری تمہاری سوتیلی ماں رو رو کر مجھ سے کہہ رہی تھی کہ جا کر وجے کو سمجھانا

پاس لے گیا۔“ رگھوپتی نے اس کے پتا جی کے بارے میں کچھ کہنے کی بجائے اس کی سوتیلی ماں کے بارے میں ہی کہنا جاری رکھا۔ ”میرا خیال تھا کہ تمہاری سوتیلی ماں تمہاری پیٹھ پیچھے تمہاری شکایتوں کا دفتر کھول کر بیٹھ جائے گی لیکن اس نے تو خلاف توقع ہی کہاں ہے میرا وجے؟ کیا حال ہے اس کا؟ وہ خیریت سے تو ہے نا؟ جیسے سوالات شروع کر دیے۔ اس لیے میں سمجھ گیا کہ اس کی اس محبت کے پیچھے ضرور اس کا کوئی مطلب پوشیدہ ہے۔

”لیکن اب بھلا اس کو مجھ سے کیا مطلب ہو سکتا ہے؟“ وجے نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”میں نے گھر بار چھوڑ کر اس کے بیٹے کھیل کے لیے تو راستہ صاف ہی کر دیا ہے اب تو پتا جی کے بعد راج پروہت کی گدی کھیل کو ہی تو ملے گی۔“

”لیکن اس کے باوجود بھی اس کام کے لیے انہیں تمہاری ضرورت پیش آگئی ہے۔“ رگھوپتی نے اسے سمجھایا۔ ”تمہارے پتا جی نے راج پروہت کی گدی سے اپنا استغنی راج محل بھجوا دیا ہے۔“

”ایں۔۔۔“ وجے ایک جھٹکے سے چونک پڑا۔ ”پتا جی نے استغنی کیوں بھیج دیا؟“

”دنیا سے اب ان کی دلچسپی ختم ہو گئی ہے تمہارے جانے کے بعد انہوں نے گھر سے باہر نکلتا ہی چھوڑ دیا ہے۔ کسی سے ملتے بھی نہیں چوبیس گھنٹے بند کمرے میں بیٹھے رہتے ہیں۔“ رگھوپتی نے بتایا۔

”آہ۔۔۔“ وجے ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ ”میری وجہ سے ان کی یہ حالت ہوئی ہے۔۔۔ پھر کیا ہوا؟ ماں نے تم سے کیا کہا؟“

”یہی کہ استغنی واپس لینے کے لیے پتا جی کو صرف وجے ہی رضا مند کر سکتا ہے۔“ رگھوپتی نے کہا۔ ”انہوں نے تم سے یہ کہلوا دیا ہے کہ تم اپنے پتا جی کو ایک خط لکھ کر ان سے معافی مانگو۔ تم اپنے خط میں انہیں یہ لکھ دو کہ پاپ کی دولت کو خیرات کر کے میں اس پاپ سے آزاد ہو گیا ہوں۔ اس لیے آپ مجھے معاف کر دیں اور پھر آگے تم یہ لکھنا کہ راج پروہت کا عہدہ کئی پشتوں سے ہمارے خاندان میں چلا آ رہا ہے اس لیے اس عہدے کو نہ چھوڑیے۔ میری ایک بھول کی سزا آنے والی نسل کو کیوں دی جائے؟ وغیرہ وغیرہ۔“

کی طرف دیکھا لیکن بھائی پر نظر پڑتے ہی وہ گھبرا کر دوڑ پڑی۔ اسے دوڑتے دیکھ کر وہ خود بھی اس کے پیچھے لپکا۔ ”رک جاؤ روکھی رک جاؤ۔“

اس کی آواز تیز ہوتی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ روکھی کی رفتار بھی بڑھتی گئی اور پھر سڑک ختم ہو گئی اور روکھی ایک ریت کے میدان میں دوڑنے لگی۔ پاؤں ریت میں دھنتے جا رہے تھے لیکن روکھی کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آ رہی تھی اور وہ خود اسے پکڑ نہیں پا رہا تھا۔ اجاڑ اور ویران سے ریت کے میدان کا کوئی کنارہ ہی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہانپتے ہانپتے اسے لگا کہ اب اس کا سینہ پھٹ جائے گا اور سانس رک جائے گی اس لیے اس نے ایک آخری چیخ ماری ”رو... کھی...“

”کیا ہوا؟ کیا ہوا وہ...؟“ اس کے برابر میں سویا ہوا رگھوپتی اس کی آواز سن کر چونک کر اٹھ بیٹھا اور وجے کے قریب جا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور تب اسے محسوس ہوا کہ وجے کا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا ہے اور وہ بری طرح ہانپ رہا ہے۔ ”وجے... کیا ہو رہا ہے تمہیں؟“ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

”نہوں...“ وجے کے منہ سے نکلا اور وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رگھوپتی پر نظر پڑتے ہی اس کے خوف زدہ چہرے پر اطمینان کی ایک لہری دوڑ گئی۔ اس نے آس پاس نظر دوڑائی تو اسے لگا کہ اس نے کوئی خواب ہی دیکھا تھا۔

”میں نے خواب دیکھا تھا رگھوپتی...“ کہہ کر اس نے اپنے دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھ دیا اور آگے بولا۔ ”ایسا خواب تو مجھے کبھی بھی نہیں آیا تھا۔“

”خواب میں ہی تم شاید روکھی کو پکار رہے تھے؟“

”ہاں رگھوپتی...“ وجے سر جھکا کر دیر سے بولا۔ ”روکھی مجھے دیکھ کر بھاگ رہی تھی میں نے دور تک اس کا پیچھا کیا لیکن وہ کھڑی ہی نہ رہی۔ وہ دور بہت دور بھاگتی جا رہی تھی۔“

”مگر وجے مجھے تو وہ کبھی خواب میں بھی دکھائی نہیں دیتی۔“ رگھوپتی ایک سرد سی آہ بھر کر بولا۔ ”کیا خبر ہم اس سے کتنے قریب ہیں یا کتنے دور ہیں؟“

”ہم اس سے بہت ہی قریب ہیں رگھوپتی۔“ وجے پر جوش لے میں بول گیا۔ ”روکھی اب ہم لوگوں سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔“

اور کسی کو خبر نہ ہو اس طرح آدھی رقم بھیج دے وہ تو اکیلا آدمی ہے اتنی ساری دولت کا کیا کرے گا؟“

”ہاں نے ایسا کہا تھا؟“ وجے کی آواز اس کے حلق میں ہی پھنس گئی۔ ”پاپ کی جس دولت کو قبول کرنے پر میرے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا اسی پاپ کی دولت کا آدھا حصہ وہ گھر لانا چاہتی ہے؟ اگر پتا جی کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ اس کی زبان کاٹ کر پھینک دیں گے رگھوپتی؟“

”شاید تمہاری سوتیلی ماں کو اب تمہارے پتا جی کی عزت سے زیادہ اپنی ضرورتوں سے دلچسپی ہے۔“ رگھوپتی نے جواب دیا۔

”یہ دل جلانے والی باتیں نہ کرو رگھوپتی۔“ وجے بے حد اس لہجے میں بولا۔ ”مجھے تم یہ بتاؤ کہ میرے پتا جی نے میرے بارے میں تم سے کیا کہا ہے؟“

یہ سن کر رگھوپتی کا جی چاہا کہ وہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر جواب ہی گول کر جائے لیکن وجے کی آنکھیں اندھیرے میں بھی اس کے چہرے کو ٹاک رہی تھیں۔ اس لیے اسے کہنا ہی پڑا۔ ”میں نے کھیل سے کہا تھا کہ جا کر اپنے پتا جی کو بتا دو کہ رگھوپتی کل دہلی جا رہا ہے وہاں وجے سے ملاقات ہوگی۔ اسے کچھ کہنا ہے۔ جا کر پوچھ لو۔“

”تو پتا جی نے کیا کہا؟“ وجے نے بے چینی سے پوچھا۔

”نہوں نے کہا“ نہیں پھر پوچھا۔۔۔ وجے؟ کون وجے؟“ رگھوپتی کے یہ الفاظ وجے کا کلیجہ چھلنی کر گئے اور وہ سوچنے لگا کہ اس کے پتا جی کو اپنے منہ سے ایسے الفاظ نکالتے وقت کتنے گہرے صدمے سے گزرنا پڑا ہو گا؟ پتا جی کی حالت کا خیال آتے ہی اس نے رگھوپتی سے کچھ اور پوچھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ رشتوں کا ایک کنارہ تو چھوٹ گیا تھا جب کہ دوسرا کنارہ ابھی ہاتھ میں نہیں آیا تھا۔ جب تک روکھی مل نہیں جاتی اس وقت تک تو اسے منجھدار میں ہی ڈولتے رہنا تھا۔ اس کا تھکا ہوا جسم اور بچھا ہوا دل جانے کہاں کھو گیا تھا۔ اسے کچھ ہوش ہی نہیں تھا بہن کو یاد کرتے کرتے اسے نیند آگئی تھی اور پھر خواب میں اسے روکھی دکھائی دی۔ اس نے روکھی کو ایک سڑک پر جاتے ہوئے دیکھ کر اسے آواز دی۔ ”روکھی... آواز سن کر روکھی نے پلٹ کر اس

چاہتا تھا۔“

”کب؟“

”آج...“ وجے پھر جوش میں آگیا۔ ”میں تمہارے اس چیانگ کو دینے کے لیے بینک سے لاکھ روپا لانے کے لیے جاؤں گا اور ساتھ ساتھ شوہا کو دینے کے لیے بھی لاکھ روپے لیتا آؤں گا۔ اور شوہا سے اس کے گھر کا پتہ لے کر میں فوراً ہی اس سے ملنے کے لیے چلا جاؤں گا۔ لیکن...“

”لیکن کیا؟“ رگھوپتی نے چونک کر پوچھا۔

”لیکن یہ خواب؟ مجھے دیکھ کر روکھی کا مجھ سے دور بھاگنا... بہت ہی خراب خواب تھا۔“ وجے انک انک کر خوفزدہ سی آواز میں بولا۔

”خواب آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔“ رگھوپتی اٹھ کر بالکونی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں اس ابھرتے ہوئے سورج کو گواہ رکھ کر کہتا ہوں تم روکھی کو میرے سامنے لا کر دیکھنا میری ایک ہی نظر اسے یقین دلا دے گی کہ چھ سال سے وہ جیسی بھی ہو اسے دیکھنے کے لیے میری آنکھیں ترس رہی ہیں۔“ بولتے بولتے رگھوپتی اچانک رک گیا۔ بالکونی پر سے اس کی نظر باغیچے کے ایک کونے میں ایک پودے پر جم گئی جہاں اوشا کھڑی تھی۔ اوشا کو دیکھتے ہی رگھوپتی کی آنکھوں کے سامنے ماضی کا ایک منظر گھوم گیا۔ اور ٹھیک اسی وقت اوشا نے بھی گردن اٹھا کر بالکونی کی طرف دیکھا تھا مگر رگھوپتی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ کانپ گئی۔ پودوں کو پانی دینے کے لیے جو جگہ اس نے ہاتھ میں تھام رکھا تھا وہ جگہ اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔ اور وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی اپنے گھر کے اندر غائب ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد بھی رگھوپتی وہاں سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔۔۔ تو یہ ہے وجے کی پڑوسن... ہری پرشاد جی کی بیوی؟



شام کو چھ بجے رگھوپتی جولی اور وجے تینوں ایک ساتھ نیچے اترے انہوں نے جان بوجھ کر ٹیکسی کو گھر کے پاس نہیں بلوایا تھا۔ ایک بریف کیس وجے کے ہاتھ میں

یہ سن کر رگھوپتی اس کے چہرے کو تکتا رہا۔ جیسے آنکھوں کے ذریعہ ہی وہ اس کا دل پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وجے بھی اب اپنے دل میں یہی سوچ رہا تھا کہ اب رگھوپتی سے کچھ چھپانا بے کار ہے۔ اب بھی اگر اس نے رگھوپتی کو کچھ نہ بتایا تو شاید وہ اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اس بات کا خیال آیا تو اس نے رگھوپتی سے کہا ”رگھوپتی میں نے یہاں آکر روکھی کو روہو تو نہیں دیکھا ہے۔ البتہ میں نے ٹیلیفون پر اس کی آواز ضرور سنی ہے۔“

چونک جانے کی بجائے رگھوپتی تو حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وجے نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر سے ہٹالیں اور آگے بولا۔ ”میں سچ کہہ رہا ہوں رگھوپتی جس روز تم کھنڈو سے یہاں پہنچے تھے اس سے آدھے گھنٹے قبل ہی شوہا نے میری اس سے فون پر بات کرائی تھی لیکن میں نے جان بوجھ کر تم سے یہ بات چھپائی تھی مگر میں اب وہ ساری بات تمہیں بتا رہا ہوں۔“ لیکن رگھوپتی خاموش ہی رہا اور تب وجے نے شوہا سے اپنی ملاقات سے لے کر تھری ایٹ ڈبل ایٹ ڈبل ایٹ نمبر پر کی ہوئی آخری بات کی تفصیل بھی رگھوپتی کو کہہ سنائی۔ رگھوپتی چپ چاپ اس کی بات سنتا رہا پھر جب وجے چپ ہو گیا تو رگھوپتی اپنی بھاری اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”شاید تم نے یہ سمجھا ہو گا وجے کہ روکھی کی ناپاک زندگی کے بارے میں سن کر مجھے صدمہ پہنچے گا۔“ رگھوپتی کے لہجے میں ہمدردی اور محبت کی جھلک تھی۔ ”تم نے یہ بھی سمجھ لیا ہو گا کہ میں تمہاری بہن سے نفرت کرنے لگوں گا۔“

”نہیں۔ نہیں۔۔۔“ وجے جلدی سے درمیان میں ہی بولا پڑا۔ ”مجھے تو تم سے صرف اسی ایک بات کا ڈر تھا کہ تم بے صبری میں روکھی سے ملنے کے لیے چل پڑو گے اور تب ہم کبھی بھی روکھی سے مل نہیں پائیں گے۔“

”کیوں؟“ رگھوپتی نے پوچھا۔

”اس لیے کہ یہ ناپاکی کے گڑھے میں اتر جانے کے بعد بھی جب بھائی کو اپنے سامنے دیکھے گی تو اس سے کدھے پر سزر رکھ کر اپنا دکھ ہلکا کرنے کی کوشش کرے گی لیکن وہ اپنے محبوب کو اپنا منہ دکھانے سے بہتر خود کو دھرتی کے اندر چھپا لینا پسند کرے گی۔“ اتنا کہہ کر وجے پھر آگے بولا۔ ”اسی لیے میں روکھی سے پہلے اکیلا ہی ملنا

سمت میں آگے بڑھ گئی تو وجے نے گردن گھما کر پیچھے کی جانب دیکھا تو دور جاتی ہوئی دوسری ٹیکسی میں سے رگھوپتی بھی اسے اسی طرح مڑ کر دیکھ رہا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو وجے؟“ جولی نے دھیرے سے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے پوچھا ”شاید رگھوپتی کی فکر ہو رہی ہے تمہیں؟“

”نہیں جولی۔“ وجے اپنے خیالوں سے چونک کر بولا، ”میں سوچ رہا تھا کہ اب کھٹنے دو کھٹنے بعد ہی دونوں ہی طرف کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے اور اس پر ہم تینوں کے مستقبل کا بھی دارو مدار ہے۔“

”شوہا نے تو روکھی کا پتا تیار ہی رکھا ہو گا۔ پھر بھی۔“ تھوڑی دیر بعد وجے نے پھر کہا مگر اپنی بات کو ادھورا چھوڑ کر وہ جولی کا چہرہ کتنے لگا۔ وہ جولی سے یہ کہہ نہیں پا رہا تھا کہ رات والے خواب نے اس کے اعتماد کو ڈگمگا دیا ہے۔ ٹیکسی شوہا کے گھر والی سڑک پر آچکی تھی اس لیے دونوں میں سے کوئی بھی کچھ نہیں بولا۔ جولی کے ہاتھ میں بریف کیس تھا کہ وجے نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کر دیا۔ ٹیکسی کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آواز سن کر شوہا نے بھی اپنے فلیٹ کا دروازہ کھول دیا تھا۔ ”آئیے میں آپ لوگوں کی ہی منتظر تھی۔“ دروازے پر ان دونوں کا استقبال کرتے ہوئے شوہا نے کہا۔

”ہمارا؟“ وجے نے جولی کے ہاتھ سے بریف کیس لے کر شوہا کے سامنے رکھ دیا اور مسکراتے ہوئے بولا، ”یا پھر اس کا انتظار تھا آپ کو؟“

یہ سن کر شوہا نے اس کی بات کا ذرا بھی برا نہیں منایا اور خود بھی مسکرا کر بولی ”شاید میں آپ کو بہت زیادہ کاروباری لگ رہی ہوں... ہے نا؟“

”نہیں شوہا۔“ صوفے پر بیٹھ کر وجے نے کہا۔ ”مجھے تو تم انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی ایک پھری ہوئی شیرنی لگ رہی ہو۔“

”تب تو آپ مجھے خوب اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔“ کہہ کر شوہا نے وجے کی جانب ہاتھ بڑھایا اور کہا، ”بریف کیس کی چابی۔“

”شوہا۔“ جولی بول اٹھی۔ ”اب تو تم پکی پیواری لگ رہی ہو کہ بغیر روپے لیے ہوئے آگے نہیں بڑھو گی۔“

تھا اور ایک چھوٹا سا بیگ رگھوپتی نے اپنے ہاتھ میں اٹھا رکھا تھا۔ جولی ان دونوں کے درمیان میں چل رہی تھی۔ جب وہ صدر دروازے تک پہنچ گئے تو اندر سے پرشاد جی کا گھریلو ملازم جنگا ہمدرد دوڑتا ہوا آگیا اور بولا۔ ”لایئے صاحب یہ بیگ میں اٹھالوں اور کہیں تو ٹیکسی بلا کر یہاں لے آؤں۔“

لیکن وجے نے ہنس کر اسے منع کر دیا۔ ”رہنے دو جنگا... آگے چل کر ٹیکسی لے لیں گے اور یہ بیگ بھی زیادہ وزنی نہیں ہے۔“ اتنا کہہ کر اس نے نیچے کے دروازے کو بند دیکھ کر جنگا سے پوچھا۔ ”کیا میم صاحب کہیں باہر گئی ہیں؟“

”ہاں... شاید وہ فلم دیکھنے گئی ہیں۔“ جنگا نے بتایا۔ ”کہہ رہی تھیں کہ نوبے کے بعد آئیں گی۔“

”ہم بھی دیر سے واپس آئیں گے۔“ وجے نے کہا تو جنگا نے رگھوپتی پر نظریں جما کر وجے سے پوچھا۔ ”صاحب کیا یہ آپ کے مہمان جا رہے ہیں؟“

”نہیں بھی۔“ وجے سمجھ گیا کہ ان کے ہاتھوں میں بریف کیس اور لیڈر بیگ دیکھ کر جنگا کو بخشش ملنے کی امید پیدا ہو گئی ہے ”ابھی یہ کچھ اور ٹھہریں گے لیکن جب جائیں گے تو تمہارا ہاتھ خالی نہیں رہے گا۔“

اس کا یہ جواب سن کر جنگا چپ چاپ واپس چلا گیا۔ ٹیکسی اسٹینڈ پر پہنچ کر رگھوپتی اور وجے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے کھڑے رہ گئے۔ یہاں سے دونوں کے راستے الگ الگ ہونے والے تھے۔ رگھوپتی کو مغرب کی سمت جانا تھا اور وجے اور جولی کو مشرق کی جانب روانہ ہونا تھا۔ وجے نے اپنا بریف کیس اپنے بائیں ہاتھ میں لے لیا اور رگھوپتی سے ہاتھ ملانے لگا رگھوپتی اس سے کہنا چاہتا تھا۔ کہ روکھی سے ملنے کے لیے دل تو میرا بہت بے چین ہے لیکن کیا کیا جائے میرے نصیب میں تو کم بخت چینی چیانگ ہی آیا ہے۔ اور وجے یہ کہنا چاہتا تھا کہ دیکھو رگھوپتی اگر چیانگ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کرے تو لاکھ روپے کی خاطر زندگی کو داؤ پر مت لگا دینا اور پستول کو بھرا ہوا ہی واپس لانا۔

لیکن دونوں میں سے کوئی بھی کچھ نہیں بولا ایک دوسرے کو ہاتھ دھیرے سے دبانے کے بعد وہ دونوں الگ الگ دو ٹیکسیوں میں بیٹھ گئے۔ وجے کی ٹیکسی مخالف



وہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور بریف کیس کے ہٹن دبا کر اس کا ڈھکنا اٹھا دیا اور اسے شوہا کے سامنے کر کے بولا۔ ”گن لیجئے پورے لاکھ روپے ہیں۔“ لیکن شوہا نے بریف کیس میں رکھے ہوئے سو سو کے نوٹوں کے بندلوں کی طرف نظر نہیں ڈالی ”آپ کو اپنی بہن کا پتا چاہیے نا؟“ کہہ کر اس نے اپنے پرس سے ایک کانغز کا ٹکڑا نکالا اور اس کے ہاتھ میں دے کر بولی ”لیجئے اور ساتھ ساتھ نوٹوں سے بھرے ہوئے اس بریف کیس کو بھی لیتے جائیں۔“ اس نے بریف کیس و بے کی جانب سرکا دیا پھر آگے کہا۔ ”میں قیمت ضرور وصول کرتی ہوں لیکن خیرات نہیں لیتی۔“

”میری بات بری لگ گئی شوہا؟“ کہہ کر وجے نے کانڈ کے ٹکڑے پر لکھا ہوا پتا پڑھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا پھر شوہا سے بولا۔ ”خیرات تو اپنی نیک کمائی میں سے کی جاتی ہے شوہا۔ جب کہ یہ دولت تو میرے باپ کی دولت ہے۔ اسے کسی کو دے کر میں کسی پر کوئی احسان نہیں کرتا۔ میں تو ایک طرح سے اپنا بوجھ کم کر رہا ہوں۔“ پھر اس نے جولی کے ہاتھ میں وہ کانڈ کا ٹکڑا دے دیا اور کہا۔ ”چلو جولی ورنہ یہ شوہا غصے میں آکر کہیں بریف کیس ہمارے سر پر نہ دے مارے۔“

جولی کھڑی ہو گئی۔ لیکن پھر بھی شوبھا گم سم سی اپنی جگہ پر بیٹھی ہی رہی اور تب وجہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے مجھے میری بہن کا پتا دے تو دیا ہے۔ اب ہمارے لیے دعا بھی کرو۔“ بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ ”پورے چھ سال بعد آج پکھڑے ہوئے بھائی بہن کی ملاقات ہونے والی ہے۔“ شوبھا ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اپنا ٹھنڈا ہاتھ وجہ کے ہاتھ میں دے دیا اور انتہائی جذباتی لہجے میں بولی۔ ”اس بات کا خیال رکھیے گا مسٹر وجہ کہ ہم بدنام عورتیں محبت کی بھوکی ہوتی ہیں۔ آپ کو دیکھ کر کہیں روکھی کا دل دکھی نہ ہو جائے۔“ وجہ نے اس کی بھینکتی ہوئی آنکھوں پر سے اپنی نظریں ہٹالیں اور جولی کے ساتھ اس کے گھر سے باہر نکل گیا۔

وجہ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چابی کے بجائے کانڈ کا ایک ٹکڑا نکال کر شوہا کے ہاتھ میں رکھ دیا تو شوہا بری طرح چونک پڑی۔ ”یہ کیا ہے؟“

”بریف کیس لاک نہیں ہے اس لیے چابی کی ضرورت نہیں ہے۔“ وجہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن تم یہ فون نمبر ذرا پڑھ لو۔“

شوہما نے کاغذ کے اس ٹکڑے پر نظر ڈالی اور اس پر لکھا ہوا نمبر پڑھتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں چلی گئیں۔ جولی اور وجے چپ چاپ اس کی حیرت زدہ آنکھوں کو دیکھ رہے تھے۔

اس کے ہونٹ پھڑپھڑائے ”تھری ایٹ۔ ڈبل ایٹ ڈبل ایٹ... یہ تو... یہ تو“

”روکھی کے نمبر ہیں...“ وجے نے مستحکم لہجے میں کہا.. ٹھیک ہے نا؟“

”شکریہ نمبر آپ کو کیسے ملا؟“ شوبھا کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

”شوبھا.... یہ نمبر کل سے میرے پاس ہے اور میں نے یہ نمبر ملا کر روکھی کی آواز بھی سنی ہے۔“ وجے نے کہا۔

”اوہ....“ شوبھا کے منہ سے نکلا اور وجہ کو اس طرح دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو۔ تو پھر میرے لاکھ روپے گئے؟

”تم چپ کیوں ہو گئیں شوہا؟ فکر مت کرو۔ میں یہ بریف کیس لے کر تمہاری قیمت چکانے ہی تمہارے پاس آیا ہوں۔“ وجے نے گھمبیر آواز میں کہا۔ ”یہ نمبر ڈائیکٹری میں نہیں ہے پھر بھی ٹیلیفون ایڈیجنگ میں کسی کی بھی جیب میں سو روپے کا ایک نوٹ ڈال کر میں اس نمبر کا پتا حاصل کر سکتا تھا۔“

”تو پھر بھی...“ شوبھا کی نظروں میں وجے کے لیے احترام کی جھلک تھی... ”آپ سو روپے کی بجائے لاکھ روپے خرچ کرنے کے لیے تیار ہو گئے؟“

”ہاں... اس لیے کہ میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا...“ وجے نے کہا... ”اور

مجھے اپنے دیے ہوئے قول کا تو پاس رکھنا ہی تھا۔“

”قول...؟“ شوہا نے ایک گہرا سانس لیا ”کال گرل کا دیے ہوئے قول کا پاس

کون رکھتا ہے؟“

”یہ سامنے والا آئیڈیل اپارٹمنٹ ہے۔“ ایک اونچی عمارت کے سامنے ٹیکسی

روک کر ڈرائیور نے پوچھا۔ ”کیا پھانک کے اندر لے لوں؟“

”نہیں.... بس گیٹ پر ہی اتر جائیں گے۔“ دونوں ٹیکسی سے اتر کر تھوڑی دیر تک اس عمارت کو دیکھتے رہے۔ پانچ منزلہ اس عمارت کی دونوں جانب گلیاں پڑتی تھیں اور سامنے کی جانب ایک چھوٹا سا کمپاؤنڈ بھی تھا۔ باہر سے عمارت کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے چار پانچ سال قبل ہی اس کی تعمیر مکمل ہوئی ہو۔ عمارت کے اگلے حصے میں دکانیں اور اسٹور وغیرہ نظر آرہے تھے۔

”سات بجنے میں پانچ منٹ باقی ہیں۔“ وجے نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھ کر جولی سے کہا۔ ”کیوں نہ ہم اس کولڈ اسپاٹ پر جا کر ایک ایک گلاس جوس پی لیں؟ اس کے بعد میں جاؤں گا۔“

جولی کو یہ بات بڑی عجیب سی لگی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو وجے اپنی بہن سے ملنے کے لیے بہت ہی بے چین تھا اور اب اس کے گھر تک آجانے کے بعد وہ اندر جانے کے لیے اتنی تاخیر کیوں کر رہا ہے؟

جوس پینے میں بھی وجے نے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی دیر کر دی۔ جوس کا ایک ایک گھونٹ بھرنے کے بعد وہ اس عمارت کی پانچویں منزل کو گھورنے لگتا تھا۔ شاید وہ یہ سوچنے لگتا تھا کہ اس میں سے وہ کون سا فلیٹ ہے جس میں روکھی رہتی ہو گی؟ ایلی رہتی ہے یا کسی کے ساتھ؟ اچانک اس کی نظر کولڈ اسپاٹ کے ایک کونے پر رکھے ہوئے ٹیلیفون پر پڑی تو اس نے جولی سے کہا۔ ”جولی میں ایسا کرتا ہوں کہ یہاں سے روکھی کے فلیٹ میں فون کر کے یہ معلوم کرتا ہوں کہ وہ گھر پر ہے یا نہیں ہے؟ اگر وہ موجود نہ ہوئی تو اوپر تک جانے کا فائدہ ہی کیا ہے؟“

جولی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن جب وجے نے روکھی کے فلیٹ کا نمبر ملایا تو دوسری جانب سے کسی نے فون اٹھا کر کچھ کے بغیر ہی لائن کاٹ دی۔ اس نے دوسری بار نمبر ملایا تو انجمن کی ٹون سنائی دی۔ اس ٹون سے اس نے یہ سمجھ لیا کہ کسی نے ریمیور اٹھا کر دوسری طرف رکھ دیا ہو گا۔ وجے کو یہ بات بڑی عجیب سی لگ رہی تھی۔ آخر ایسا کیوں کیا گیا؟ کیا روکھی فلیٹ میں کسی اور کے ساتھ ہو گی؟ کہیں خلل اندازی کی وجہ سے ریمیور اٹھا کر تو الگ نہیں رکھ دیا گیا ہو گا؟ اگر ایسی بات ہے

تو اس وقت میرا اس کے فلیٹ میں جانا کچھ مناسب نہیں ہو گا۔ کیونکہ کسی کی موجودگی میں تو وہ اسے پہچاننے کے لیے بھی تیار نہیں ہو گی۔

جوس کا دوسرا گلاس پینے میں وجے نے مزید پندرہ منٹ گزار دیے شوہا کے گھر سے نکل کر ٹیکسی میں میاں آتے آتے وجے نے جولی کو سمجھا دیا تھا کہ پہلے میں اکیلا ہی جا کر روکھی سے ملوں گا۔ تم میرے ساتھ نہیں چلو گی۔ بلکہ تمہیں نیچے ہی کہیں میری واپسی تک انتظار کرنا پڑے گا اور جولی نے بھی اس کا یہ مشورہ مان لیا تھا اور ایسا کرتے وقت اس نے کہا تھا۔ ”روکھی سے ملنے کی خواہش تو مجھے بھی ہے مگر پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ پہلے تم اکیلے ہی جاؤ۔“ لیکن اب نہ جانے کیوں گھر کے بالکل نزدیک آکر بھی وجے اکیلا جانے میں ڈر محسوس کر رہا تھا۔ بار بار کل آدھی رات کا دیکھا ہوا خواب اس کی امیدوں پر دھند کی طرح چھٹاتا جا رہا تھا۔ مگر آخر کار دل کو مضبوط کر کے وہ وہاں سے اٹھا اور جولی سے بولا۔ ”اب تمہیں اکیلے ہی وقت گزارنا پڑے گا۔ مجھے نہیں معلوم وہاں مجھے کتنی دیر لگ جائے گی شاید ایک منٹ میں ہی واپس آجاؤں اور شاید ایک گھنٹا بھی لگ جائے۔“

”کوئی بات نہیں وجے۔“ جولی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم دیر سے آؤ گے تو مجھے خوشی ہو گی۔ میں یہ سمجھ لوں گی کہ پچھڑے ہوئے بھائی بہن باتوں میں مصروف ہو گئے ہیں۔“

”اچھا اب میں جا رہا ہوں۔“ کہہ کر وجے نے قدم بڑھائے تو جولی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وجے کے قدم پہلے آہستہ آہستہ اور پھر تیز تیز اٹھنے لگے اور جولی بیٹھے بیٹھے آنکھیں بند کر کے اس کی کامیابی کے لیے دعائیں کرنے لگی۔

کمپاؤنڈ پار کر کے لابی میں داخل ہوتے ہی وجے کو لفٹ کا جالی دار دروازہ دکھائی دیا۔ لیکن لفٹ اوپر گئی ہوئی تھی۔ اس کے آنے کا انتظار کرتے کرتے وہ اس عمارت میں رہنے والے لوگوں کے نام کی سختی پڑھنے لگا۔ پانچویں منزل کی چوکور سی سختی پر لکھے ہوئے تیسرے نام پر اس کی نگاہیں جم گئیں۔ روما دیوی فلیٹ نمبر 506 بس اتنا ہی لکھا تھا۔ روما دیوی کے آگے نہ تو مس کا لفظ تھا اور نہ ہی مسز کا۔ یہ نام پڑھ لینے کی بعد اس نے ایک بار پھر آگے جا کر لفٹ کا بٹن دبایا۔ لیکن پھر بھی لفٹ

چوکیدار کا فقرہ اس شخص کے لیے تھا یا اس کے لیے تھا؟ یہ بات وجہ سوچ نہیں سکا اس نے لفٹ کے اندر گھس کر پانچویں منزل کا بٹن دبا دیا اوپر پہنچے ہی اس کا دل دگنی رفتار سے دھڑکنے لگا تھا۔

پانچویں منزل پر لفٹ کے دونوں جانب تین تین فلیٹ تھے۔ دائیں جانب کے فلیٹ نمبر پڑھتا ہوا وہ 506 کے فلیٹ کے دروازے پر آکر رک گیا۔ اتنی دیر میں تو اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چکنے لگے تھے۔ سانس روک کر اس نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ دس سیکنڈ... بیس سیکنڈ... تیس سیکنڈ تک بھی کوئی دروازہ کھولنے نہیں آیا تو وجہ بے چین سا ہو گیا اور اسی کیفیت میں اس نے پے در پے دو تین بار کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ اندر کال بیل کی آواز گونج رہی تھی لیکن اس کے باوجود کوئی دروازہ تک نہیں آیا۔ اچانک اس نے ہاتھ سے دروازے پر دستک دینے کے لیے بند دروازے پر ہاتھ مارا ہی تھا کہ یکایک دروازہ خود بخود ہی کھل گیا۔ وجہ پہلے تو چونک کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا ایک خیال تیزی سے اس کے ذہن میں ابھرا۔ ”کیا دروازہ پہلے سے ہی کھلا تھا؟ اس نے پھنسی ہوئی سی آواز میں پکارا۔ ”روما دیوی۔ روما دیوی۔“

لیکن جب اسے کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے دروازے کے اندر منہ ڈال کر پوچھا۔ ”کوئی اندر ہے۔“

مگر اس کا بھی کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے ہمت کر کے قدم اٹھا دیے۔ اندر داخل ہو کر دھیرے دھیرے چلتا ہوا وہ ڈرائنگ روم میں آگیا۔ وہاں بھی کوئی دکھائی نہیں دیا۔ لیکن پھر بھی پنکھا چل رہا تھا۔ اور اس سچکے کو دیکھ کر اس کی امید بندھ گئی تھی کہ یقیناً ”گھر میں کوئی موجود ضرور ہے۔“

برابر کے کمرے میں جھانک کر وہ آواز لگانے ہی والا تھا کہ اچانک اس کے منہ سے دبی دبی سی ایک چیخ نکل گئی۔ وہ کسی پتھر کی مورت کی طرف چند لمحوں تک بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں بھی حرکت کرنا بھول گئی تھیں۔ جو منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اس منظر کو اس کی آنکھیں برداشت نہیں کر پا رہی تھیں لیکن وہ اس پر سے نظر بھی نہیں ہٹا پا رہا تھا۔

کے نیچے آنے کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تو وہ زینے کے ذریعے اوپر جانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ لفٹ کے آس پاس اوپر جانے کے لیے کوئی زینہ ہی نہیں تھا۔

”کمال ہے لفٹ ہے اور سیڑھیاں نہیں ہیں۔“ وہ بڑبڑایا۔ پھر اس کی نظر سامنے کی دیوار پر پڑی جہاں ایک تختی پر لکھا تھا۔ ”عمارت کی سیڑھی پچھلی طرف ہے۔ اس نے عمارت کی پچھلی طرف جانے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ عمارت کا چوکیدار اس کے سامنے آگیا۔ ”کہاں جانا ہے صاحب؟“

”پانچویں منزل پر۔“ ”کہہ کرو وجہ نے پوچھا۔“ لفٹ چل نہیں رہی کیا؟“ ”چالو ہے جناب۔“ چوکیدار نے جواب دیا اور لفٹ کا بٹن دبانے لگا۔ پھر اس نے گھنٹی کا بٹن دبا کر دیکھا۔ لیکن تھوڑی دیر تک جب اسے لفٹ کے نیچے آنے کی کوئی آواز سنائی نہیں دی تو بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”صاحب کبھی کبھی تو یہاں ایسے انارٹی لوگ آجاتے ہیں کہ اوپر جانے کے بعد لفٹ کا دروازہ بھی ٹھیک سے بند نہیں کرتے۔“

”لیکن مکان کی سیڑھی پچھلی طرف کیوں ہے؟“ وجہ نے پوچھا۔

”چھوڑیں صاحب... اس مکان کی ہر بات بے ڈھنگی ہے۔“ چوکیدار نے منہ بنا کر کہا۔ ”یہ مکان پہلے صرف تین منزلہ تھا اس وقت لفٹ نہیں ڈالی گئی تھی مگر جب دو اور منزلیں بڑھائی گئیں تو لفٹ کی ضرورت بھی پیش آگئی۔ یہاں چونکہ لفٹ کے لیے جگہ تھی اس لیے عمارت کا صدر دروازہ پیچھے سے ہٹا کر یہاں لے آیا گیا۔ مگر آپ کو پانچویں منزل پر کس کے پاس جانا ہے؟“

”روما دیوی کے یہاں“ اس نے جواب دیا۔

یہ سن کر چوکیدار اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وجہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ روما دیوی گھر میں موجود ہوں گی نا؟ لیکن تب ہی لفٹ نیچے آگئی اس کا دروازہ کھلا اور اندر سے ایک آدمی جلدی سے باہر نکل کر تیزی سے نکلتا چلا گیا۔ اسے اس طرح بدحواسی کی حالت میں جاتے دیکھ کر چوکیدار بڑبڑایا ”جانے کیسے کیسے لوگ یہاں آجاتے ہیں...؟“

اچانک اسے خیال آگیا کہ پولیس نے اس سے پوچھ لیا کہ تم کون بول رہے ہو تو وہ کیا جواب دے گا؟ روکھی کی موت کے صدمے کے ساتھ ساتھ خاندان کی عزت کا جنازہ نکلنے کا منظر بھی اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ نیپال کے راج پروہت کی بیٹی رکنی جو دہلی کی کال گرل روما دیوی کے نام سے مشہور تھی کی پراسرار خودکشی۔ اخباروں میں جب اس طرح کی سرخیاں لگیں گی تو اس کے پتا جی یہ دہرا صدمہ کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکیں گے۔ ان کے دل کی دھڑکن تو کال گرل کا لفظ سنتے ہی بند ہو جائے گی۔ ”نہیں نہیں...“ وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا... ”میری یہاں موجودگی کا کسی کو بھی علم نہیں ہونا چاہیے۔ کیا کروں؟ بھاگ جاؤں؟“

اس نے ایک بار پھر روکھی کی بے جان لاش پر نظر ڈالی۔ جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے پوچھ رہا تھا۔ ”چھ سال تک اتنا کچھ برداشت کرنے کے بعد تمہیں یہ راستہ کیوں اختیار کرنا پڑا روکھی؟ جہاں اتنے سال گزار دیے تھے وہاں آدھا گھنٹا اور زندہ رہ جاتیں تو شاید اس کمرے کا منظر ہی کچھ اور ہوتا۔“

اچانک اس کی نظر روکھی کی گردن میں پڑے ہوئے لاکٹ پر گئی اور وہ چونک کر بڑبڑاپا۔۔۔۔۔ ”ارے یہ لاکٹ تو روکھی کو رگھوپتی نے پہنایا تھا اس لاکٹ پر تو ہشپتی ناتھ کے مندر کی تصویر کھدی ہوئی ہے۔“

چند لمحوں تک وہ اس لاکٹ کو گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اس نے اس لاکٹ کو اپنی مٹھی میں لے لیا اور دانت پیس کر بولا۔ ”ہشپتی ناتھ تم بھی میری بہن کی حفاظت نہیں کر سکے۔“ اس نے غصے میں اپنا ہاتھ زور سے کھینچا تو لاکٹ اس طرح اس کی مٹھی میں آگیا جیسے سوکھے ہوئے درخت سے کوئی سوکھا ہوا پتا ٹوٹ کر گر جاتا ہے۔

پہلے تو غصے میں اس کا جی چاہا کہ وہ لاکٹ کو زور سے فرش پر دے مارے لیکن ایسا کرنے کی اس میں ہمت نہیں ہوئی وہ لاکٹ کو آنکھوں کے سامنے رکھ کر بڑبڑانے لگا ”اب تو روکھی کی یہی ایک آخری نشانی ہے جو ساتھ رہے گی۔“

اس نے جلدی سے لاکٹ کو اپنی جیب میں سرکا دیا اور یہ سوچ کر کمرے سے باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا کہ کم از کم پاس پڑوس والوں کو تو اس کی

چھت سے ایک انسانی جسم لٹک رہا تھا اور دروازے سے اسے کمر تک حصہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے لباس سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی عورت ہی ہے۔ پھر بھی وہ دل کو یہ سمجھاتا ہوا دو قدم آگے بڑھا کہ یہ روما دیوی... عرف روکھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈال کر چھت سے لٹک جانے والی لاش کا چہرہ دیکھتے ہی وہ چکرا کر فرش پر گر پڑا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ پھٹری ہوئی بہن سے ملنے کی وہ امیدیں جو پچھلے چھ سال سے اس کے سینے میں پرورش پا رہی تھیں وہ سب آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہی تھیں اور وہ دردناک لہجے میں بول رہا تھا۔ ”روکھی میری بہن یہ تو نے کیا کیا؟“

سک سک کر روتے ہوئے وجے کو اچانک خیال آیا کہ یہ رونے کا وقت نہیں ہے دل پر ہاتھ رکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آنسو پونچھ کر اس نے ایک بار پھر اپنی بہن کا چہرہ دیکھا۔ پھر لٹکتے ہوئے ہاتھ کی نبض ٹٹولنے لگا۔ لیکن نبض بیٹھی ہوئی تھی اب کیا کرنا؟ پہلے روکھی کے جسم کو نیچے اتارا جائے یا کسی کو اس کی خبر دی جائے؟ وجے کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ مگر پھر فوراً ہی اسے جولی کا خیال آگیا۔ لیکن اس نے فوراً ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جولی یہ بھیانک منظر دیکھتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑے گی۔

یکایک اس کی نظر ٹیلیفون پر پڑی۔ فون کا ریسیور ایک جانب پڑا ہوا دیکھ کر اس کے دماغ میں بجلی کی ایک لہری دوڑ گئی۔ پندرہ بیس منٹ پہلے جب اس نے باہر سے یہاں فون کیا تھا تو کسی نے ریسیور اٹھایا تھا مگر کما کچھ نہیں تھا اور ریسیور الگ رکھ دیا گیا تھا۔ اس نے سوچا تو کیا اسی وقت روکھی خودکشی کرنے کی تیاری کر رہی تھی؟

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور اسے زور زور سے دبائے لگا کاش وہ ٹیکسی سے اترتے ہی سیدھا اوپر آجاتا تو ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ بیس پچیس منٹ کی اس تاخیر نے اس کی بہن کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا کاش وہ جس پینے کے بہانے دیر نہ کرتا تو شاید روکھی خودکشی کا ارادہ ہی نہ کرتی... مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ اس نے دیوار سے سر لگایا اور اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگا۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد وہ ٹیلیفون سیٹ کے پاس پہنچ گیا اور پولیس کو فون کرنے کے لیے ریسیور اٹھایا ہی تھا کہ

ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر وہ ایک سیکنڈ کے لیے سانس لینے کے لیے رک گیا۔ پھر دبے پاؤں وہ عمارت کے پچھلے دروازے کی جانب سرکنے لگا۔ وہ دروازے تک پہنچ گیا اور اندھیرے میں چاروں طرف دیکھ کر اطمینان کرنے لگا کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ آس پاس کوئی موجود نہیں ہے تو اس نے دروازے کے باہر پاؤں رکھ دیے۔

مگر ٹھیک اسی وقت پیچھے سے کسی نے اس پر کوئی موٹا کپڑا ڈال کر اسے دونوں ہاتھوں سے جکڑ لیا۔ وجہ کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مگر اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ آدمی اسے دبوچ کر آگے کی جانب لے جا رہے ہیں اور پھر انہوں نے اسے کسی کار کے اندر دھکیل دیا اور پھر وہ کار تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔



”گوپی ہم نے گھر کی ایک ایک جگہ اور ایک ایک چیز دیکھ ڈالی لیکن ہمارا مال کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔“ ڈرائنگ روم میں آکر رانا نے گوپی ناتھ سے کہا۔ جو بڑے سکون سے ایک صوفے پر بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ رانا ایک لمحے تک اس کے گھنہیر چہرے کو تکتا رہا پھر اپنی الجھن کا اظہار کرتے ہوئے آگے بولا۔ ”میرا خیال ہے بینک کی لوٹی ہوئی رقم اس نے کسی اور جگہ چھپا دی ہوگی۔“

لیکن گوپی ناتھ نے اس کی یہ بات سننے کے باوجود اپنے ہونٹوں میں دبا ہوا سگار نہیں ہٹایا وہ ابھی تک چپ چاپ بیٹھا رانا کے چہرے کو ہی گھور رہا تھا۔ رانا کو اس کی یہ پراسرار سی خاموشی بری طرح کھٹک رہی تھی اسی لیے تھوڑی سی تاخیر کے بعد وہ پھر بولا۔ ”وجہ نے اپنی زبان بالکل ہی بند کر رکھی ہے۔ اور تم سگار کا دھواں اڑاتے ہوئے یہاں بیٹھے ہو؟ اس کے ساتھ جب تک سختی نہیں ہوگی اس وقت تک وہ مال اگلنے والا نہیں ہے اگر ہم نے جلد ہی کوئی فیصلہ نہیں کیا تو اس طرح ساری رات گزر جائے گی اور ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔“

اچانک گوپی ناتھ نے ایک جھٹکے سے سگار اپنے ہونٹوں سے کھینچ لیا اور بولا

اطلاع کر دینی چاہیے۔

دروازے سے باہر نکل کر وہ برابر والے فلیٹ کی جانب آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر نیچے سڑک پر جا کر اٹک گئی۔ پولیس کی ایک جیپ اور اس کے پیچھے ایک ایمبولینس عمارت کے گیٹ میں داخل ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ وجہ پولیس کی جیپ اور ایمبولینس کو دیکھ کر چونک پڑا۔ پولیس کو کس طرح خبر ہو گئی کہ اس عمارت میں کوئی لاش پڑی ہے؟ پولیس کے ساتھ ایمبولینس بھی ہے اور اس کا مطلب صاف ہے کہ کسی نے پولیس کو پوری معلومات فراہم کر دی ہیں مگر وہ کون ہو سکتا ہے؟

اچانک دماغ میں لگنے والے ایک زور دار جھٹکے سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور ایک خیال بڑی تیزی سے اس کے ذہن میں دوڑ گیا..... اس واقعے میں ملوث کرنے کے لیے کسی نے کوئی چال تو نہیں چلی ہے؟

اس خیال کے آتے ہی وہ سر سے لے کر پیر تک کانپ گیا۔ کون اس کا دشمن ہو سکتا ہے؟ یہ سوچنے کا اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ کیونکہ پولیس لفٹ کے ذریعہ اب اوپر پہنچنے والی تھی۔ اگر پولیس اوپر آگئی تو وہ بھاگ نہیں سکے گا اس نے جلدی سے سوچ لیا کہ اس کا جو چاہے حشر ہو لیکن یہ راز تو کسی بھی قیمت پر ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ روما دیوی حقیقت میں نیپال کے راج پروہت گوری شکر کی بیٹی روکھی تھی۔ اور پھر اس نے سیڑھیاں تلاش کرنے کے لیے دبے پاؤں دوڑ لگا دی۔ باتیں

جانب کے سرے پر پہنچا تو وہاں سیڑھی دکھائی نہیں دی۔ اس لیے وہ تیزی سے واپس پلٹا۔ لفٹ کے قریب آیا تو اوپر آتی ہوئی لفٹ کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی اس کا دم گھٹنے لگا اور دماغ چکرانے لگا۔ اور تب ہی اسے لفٹ کی داہنی جانب ایک چھوٹا سا راستہ دکھائی دیا۔ وہ وہاں چھپنے کے لیے تیزی سے لپکا۔ ابھی وہ دس قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اسے سیڑھیاں نظر آگئیں۔ لفٹ کے دروازے کے کھلنے کی آواز سننے ہی اس نے آنکھیں بند کر کے ایک ساتھ دو دو تین تین زینے پھلانگتے شروع کر دیے۔

پچیس سیکنڈ میں وہ پانچ منزلہ عمارت سے نیچے اتر کر بری طرح ہانپنے لگا تھا اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ دونوں

ساتھ وجہ کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں ایک اجنبی شخص کو تلاش کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا اور ایسی حالت میں تو یہ اور بھی ناممکن تھا جب کہ انہیں خود بھی پولیس کے خوف سے چھپ چھپ کر چلنا پڑتا تھا۔ پھر بھی اس نے ایک ایک قدم پھونک پھونک کر وجہ کی تلاش جاری رکھی ہوئی تھی وہ اور اس کے تینوں ساتھی الگ الگ سینما ہالوں میں جا کر فلم کے تینوں شو دیکھ لیتے تھے اور رات کو الگ الگ ہوٹلوں میں جا کر کھانا کھاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ وجہ بالکل اچانک ہی لاکھوں روپے کا مالک بن گیا ہے اس لیے وہ عیش و عشرت کے لیے کبھی بھی کسی ہوٹل اور تفریح گاہ میں جا سکتا ہے۔ اس نے نیپال بھون سے اتنی معلومات تو حاصل کر لی تھیں کہ وجہ تین روز تک وہاں قیام کر چکا تھا اور نیپال اسمبلی سے اس نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ ”کوٹا کھانا“ کے سلسلے میں رقم کی جو ہنڈی اسے دی گئی تھی وہ بھی اس نے کیش کرا لی تھی۔ یہ ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اشوکا جیسے فائیو اشار ہوٹل سے لے کر کنٹ سرکس کے ٹو اشار اور تھری اشار ہوٹلوں کو بھی چیک کر لیا تھا لیکن کسی نے بھی وجہ کمار کا نام سن کر اس کی موجودگی کی حاشی نہیں بھری تھی اور چوتھے روز وہ تھک ہار کر اس کی تلاش کا ارادہ ملتوی کر کے دماغ کا بوجھ ہٹا کرنے کی نیت سے جیپ میں بیٹھ کر گھومنے نکل پڑے تھے۔ اور یہ اتفاق ہی تھا کہ گوپی ناتھ کی نظر وجہ پر پڑ گئی تھی جو آئیڈیل اپارٹمنٹ کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو رہا تھا اور تب وہ بہت جوشیلے لمبے میں اپنے ساتھیوں سے بولا تھا۔

”دیکھو... وہ رہا وجہ۔ کم بخت کو جب ہم پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہے تھے تو اس کا کہیں پتا نہیں چل رہا تھا۔ اور اب جب کہ ہم گھومنے نکلے ہیں تو یہ ہمارے سامنے آگیا ہے۔“

اس نے آئیڈیل اپارٹمنٹ سے کچھ فاصلے پر اپنی جیپ روک دی تھی۔ اور اپنے ساتھی شپرا کو بلڈنگ کے چاروں طرف چکر لگانے بھیج دیا تھا اور تب ہی یہ بات اسے معلوم ہوئی تھی کہ لفٹ کے ذریعہ اوپر جانے کا راستہ بلڈنگ کے اگلے حصے میں ہے۔ جب کہ زینے کا راستہ بلڈنگ کی پچھلی جانب ہے۔ ان حالات میں اس نے دونوں راستوں پر نظر رکھنے کے لیے جیپ کو ایک ایسی جگہ پر لے جا کر کھڑا کر دیا تھا

”رانا میں یہ سوچ رہا تھا کہ پولیس کی جیپ کو آتے دیکھ کر ہم لوگ تو اپنی جیپ پچھلے گیٹ کی جانب لے گئے تھے مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وجہ پولیس سے ڈر کر پچھلے دروازے سے کیوں بھاگ رہا تھا؟ اسے پولیس سے چھپنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”ممکن ہے بینک ڈکیتی کے سلسلے میں جس طرح دہلی کی پولیس ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اسی طرح وہ وجہ کے پیچھے بھی لگ گئی ہو۔“ رانا نے کہا تو اس کی دلیل سن کر گوپی ناتھ نے بڑی تیز نظروں سے اسے گھورا اور بولا۔ ”تم ہمیشہ جواب دینے میں جلد بازی کرتے ہو۔ ذرا سکون سے سوچ کر بولنا سیکھو۔ وجہ کو آئیڈیل اپارٹمنٹ کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوتے میں نے دیکھا تھا۔ پھر میں نے تمہیں بھی دکھایا تھا۔“

”ہاں“

”جب وہ اندر جا رہا تھا تو اس کی چال میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آرہی تھی کہ وہ پولیس سے ڈر کر بھاگ رہا ہو۔ وہ بڑے سکون سے قدم اٹھاتا ہوا اندر جا رہا تھا اور اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ جب تک لفٹ نیچے نہیں آئی اس وقت تک وہ خود کو چھپائے بغیر لفٹ کے انتظار میں وہیں کھڑا رہا تھا اور چوکیدار سے بھی بے دھڑک پوچھ گچھ کر رہا تھا۔“

”تو پھر یہ کیوں نہ سوچا جائے گوپی ناتھ کے اس نے ہماری لوٹی ہوئی رقم کو آئیڈیل اپارٹمنٹ کے ہی کسی کمرے میں چھپا کر رکھا ہو گا؟“ رانا نے جواب دیا۔

تمہاری طرح پہلے میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ گوپی ناتھ مسکرا کر بولا۔ ”لیکن آدمی نے جس جگہ لاکھوں روپے چھپائے ہوں اس جگہ وہ پہلی بار کس طرح جاتا ہوا دکھائی دے گا؟ تم نے دیکھا نہیں وہ تو چوکیدار سے کسی کے بارے میں پوچھ کر اوپر گیا تھا۔“

گوپی ناتھ کی یہ بات سن کر رانا کے چہرے پر الجھن کی لکیریں اور گہری ہو گئیں اور وہ جھنجھلائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تب تو پھر الٹی سیدھی باتیں سوچنے سے یہی بہتر ہے کہ جا کر اس کے پیٹ میں دو چار گھونٹے لگا دو تاکہ وہ سب کچھ فائٹ اگل دے۔“

گوپی ناتھ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور سگار پر جی ہوئی راکھ کو جھاڑ کر پھر سے سگار کا دھواں اڑانے لگا۔ وہ پچھلے چار روز سے اپنے ساتھیوں کے



جہاں سے وہ اور اس کے ساتھی دونوں راستوں سے آتے جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھ سکتے تھے۔ اور جب وہ چاروں وجے کے واپس آنے کے انتظار میں بیٹھے تھے اچانک انہیں پولیس کی ایک جیپ وہاں آتی ہوئی دکھائی دی۔ پولیس کی جیپ کو دیکھ کر پہلے وہ یہی سمجھے کہ پولیس انہیں گرفتار کرنے کے لیے ان کے پیچھے آئی ہے۔ انہوں نے اپنی جیپ کو وہیں چھوڑ کر پیدل ہی بھاگ جانے کے بارے میں سوچ لیا تھا۔ مگر جب انہوں نے پولیس جیپ کو آئیڈیل اپارٹمنٹ کے کپاونڈ میں مڑتے دیکھا تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ اور پھر جب انہیں پولیس کی جیپ کے پیچھے ایک ایسولینس نظر آئی تو انہیں پورا یقین ہو گیا کہ عمارت کے اندر ضرور کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا ہے جس کی وجہ سے پولیس اور ایسولینس کو وہاں آنا پڑا ہے۔



تھوڑی دیر بعد جب وجے نے پانچویں منزل سے جھانک کر نیچے دیکھا تھا تو ایک بار پھر گولی ناتھ کی نظر اس پر پڑ گئی تھی۔ اس وقت وجے پولیس کی جیپ کو دیکھ کر بہت زیادہ گھبرایا ہوا سا دکھائی دیا تھا۔ اس کی گھبراہٹ کو محسوس کرنے کے بعد ہی اس نے اپنی جیپ بلڈنگ کی پچھلی جانب والے راستے پر لا کر کھڑی کر دی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب وجے بلڈنگ سے نکلنے کے لیے پچھلا زینہ ہی استعمال کرے گا، اس کا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ وجے بلڈنگ کے اگلے حصے میں پولیس کی جیپ کو رکھ دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ اس لیے جب اس نے پولیس کی نظروں سے بچ کر پچھلی جانب کے زینے سے اتر کر بھاگنے کی کوشش کی تھی تو گولی ناتھ نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اسے دبوچ لیا تھا۔ انہوں نے جب اس کے سر پر کپڑا ڈال کر اسے جیپ میں بٹھایا تھا تو وجے تھوڑی دیر تک آزاد ہونے کی جدوجہد کرتا رہا لیکن جب اسے اپنی کامیابی کی امید نظر نہیں آئی تو اس نے خود کو ان لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ پھر جب ایک سنسان سی جگہ پر جیپ روک کر انہوں نے اس کے منہ پر سے کپڑا ہٹایا تو وجے پولیس کے بجائے چند نیپالی چہرے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ یہ چہرے اس کے جانے پہچانے چہرے تھے۔ اس لیے اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا تھا۔ ”اوہ... تو یہ تم لوگ ہو؟“

پھر اس نے ان لوگوں سے یہ تک نہیں پوچھا تھا کہ تم لوگ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو؟

اور تب گولی ناتھ کو خود ہی کہنا پڑا تھا۔ ”وجے میرا خیال ہے کہ اب تم یہ سمجھ ہی گئے ہو گے کہ ہم لوگ تمہیں اٹھا کر یہاں کیوں لائے ہیں؟ شاید تم یہ بھی

جب رانا نے آگے بڑھ کر وجے کو گردن سے پکڑ کر جھٹکا دینے کی کوشش کی تھی تو گوبی ناتھ نے اسے بھی روک کر نرمی سے کام نکالنے کی کوشش کی تھی اور وجے سے کہا تھا۔ ”تم کچھ بولتے کیوں نہیں وجے؟ تم کچھ بتاؤ گے جب ہم فیصلہ کر سکیں گے کہ ہمیں تمہارے ساتھ کس حد تک آگے جانا چاہیے؟“

اس بات پر پہلی بار وجے کے چہرے پر کچھ تبدیلی کے آثار نظر آئے۔ اس نے پہلے تو ایک گہرا سانس لیا پھر اپنے حلق سے تھوک اتارتے ہوئے بہ مشکل بولا۔ ”برائے مہربانی اس وقت آپ لوگ مجھ سے کچھ مت پوچھیں۔“ اتنا کہہ کر اس نے خود کو پینک پر گرادیا تھا اور تکیے میں منہ چھپا کر بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔

ٹھیک اسی وقت شرما کمرے میں داخل ہوا تھا اور اس نے گوبی ناتھ کے پاس آکر کہا۔ ”گوبی یہ دیکھو بینک کی چیک بک مجھے یہ میز کی دراز میں سے ملی ہے۔“ گوبی ناتھ نے سگار کی راکھ جھاڑی اور شہرا کے ہاتھ سے چیک بک لے کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا۔ ”ہوں۔۔۔ تو آج ہی اس نے بینک سے دو لاکھ روپے نکلوائے ہیں۔“

یہ سن کر بالکونی میں کھڑا ہوا رانا بھی ان کے قریب آگیا اور بولا۔ ”تب تو یقیناً“ وجے دو لاکھ روپے لے کر آئیڈیل اپارٹمنٹ میں کوئی سودا کرنے گیا ہو گا۔“

گوبی ناتھ نے ایک جھٹکے سے گردن اٹھا کر اس طرح اسے گھورا جیسے اپنی تیز نظروں سے اس کا جسم چھلنی کر دے گا۔ ”پھر تم بلا سوچے سمجھے بول گئے؟“ وہ کرخت لہجے میں بولا ”تمہیں یاد ہے ہم لوگوں نے وجے کو آئیڈیل اپارٹمنٹ میں خالی ہاتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا؟“

”اوہ۔۔۔“ رانا اپنا سر کھجانے لگا پھر آگے بولا۔ ”تب اس نے بینک سے نکلوائے ہوئے دو لاکھ روپے کہاں رکھے ہوں گے؟ اس گھر میں سے تو کچھ بھی ہاتھ نہیں لگا ہے۔۔۔“

”رانا ہم لوگوں نے بینک کی تقریباً“ بچپن یا ساٹھ لاکھ کی رقم لوٹی تھی اور ہمیں اس کی تلاش ہے۔“ گوبی ناتھ گھمبیر لہجے میں بولا ”ممکن ہے وجے نے بینک سے جو دو لاکھ روپے نکلوائے ہوں وہ اس کے ”کوٹا کھانا“ والے روپے ہوں۔“

سوچ رہے ہو گے کہ پولیس کے ہاتھوں سے بچنے کی کوشش میں تم بینک سے لوٹی ہو! رقم کے اصلی حقداروں کے ہتھے چڑھ گئے ہو۔۔۔“

لیکن وجے اس کی یہ بات سن کر بھی خاموش رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی گہری اداسی چھائی ہوئی تھی اور چہرے پر افسردگی کی بے شمار آڑی ترچھی لکیریں ابھری ہوئی تھیں۔

”تمہیں ہم لوگوں کو اپنے ساتھ اپنے ٹھکانے پر لے جانا ہو گا وجے۔“ وجے خاموش دیکھ کر گوبی ناتھ نے کہا تھا۔ ”وہاں ہم سکون سے اپنا کام کر سکیں گے۔ لے جاؤ گے نا؟“

لیکن وجے نے منہ سے کچھ کہنے کی بجائے صرف گردن کے اشارے سے اپنی رضا مندی کا اظہار کر دیا تھا اور پھر جب تک جیب چلتی رہی وہ چپ رہ کر اشارے سے انہیں راستہ دکھاتا جا رہا تھا۔ اس کی اس پراسرار خاموشی نے گوبی ناتھ کو اور بھی زیادہ چونکا کر دیا تھا اس لیے اس نے کہا تھا ”دیکھو وجے ہمیں اس طرح اپنے گھر کے اندر لے جانا جیسے ہم تمہارے دوست ہوں۔ میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ اس کا انجام برا ہو گا۔ کیونکہ ہم لوگ ہر قیمت پر اپنا کام ختم کر کے ہی یہاں سے واپس جائیں گے۔“

لیکن گوبی ناتھ کی اس دھمکی کے باوجود بھی وجے نے اپنے منہ سے کچھ نہیں کہا تھا اور انہیں چپ چاپ اپنے گھر لے آیا تھا۔ مکان کے اوپر والے حصے میں آنے کے بعد گوبی ناتھ نے پورے گھر کا ایک چکر لگا کر یہ اطمینان کر لیا تھا کہ گھر میں ان کے علاوہ کوئی اور موجود تو نہیں ہے۔ جب وہ پوری طرح مطمئن ہو گیا تو پھر اس نے وجے سے پوچھا تھا ”اب بتاؤ وجے بینک کے دو بکسوں کا رویا تم نے کہاں چھپایا ہے؟“ اتنا کہہ کر اس نے اپنی جیب سے اپنا پستول نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تھا۔ لیکن وجے کے سپاٹ چہرے پر اسے پستول کا بھی کوئی خوف نظر نہیں آیا تھا۔ اس وقت وجے کو اپنی طرف اجنبی نظروں سے گھورتے دیکھ کر اس کے جی میں آیا تھا کہ وہ ایک زور دار گھوٹا اس کے جڑے پر رسید کر دے۔ لیکن وجے کی آنکھوں میں چھائی ہوئی اداسی کی گہری لکیروں کو دیکھ کر اس کا سارا غصہ دم توڑ کر رہ گیا تھا اور

اپنا پستول والا ہاتھ اپنی پیٹھ کے پیچھے موڑ لیا اور دوسرا ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا اور گولی اور شہرا سانس روکے دروازے کے قریب ہی ہر قسم کی صورت حال سے نپٹنے کے لیے دیوار سے چپکے ہوئے کھڑے تھے۔ یکایک انہیں رانا کی آواز سنائی دی ”ارے رگھوپتی تم؟“ رانا کی آواز میں پہلے تو خوشی اور حیرت کی جھلک سی محسوس ہوئی تھی مگر پھر اس کے لہجے میں گھبراہٹ اور خوف کی کپکپاہٹ سی آگئی۔ ”تم... تم یہاں

کیسے؟ اور یہ تمہارے ساتھ... کون ہے؟“

لیکن گولی اور شہرا کو اس کے سوال کے جواب میں گھر میں داخل ہونے والوں کے قدموں کی آہٹ ہی سننے کو ملی۔ رگھوپتی رانا کی بات کا جواب دیے بغیر بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے جولی بھی اندر آگئی۔ دروازے کے اندر دو قدم آگے بڑھ کر یکایک رگھوپتی پلٹا تو اس کی نظر دیوار سے چپک کر کھڑے ہوئے گولی اور شہرا پر پڑی جو پستول تانے کھڑے تھے۔ یکایک گولی ہاتھ کی گردن اکڑ گئی اور وہ ہونٹ بھیجنے لگا ”تو اس کا مطلب ہے رائل نیپال بینک کو لوٹنے والا پورا گروہ اس گھر میں گھس آیا ہے۔“ اتنا کہہ کر اس نے رانا کی طرف دیکھا اور اس سے پوچھا۔ ”وجہ کہاں ہے؟“

رانا نے کوئی جواب نہ دے کر گولی ہاتھ کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو کہ کیا جواب دوں؟

”وہ اندر پلنگ پر پڑا ہے۔“ گولی ہاتھ نے جواب دیا۔

”کیا؟“ جولی چیخ پڑی اور دوڑتی ہوئی وجہ کے کمرے کی طرف بھاگی۔

لیکن رگھوپتی کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں اس نے گھور گھور کر باری باری ان تینوں کو دیکھا اور دانت پیس کر بولا ”تو تم لوگوں نے... اسے...“ سوچ میں ڈوب گئے۔

”اب تم ہی کہو گے گولی ایسے شیطانی کام کرنے والے کو اس کے انجام تک پہنچانا بھی بھلائی کا کام ہے نا؟“

رگھوپتی نے پوچھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے۔“ گولی ہاتھ بولا۔ لیکن اس کا پتا کیسے چلے گا؟“

”تو پھر اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ شہرا اس طرح بولا جیسے اس کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا تھا۔ ”پون گھنٹے سے ہم اس گھر کی تلاشی لے رہے ہیں۔ لیکن کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا ہے اور وجہ تو اس طرح پلنگ پر گرا پڑا ہے جیسے اسے ہماری موجودگی کی کوئی پرواہ ہی نہ ہو... میری تو سمجھ میں نہیں آتا گولی ہاتھ کہ آج تم اتنے رحم دل کیوں بن گئے ہو؟“

”یہ بات تو خود میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔“ گولی ہاتھ نے گہری سنجیدگی سے کہا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا پھر آگے بولا۔ ”مجھے تو اس کی خاموشی کے پیچھے کوئی بہت بڑا راز نظر آ رہا ہے۔ وہ اتنا زیادہ گھبرایا ہوا ہے جیسے کوئی بہت بڑا گناہ کر کے اندر ہی اندر پیچھتا رہا ہو۔“

”کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اس طرح کی اداکاری کر کے وقت گزرنے کی کوشش کر رہا ہو؟“ شہرا نے اپنے شک کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”ممکن ہے وہ کسی کے آنے کی راہ دیکھ رہا ہو۔“

”ایسا تو...“ گولی ہاتھ نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ دروازے کی گھنٹی اسی طرح بج اٹھی جیسے وہ شہرا کی کسی ہوئی بات پر سچ کر مہر لگا رہی ہو۔ گولی ہاتھ آگے کچھ نہ بول سکا اور وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ کون ہو گا؟ ایک ساتھ تینوں نے اپنے اپنے پستول نکال لیے۔ یکایک گولی ہاتھ لپک کر اس کمرے کے دروازے کی جانب سرک گیا جہاں وجہ لیٹا ہوا تھا۔ اس نے اندر جھانک کر دیکھا تو وجہ اسی طرح پلنگ پر اوندھا پڑا تھا جیسے اس نے دروازے پر بجنے والی گھنٹی کی آواز سنی ہی نہ ہو۔ وجہ کو اس قدر بے خبر دیکھ کر اس کا پہلی بار یہ جی چاہا کہ وہ مار مار کر وجہ کا حلیہ بگاڑ دے۔ مگر اب اس کا موقع نہیں تھا۔ کیونکہ کوئی دروازے پر کھڑا گھنٹی بج رہا تھا۔ دوسری گھنٹی کی آواز سننے ہی گولی ہاتھ کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ لیکن پھر بھی اس نے رانا کو اشارے سے سمجھایا کہ تم سنبھل کر دروازہ کھول دو ہم ہوشیاری سے دیوار کے ساتھ چپکے کھڑے ہیں۔

رانا اس کی بات سمجھ گیا اور پھر دوسرے ہی پل وہ دبے پاؤں دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ پہلے تو وہ ایک لمحے کے لیے دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر اس نے

رگھوپتی نے سن لی اور وہ دروازے پر سے ہی بولا۔ ”رانا کی بات مجھے منظور ہے۔ آج کی رات یا کل دن تک ان چوبیس گھنٹوں میں صحیح صورت حال سامنے آجائے گی۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور ٹیلیفون کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ پھر ریسیور کان سے لگا کر رانا سے بولا۔ ”میں ابھی پوچھ لیتا ہوں۔“

”ہیلو۔“ دوسری جانب سے کسی نے ریسیور اٹھایا تو رگھوپتی نے کہا۔ ”ریگن“ وہ یہ ایک لفظ کہہ کر چپ ہو گیا تو وہ تینوں حیرت میں پڑ گئے یہ ریگن کون ہے؟“

چند سیکنڈ کے بعد دوسری طرف سے جواب ملا۔ ”آج رات دس بجے میں پتا لکھواتا ہوں وہیں پہنچ جانا۔“

”ٹھیک ہے۔“ رگھوپتی نے کہا اور پھر قلم نکال کر پتا نوٹ کرنے لگا۔ جب وہ پتا نوٹ کر چکا تو دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”گاڑی کو گلی کے موڑ پر ہی چھوڑ دینا۔ اور گلی میں لٹیک دوسرے سے اونچی آواز میں باتیں نہ کرنا۔ آگے چل کر جو سامنے سے آتا ہوا شخص ملے تو اس سے پوچھنا ریگن ہاؤس کہا ہے۔ بس میرے آدی سمجھ جائیں گے۔ اس کے بعد تم لوگ اس کے پیچھے چلے آنا۔“

”مگر ہم تین نہیں چار ہیں ریگن۔“ پھر اس سے پہلے کے دوسری طرف سے چاروں پر کوئی اعتراض ہوتا وہ خود ہی جلدی سے بول پڑا۔ ”چوتھے کے بغیر ایک بڑی رقم کا انتظام نہیں ہو سکتا۔“

”ٹھیک ہے چار ہی آنا۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”لیکن یاد رکھو اگر کوئی پانچواں بھی تمہارے ساتھ ہوا تو کوئی تمہیں ریگن ہاؤس کا پتا نہیں بتائے گا۔ اس لیے کہ اس گلی میں ریگن ہاؤس نام کا کوئی گھر ہی نہیں ہے۔“ اس کے ساتھ ہی دوسری جانب سے سلسلہ منقطع ہو گیا رگھوپتی نے ریسیور رکھا تو وہ تینوں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”بات پکی ہو گئی ہے گوپی۔“ رگھوپتی ان کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”آج رات دس بجے ہمیں جانا ہے۔ وچے جولی میں اور تم۔“

”اور ہم دونوں؟“ رانا نے بے صبری سے پوچھا۔

”تم اور شہرا یہیں رہو گے۔“ رگھوپتی نے فیصلہ سنایا۔ ”اور اس فیصلے میں ردو

”پتا تو نہیں۔ البتہ اس کا ثبوت مل گیا ہے۔“

رگھوپتی بولا۔

”کیسا ثبوت؟“ رانا نے پوچھا۔

”یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔“ رگھوپتی بولا۔ ”پہلے تم لوگ یہ فیصلہ کر لو کہ اس کام میں ہمارا ساتھ دو گے یا نہیں۔“

”یہ تمہاری شرط ہے؟“

جس طرح یہ میری شرط ہے۔ اس طرح یہ تمہارا فرض بھی ہے۔“ رگھوپتی نے انہیں آمادہ کرنے کی کوشش میں کہا۔ ”دشمن اگر ایک دو ہوں تو میں اور وچے ہی کافی ہوں گے۔ اور اس کے لیے لاکھ دو لاکھ خرچ ہوتے ہیں تو اتنی رقم ہمارے پاس ہے ورنہ یہ طے ہے کہ تم لوگوں کو ہمارے اس کام میں حصے دار بننا ہو گا۔“

اب گوپی ناتھ نے اپنے دونوں ساتھیوں رانا اور شہرا کی طرف دیکھا تو رگھوپتی سمجھ گیا کہ وہ ان سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ اٹھ گیا۔ اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں دو منٹ میں آتا ہوں جب تک تم لوگ سوچ لو۔“

”رانا مجھے تو اس میں کچھ گڑبڑ نظر آرہی ہے۔“ گوپی ناتھ نے دھیرے سے کہا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ شہرا بلی آواز میں بولا۔ ”یہ رگھوپتی ہمیں غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”لیکن ساری باتیں سننے کے بعد بھی انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟“ رانا نے درمیانی راستہ اپناتے ہوئے کہا۔ ”اس کی مدد کے بغیر اپنی کھوئی ہوئی رقم واپس نہیں لا سکتے۔ اور دادا گیری کے آگے رگھوپتی جھکنے والا نہیں ہے۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ ہمیں ہی جھکنا پڑے گا؟“ گوپی ناتھ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”کس کو معلوم اس کا کام ختم ہونے میں کتنے دن لگ جائیں؟“

”اس کی مدت ہم خود طے کر لیں گے پھر تو کوئی اعتراض نہیں ہو گا؟“ رانا نے مفاہمت کی راہ بھائی لیکن اس کی یہ بات ڈرانگ روم میں داخل ہونے والے

”تم سنگرام رانا ہی ہونا؟“ اندر سے اس عورت نے پر یقین لہجے میں پوچھا تو رانا کو کھڑکی کے قریب بڑھنا پڑا وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے بڑی احتیاط سے کام لینا

پڑے گا ورنہ نہ معلوم یہ عورت کون ہے اور اسے کیسے پہچانتی ہے؟ لیکن کھڑکی کے قریب آکر اس عورت کا چہرہ دیکھتے ہی اس کے منہ سے نکل گیا۔ ”ارے.... آشا.... تم یہاں؟“

”میں تو یہیں رہتی ہوں۔ لیکن تم یہاں کب آئے؟“ آشا کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی تھی لیکن اس کا سوال سن کر وہ اندر ہی اندر گھبرا کر سوچ رہا تھا کہ کاش یہاں کوئی جان پہچان والا نہ ملتا تو اچھا تھا۔

”اندر آجاؤ سگرا“ آشا نے ہنس کر کہا۔ ”میں تو یہ سمجھی تھی کہ کوئی چور مکان میں گھس آیا ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ روشنی میں تمہارا چہرہ نظر آگیا اور میں نے تمہیں پہچان لیا۔ ورنہ میں تو چیخ پڑی ہوتی۔“

وہ دونوں کھنڈو کالج میں ایک ساتھ پڑھ چکے تھے مگر اس زمانے کی دہلی پتلی اور شرمیلی سی لڑکی آشا اب رانا کو بہت بدلی بدلی سی نظر آ رہی تھی۔ بھرا بھرا جسم خوبصورت صراحی دار گردن رس بھرے ہونٹ اور مستی بھری آنکھیں۔

”کیا سوچ رہے ہو تم؟“ آشا نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”گھر میں اس وقت میں تنہا ہوں پر شادی تو پچھلے پانچ دنوں سے کھنڈو گئے ہوئے ہیں اور تمہارے میزبان بچے صاحب بھی اوپر نہیں ہیں۔“ اتنا کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکی پھر آگے بولی۔ ”آجاؤ دو گھڑی بیٹھ کر باتیں کریں گے... اپنے کالج کی باتیں اپنے وطن کی باتیں۔“

آشا کی آواز میں اس قدر مٹھاس تھی کہ رانا کو بن پئے ہی نشہ آنے لگا تھا اور اس کے دل میں لالچ بھی زور کرنے لگی کہ نیپالی سفارت خانے کے کیشیر کے گھر میں ایک آدھ بوتل وہسکی کی تو ضرور ہی ہوگی اور وہسکی کے اس خیل نے اس کے بدن میں پھرتی سی پیدا کر دی۔ ”آرہا ہوں۔“ وہ بولا اور اندھیرے میں آگے بڑھ کر دروازہ تلاش کرنے لگا تو آشا نے ہنس کر کہا۔ ”تمہیں اس دوسرے دروازے سے اندر آنا پڑے گا۔ کیونکہ مکان تو یہ ایک ہی ہے لیکن دروازے دونوں پورشن کے الگ الگ ہیں۔“ آشا کے ہنسنے کی آواز سن کر رانا کی ہمت اور بڑھ گئی۔ وہ خوش ہو گیا کہ ایک تو جوان عورت کا ساتھ اور اس پر شراب کا نشہ؟ پورے پندرہ دنوں کی تھکان اتر جائے گی۔ دوسرے دروازے سے داخل ہو کر رانا چار زینے چڑھ کر اوپر آیا تو آشا

دروازہ کھول کر اس کے استقبال کے لیے کھڑی تھی ”کافی عرصے کے بعد تمہیں دیکھا ہے لیکن پھر بھی تمہیں پہچان گئی۔“ آنکھیں نہچاتی ہوئی آشا اسے کمرے کے اندر لے آئی اور پھر بولی۔ ”یقین کرو اس وقت مجھے ایسی خوشی ہو رہی ہے جیسے میرا اپنا کوئی آگیا ہو۔“

”واہ.... ویری گڈ....“ ڈراننگ روم کو دیکھتے ہی رانا بول پڑا۔ ”تم تو یہاں بہت ٹھٹ سے رہ رہی ہو۔ جب تمہاری شادی ہوئی تھی تو کسی نے بتایا تھا کہ تمہارا شوہر کسی بینک میں کلرک ہے۔“

”ہاں اس وقت وہ کلرک ہی تھا“ آشا ہنس کر بولی۔ ”لیکن مجھ سے شادی کے بعد وہ دھیرے دھیرے کیشیر کے عہدے پر پہنچ گیا۔“ تب تو اس خوشی میں تمہیں مجھے کوئی خاص چیز پلانی چاہیے۔ ”رانا اپنے مطلب پر آگیا۔

”ایسی چیز جو گلاس میں ہو تو ٹھنڈی لیکن پیٹ میں جائے تو گرم۔“ رانا ہنس کر بولا۔

”اوہ سمجھی... تم وہسکی کی بات کر رہے ہو؟“ آشا خوش ہو کر بول اٹھی۔ ”تب تو میں بھی تمہارا ساتھ دوں گی کیونکہ اکیلے پینے کا مزہ ہی نہیں آتا۔“ بولتے بولتے اس نے ایک ادا سے جسم کو جھٹکا دیا اور پھر بولی۔ ”تم یہاں بیٹھو میں پر شادی کی رکھی ہوئی بوتل ڈھونڈ کر لاتی ہوں۔“ وہ اندر والے کمرے کی طرف جانے کے لیے مڑی اور رانا اس کی تھرتی ہوئی کمر کو دیکھ کر ایک زور دار انگڑائی لے کر وہیں بیٹھ گیا۔

آشا نے الماری کھول کر بوتل نکالنے سے پہلے ایک ایک آٹو بینک کیمرہ نکالا اور اسے اپنے پٹنگ کے قریب چھپا کر رکھا دیا پھر وہسکی کی بوتل ہاتھ میں لے کر وہ نچلا ہونٹ دبا کر دھیرے سے بڑبڑائی۔ ”آخر ایک شکار پھنس ہی گیا۔“



چیانگ نے جس گلی کا پتا بتایا تھا.... وہاں آکر جیپ رک گئی وہ جلی کے اترنے کے بعد رگھوپتی بھی نیچے اتر آیا اور گولپنا تھ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا



اور جولی بھی ان کے نزدیک آگئے تو وہ شخص انہیں دیکھ کر گولی ناتھ سے بولا۔ ”کیا تم چاروں ہی ریگن ہاؤس میں جانا چاہتے ہو؟“

”ہاں بائی ہم چاروں ہی سکندر کا... ارے نہیں مقدر کا سکندر دیکھ کر آئے ہیں۔“ گولی ناتھ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔

”تو میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ میں راستہ دکھاتا ہوں۔“ ٹارچ والے شخص نے کہا اور مرکز ان کے آگے آگے چل پڑا اور اپنی ٹارچ روشن کر دی۔ ٹارچ کی روشنی کا دائرہ زمین پر پڑ رہا تھا اور وہ سب اس کے پیچھے چل پڑے۔ اس بدبو دار گلی میں چلتے ہوئے رگھوپتی سوچ رہا تھا کہ چیاٹک اس دوزخ میں کہاں آکر بیٹھ گیا؟ چند قدم چلنے کے بعد وہ سب بائیں جانب مڑ گئے پھر ایک موٹر گیراج کے سامنے رک کر اس آدی نے اس کے شرگیٹ پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ شرگیٹ بند تھا لیکن روشنی پڑتے ہی وہ تیزی سے اوپر اٹھتا چلا گیا اور تب رگھوپتی کو لگا کہ واقعی چیاٹک نے اس خفیہ کام کے لیے جگہ بھی خفیہ ہی ڈھونڈی ہے۔

جب وہ چاروں اندر داخل ہو گئے تو ان کے ساتھ آنے والے شخص نے جلدی سے کوئی بٹن دبا کر شرگیٹ دوبارہ بند کر دیا۔ شرگیٹ بند ہوتے ہی رگھوپتی کو اچانک لگا کہ وہ سب پھنس گئے ہیں۔ اس بات کا خیال آتے ہی اس کا ہاتھ چمڑے کی جیکٹ کے اندر رینگتا ہوا پتول پر جم گیا وجہ اور جولی چپ چاپ رگھوپتی کو دیکھ رہے تھے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ یہ تم ہمیں کہاں لے آئے ہو؟“

تنگ سے گیراج میں ایک زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا جس کی دھندلی روشنی میں رگھوپتی نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی لیکن اسے گتے کے چند کٹن اور ٹین کے چند کنستروں کے سوا وہاں اور کچھ دکھائی نہیں دیا۔

”میرے پیچھے پیچھے آجاؤ۔“ ٹارچ والا شخص بولا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ان کی گھبراہٹ محسوس کر چکا ہو اس نے ٹارچ کی روشنی سامنے کی دیوار پر پھینکی تو وہاں انہیں اس دیوار کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ٹارچ والے شخص نے ہاتھ بڑھا کر دیوار پر لگے ہوئے ایک بٹن کو دبایا اور اس کے ساتھ ہی پتھر کی دیوار کا ایک حصہ سرکنے لگا۔ وہ سب اس کے پیچھے اندر داخل ہوئے تو اندر اتنی تیز روشنی تھی کہ سب

”آس پاس سے گزرنے والوں پر ہمیں یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہم کوئی فلم دیکھ کر واپس آرہے ہیں تاکہ ہم لوگوں پر کسی کو کوئی شک نہ ہو۔“

”بالکل ٹھیک۔“ گولی ناتھ بولا۔

”ہاں تو پھر کیا نام بتایا تھا تم نے فلم؟“ رگھوپتی نے پوچھا۔

”مقدر کا سکندر۔“ گولی ناتھ بولا۔

”کمال کی فلم تھی۔“ رگھوپتی اونچی آواز میں بولا اور اس طرح جھومتا ہوا گلی میں داخل ہو گیا جیسے بہت زیادہ نشے میں ہے۔ اس نے گولی ناتھ کا بازو تھام رکھا تھا۔ خود گولی ناتھ کی چال میں بھی ہلکی سی لڑکھڑاہٹ آگئی تھی وجہ اور جولی ان دونوں کے پیچھے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اندھیری گلی میں داخل ہو گئے تھے۔

”جولی... یہ گلی ہے یا کمر؟“ وجہ نے جیب سے رومال نکال کر اپنے ناک پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”شراب کی بو سے مہک رہی ہے۔“

”اور وہ بھی دیسی شراب کی بو سے۔“ کہہ کر جولی نے دھیرے سے اس کے کندھے پر چٹکی بھری۔ ”کبھی چکھی ہوتی تو دیسی اور ولایتی کے فرق کا پتا چلتا؟“

”ارے ہم تو دیسی فلم کی بجائے دیسی شراب کی باتیں کرنے لگے۔“ وجہ نے جولی کو یاد دلایا اور ٹھیک اسی وقت رگھوپتی کی آواز سنائی دی جو گولی ناتھ سے اونچی آواز میں کہہ رہا تھا ”ارے یار کیا زبردست فلم تھی نام بھی بہت اچھا تھا فلم کا۔“

سکندر کا مقدر...“

”ارے سکندر کا مقدر نہیں....“ گولی ناتھ نے بھی اونچی آواز میں اس کی غلطی سدھاری ”بھائی.... مقدر کا سکندر...“

”ارے سب ایک ہی ہے۔“ رگھوپتی نے اپنے داہنی جانب گھومتے ہوئے کہا۔

”سکندر چاہے اپنی فوج کے آگے ہو یا پیچھے جیت تو اس کی ہی ہوتی ہے۔“ یکایک وہ بولتے بولتے رک گیا۔ کسی نے اس کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی پھینکی تھی لیکن رگھوپتی سے زیادہ گولی ناتھ چونک پڑا تھا۔ ”کون ہے؟“ وہ جلدی سے پوچھ بیٹھا۔

”بھائی ہم تو یہاں اجنبی ہیں۔“ رگھوپتی گولی ناتھ کے کندھے سے ہاتھ ہٹا کر بولا ”یہاں اس گلی میں کہیں کوئی ریگن ہاؤس ہے۔ ہمیں دیں...“ ٹھیک اسی وقت وجہ

چاروں نے اپنی اپنی گردن گھما کر دیوار کی طرف دیکھا۔ دیوار پر انہیں ایک چوکور سوراخ دکھائی دیا جہاں ہلکی سی روشنی نظر آرہی تھی۔ اب ان کی سمجھ میں آگیا کہ قلم پروجیکٹ کرنے کے لیے چیانگ اوپر کہیں بیٹھا ہوا ہے۔۔۔

اچانک اس سوراخ میں سے تیز روشنی نکلی اور پردے پر پھیل گئی۔ تھوڑی دیر تک اندھیرے اور اجالے میں کشمکش ہوتی رہی پھر سفید پردے پر قلم کا ایک منظر ابھر آیا اس منظر میں نظر آنے والا شخص دھندلا دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک آواز سنائی دی ”ذرا صبر کرنا میں فوکس درست کر رہا ہوں اصل میں یہ کام بہت خفیہ رکھنا ہے۔ اس لیے سب کچھ مجھے خود ہی کرنا پڑ رہا ہے۔“ تھوڑی دیر تک وہ چاروں اس دھندلی اور ساکت تصویر کو پردے پر دیکھتے رہے پھر اس میں ذرا حرکت ہوئی اور وہ دھندلی سی پرچھائیں آہستہ آہستہ صاف دکھائی دینے لگی۔ پھر وہ بے اور رگھوپتی ایک ساتھ بول اٹھے۔ ”روکھی۔“ پردے پر روکھی کا خوف زدہ چہرہ دکھائی دے رہا تھا وہ چیخ مار کر اپنے سامنے موجود کسی سے بچنے کی کوشش میں پیچھے سرک رہی تھی یہ قلم بے آواز تھی لیکن رگھوپتی اور وجے اس طرح بے چین ہو گئے جیسے انہوں نے بے بس روکھی کی دردناک چیخ سن لی ہو۔ دوسرے ہی لمحے روکھی کا چہرہ پردے پر سے غائب ہو گیا اور اس کی جگہ ایک دوسری لڑکی کا چہرہ دکھائی دیا وہ فرش پر پڑی تھی اس کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے اور وہ اپنی آنسو بھری آنکھوں کو اوپر اٹھائے اپنے سامنے کھڑے ہوئے کسی شخص سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر درد کے ایسے شدید آثار نمایاں نظر آرہے تھے کہ دیکھنے والے کا دل دہل جائے۔

”یہ تو ہماری ہے۔۔۔“ رگھوپتی کی دبی دبی سی چیخ ابھری۔۔۔ ”میرے محلے میں رہتی تھی۔“ اور چار پانچ سال قبل یہ اچانک غم ہو گئی تھی۔ آج تک اس کا کوئی پتا بھی نہیں چلا۔“ اب پردے پر ایک تیسری لڑکی نظر آرہی تھی۔ جو ایک پلنگ پر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے پڑی تھی۔ اس لیے رگھوپتی اور وجے اسے پہچان نہیں سکے لیکن چوتھی لڑکی کو وجے نے پہچان لیا اور رگھوپتی سے بولا۔ ”یہ تو وہی لڑکی ہے جو ڈیڑھ برس کے بعد پاگل ہو کر واپس آئی تھی۔“ پردے پر سے اس لڑکی کا خوف زدہ چہرہ دیکر گھٹا تھا جیسے وہ ابھی پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگے گی۔“

کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ تھوڑی دیر تک وہ سب اس بہت بڑے کمرے کے خالی پن کو تک رہے تھے۔ پھر رگھوپتی نے اس شخص سے پوچھا۔ ”کیا یہی ریگن ہاؤس ہے!“ لیکن اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے وہ شخص ہنس کر مڑا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر جاتے ہی گیراج کی آدھی دیوار پھر برابر ہو گئی۔ خفیہ اور خود کار دروازے پھر سے بند ہو چکے تھے۔

”یہ ہمیں بند کر کے کہاں چلا گیا؟“ رگھوپتی کی طرف دیکھ کر گوبی ناتھ نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ”یہاں تو کوئی نظر نہیں آرہا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ رگھوپتی دس تو بج گئے ہیں۔“ وجے کی آواز میں بھی گھبراہٹ شامل تھی۔ ”ہمیں تو یہاں سے باہر جانے کا راستہ بھی نہیں معلوم ہے۔“

لیکن رگھوپتی کے چہرے پر کسی پریشانی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ سامنے کی دیوار پر تے ہوئے ایک چوکور سفید پردے کو تاکتے ہوئے بولا۔ ”ہم بالکل ٹھیک جگہ پر ہی آئے ہیں یہ کسی بہت بڑے مکان کا تہ خانہ لگتا ہے۔ پیچھے گیراج ہے لیکن آگے کوئی بڑی عمارت ہو گی اور وہ چینی اگلے راستے ہی سے دیوار کا کوئی خفیہ دروازہ کھول کر اندر آئے گا۔“

”مگر میں تو تم لوگوں سے پہلے بھی یہاں آچکا ہوں۔“ یہ آواز سنتے ہی سوائے رگھوپتی کے وہ تینوں چونک پڑے۔ رگھوپتی چیانگ کی آواز پہچان چکا تھا لیکن وہ کہاں چھپا بیٹھا تھا یہ اسے نظر نہیں آرہا تھا۔ جب چیانگ اسے نظر نہیں آیا تو وہ بولا۔ ”مگر تم کہاں ہو ریگن؟ اپنا درشن تو کراؤ۔“

”جس چیز کے درشن کے لیے تم لوگ یہاں آئے ہو وہ میں ابھی سامنے والے پردے پر دکھاتا ہوں۔“ نظرنہ آنے والے چینی کی آواز پھر سنائی دی۔ ”اس لیے مجھے اپنا درشن کرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

اس کی بات سنتے ہی وہ چاروں آگے بڑھے اور پردے کے سامنے پڑی ہوئی چار کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی کمرے میں گھپ اندھیرا ہو گیا۔ ”وہ ہمیں دیکھ رہا ہے لیکن ہم اسے نہیں دیکھ سکتے۔“ رگھوپتی نے دھیمی آواز میں سرگوشی کی اور اس کے ساتھ ہی پچھلی دیوار کی جانب سے کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ ان

اور پانچویں لڑکی کو دیکھتے ہی رگھوپتی اور وجے کے ساتھ گولی ہاتھ بھی چیخ پڑا۔  
یہ تو... وہی کنواری دیوی... ندا ہے۔“

”گولی میں نے تم سے کہا تھا نا...“ رگھوپتی غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ”اس درندے نے ایک کنواری دیوی رہنے والی لڑکی کو بھی نہیں چھوڑا۔“  
دوسرے منظر میں ندا کی نگلی پیٹھ نظر آ رہی تھی اور اس کی گردن کے پچھلے حصے سے خون کی ایک لکیر سی بہہ رہی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے نوکیلے دانٹول سے اسے مٹھنھوڑا ہو یہ منظر دیکھ کر رگھوپتی اس قدر جذباتی ہو گیا کہ غصے میں اس نے اپنا پستول بھی کھینچ نکالا۔ لیکن تب ہی فلم کا منظر پردے پر سے غائب ہو گیا اور پورے کمرے میں تیز روشنی کا بلب جل اٹھا اس تیز روشنی میں وہ چاروں ایک دوسرے کا چہرہ نکتے لگے۔

”یہ تو تھا ٹریلر۔“ نظرنہ آنے والے چینی کی آواز نے ایک بار پھر ان چاروں کو چونکا دیا۔ ”اب بارہ منٹ گیا اور ان کی آنکھیں پردے پر مرکوز ہو گئیں۔“  
پردے پر ابھرنے والے منظر میں ایک بہت بڑی آکل ہینٹنگز دکھائی دے رہی تھی دیوار پر لگی ہوئی اس تصویر میں بہت ساری نوجوان لڑکیوں میں ایک مرد گھرا ہوا دکھائی دیا تھا جو نشے میں چور تھا اور اس کی آنکھوں میں ہوس کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔

”وجے... یہ تصویر تو میں نے کہیں دیکھی ہے۔“ یکایک اتنی دیر سے خاموشی بیٹھی ہوئی جولی نے وجے کا شانہ پکڑ کر دھیرے سے کہا۔ ”ارے ہاں... یاد آگیا وجے تم ”کوٹا کھانا“ کی رسم سے پہلے جس سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے تھے یہ تو اس کا کرا ہے تمہیں یاد ہے؟ تم ہی نے مجھے اندر لے جا کر دیوار پر لگی ہوئی یہ ہینٹنگز دکھائی تھیں؟“

اتنی دیر میں چار دیواری کا منظر پردے پر سے گزر گیا تھا۔  
”ہاں جولی... یہ تو وہی جگہ ہے۔... نیپال زریش کا شاہی مہمان محل...“ وجے نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ پردے پر کسی مرد کا دیوہیکل سایہ دکھائی دیا۔ اپنے قد اور جسم کے ساتھ دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہوئے اس شخص کا چہرہ ایک سیاہ نقاب میں

چھپا ہوا تھا۔ صرف آنکھوں کے آگے دو گول سوراخ بنے ہوئے تھے جس میں سے آنکھوں کی دو کالی پتلیاں گردش کرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے جب ہاتھ اٹھایا تو ہاتھ چلا کہ بائیں ہاتھ میں اس نے سفید دستانہ پہن رکھا تھا اور دائیں ہاتھ میں سیاہ دستانہ... اس سیاہ دستانے کے اوپر اس نے لوہے کی باریک زنجیر بھی لپیٹ رکھی تھی۔ آگے بڑھتا ہوا وہ دیواروں کے کونے تک پہنچ گیا جہاں روکھی سمٹی سمٹی ہوئی کھڑی تھی۔ خوف سے تھر تھرا کانپتی ہوئی روکھی کبھی دونوں ہاتھ جوڑ کر عاجزی کرتی اور کبھی دونوں ہاتھوں کو اپنے سینے پر رکھ کر خود کو بچانے کی کوشش میں کمرے کے کونے میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ شیر کے بچے جیسے سیاہ نوکیلے دستانے والے ہاتھ سے خود کو بچانے کی وہ پوری کوشش کر رہی تھی لیکن یکایک اس درندے کا فولادی پنجہ روکھی کے شانے پر پڑا اور پھر اسے بازو سے پکڑ کر اس شیطان نے پلنگ پر دھکیل دیا۔ روکھی دھم سے پلنگ پر گری لیکن اپنی عصمت بچانے کے لیے وہ پھرتی سے فرش پر گری اور سینے کے بل زمین پر کسی پتھر کی مورت کی طرح لیٹ گئی۔ اس کے چہرے پر ناامیدی اور بے بسی کے گہرے سائے پھیلے ہوئے تھے اور آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر بہہ رہا تھا۔

تب ہی اس کی پیٹھ پر اس درندے کا سیاہ اور بھاری بھر کم فولادی بچہ پھسلا اور روکھی کا جسم زخمی ہو گیا۔ روکھی کی اپنی پیٹھ پر جب اس فولادی پنجے کی نوکیلی انگلیاں دھنسیں تو اس کے منہ سے درد ناک چیخ نکلی اور وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن پھر اپنے بے پردہ جسم کا خیال آتے ہی وہ دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کی پیٹھ سے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ پھر وہ انسان نما درندہ آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ پر جھکا اس کا ایک ہاتھ دھیرے دھیرے اپنے چہرے پر پڑے ہوئے سیاہ نقاب پر گیا لیکن اس نے صرف اپنے ہونٹ ہی کا حصہ کھولا تھا۔ ہونٹوں پر سے نقاب کا کپڑا اٹھتے ہی ہونٹوں کے اندر سے اس کی زبان باہر نکلی اور وہ روکھی کی پیٹھ پر جھک کر اس کے بتے ہوئے لبو کو دھیرے دھیرے اپنی زبان سے چاٹنے لگا۔

”نہیں... شیطان... نہیں...“ رگھوپتی اس درندگی کو برداشت نہیں کر سکا۔ وہ غصے کی حالت میں پستول سے پردے پر ہی فائر کرنے والا تھا کہ اس وقت وجے نے

ہمت اور پوری طاقت سے اس شیطان کو پلنگ سے نیچے اچھال دیا تھا اور تب وہ درندہ پھرے ہوئے شیر کی طرح اٹھ کر اس پر جھپٹا تھا اور پھر اس کے فولادی پنجے نے مندا کے جسم کے ایک حصے کو لولہان کر دیا۔ مندا خون میں لت پٹ پڑی تھی اور اس نقاب پوش کی زبان کتے کی زبان کی طرح اس کے خون آلود جسم کو چاٹ رہی تھی۔

”میرے آخری منظر دیکھ کر جولی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں اور وجے رگھوپتی اور گوپی کی آنکھوں میں خون کے سرخ ڈورے تیرنے لگے۔ کمرے کی بتی روشن ہو چکی تھی لیکن وہ چاروں اس طرح چپ بیٹھے ہوئے تھے جیسے ان کی زبان تالو سے چپک گئی ہو۔“

”کھیل ختم ہو گیا۔“ اس بو جھل سنائے میں چیانگ کی پاٹ دار آواز گونجی تو وہ چاروں اپنے اپنے خیالوں سے چونک پڑے پھر یکایک رگھوپتی انتہائی جو شیلے لہجے میں چیانگ کو مخاطب کر کے بولا۔ ”نہیں ریگن نہیں کھیل تو ابھی ختم نہیں ہوا ہے کھیل تو اب شروع ہونے والا ہے۔“

”یہ تمہارا معاملہ ہے... تم جانو“ کمرے میں چیانگ کی آواز گونجی۔

”لیکن تم تو جانتے ہی ہو کہ یہ درندہ کون ہے؟“ رگھوپتی کے لفظ لفظ سے غصہ ٹپک رہا تھا۔ ”بس مجھے ایک بار وہ منظر دکھا دو جس میں اس کے چہرے پر نقاب نہ ہو... اس کے لیے جو تم مانگو گے وہ قیمت میں دوں گا۔“

”ناممکن...“ چیانگ کی گرج دار آواز کمرے میں پھیل گئی۔ ”یہ کبھی نہیں ہو سکتا اس کے لیے تم کروڑوں روپے بھی خرچ کرنا چاہو تو بھی یہ ممکن نہیں ہو سکتا۔“

چیانگ کی یہ فیصلہ کن بات سن کر رگھوپتی تملایا گیا۔ دانت پیس کر اس نے غصہ ضبط کرنے کے لیے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا تو اس کے ہونٹ پر خون جم گیا اور اس کے ہاتھ کی گرفت پستول پر سخت ہو گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتا چیانگ کی خوف ناک آواز سنائی دی ”میرے دوست۔ اس ہتھیار سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔“ چیانگ اتنا کہہ کر ہنس پڑا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خود نظروں سے اوجھل رہ کر ان کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہا ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک ہنستا رہا پھر آگے بولا۔ ”میں جانتا تھا کہ تم ایسی کوئی حرکت کر بیٹھو گے اور اسی لیے میں نے خود کو

جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑ لی اور بولا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو تم؟“

ٹھیک اسی وقت کمرہ پھر روشن ہو گیا رگھوپتی کے غصے میں سرخ چہرے پر پیرے کے قطرے چمک رہے تھے اور غصے میں اس کی پیشانی کی نسیں تک ابھر آئی تھیں۔ اس کی سانسیں اتنی تیز تیز چل رہی تھیں جیسے کوئی خوفناک زہریلا سانپ پھنکا رہا ہو۔

”مسٹر۔“ نظر نہ آنے والے پراسرار چینی کی آواز پھر کمرے میں گونج کر۔

”اگر فلم کا اتنا ہی حصہ دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہو تو میں اسے بند کر دوں... پستول کے فائر کی آواز باہر تو نہ سنی جاتی لیکن ساؤنڈ پروف دیوار سے ٹکرا کر گولی واپس آتی اور تم میں سے کسی کو زخمی کر سکتی تھی۔“

یہ س کر رگھوپتی نے جلدی سے اپنے چہرے کا پسینا پونچھا اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوا اونچی آواز میں بولا۔ ”آئی ایم سوری مسٹر ریگن میں تھوڑی دیر کے لیے خود پر قابو نہیں رکھ سکا۔ لیکن اب میں اتنا ضرور کموں گا کہ میں اس درندہ زندہ زمین میں دفن کر دوں گا۔“

”یہ تمہارا نجی معاملہ ہے۔“ پراسرار آواز گونجی اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں پھر اندھیرا چھا گیا۔ پردے پر فلم آگے چلنے لگی نقاب پوش درندے کے مضبوط بازوؤں میں دبلی ہوئی روکھی پلنگ پر تڑپتی ہوئی اور آخر میں بے ہوش اور بے حس حرکت پڑی ہوئی روکھی...

اس کے بعد ایک کے بعد ایک لڑکیاں بدلتی رہیں لیکن نقاب پوش اور قد آرد مرد وہی کا وہی رہا۔ کسی کی پیٹھ پر سے لہو بہتا تھا اور کسی کی ٹانگوں پر سے خون بہنے لگتا۔ لیکن ہر جگہ اس نقاب پوش درندے کی زبان گھومتی رہتی اس کے بائیں ہاتھ کا سفید دستہ اگر لڑکی کے گال سلالتا تھا تو دائیں ہاتھ کا کھدرا اور فولادی پنجہ اس کے جسم کو نوچنے لگتا... درد۔ کرب اور رحم کی بھیک مانگتی ہوئی لڑکی آخر میں تھک جا کر اس کے کنوارے پن کی چادر تار تار ہو جاتی لیکن اس نقاب پوش کا چہرہ کہیں نظر نہیں آتا۔ صرف سیاہ قاب پر دو سوراخ اور اس میں ناچتی ہوئی دو پتلیوں کے سوائے۔ مندا جس کی کبھی کنواری دیوی کی حیثیت سے پوجا کی جاتی تھی اس کا آخری منظر دوسری لڑکیوں سے ذرا مختلف تھا۔ اس درندے کی درندگی سے قبل اس نے ہاتھ

عمر.... دروازہ کھلتے ہی کمرے کی روشنی غائب ہو گئی اور وہ چاروں اندھیرے میں ہی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

”چلئے.... میں آپ لوگوں کو باہر تک چھوڑ آتا ہوں۔“ دروازہ کے باہر وہی شخص ہاتھ میں ٹارچ لیے کھڑا تھا جو انہیں یہاں لایا تھا اس نے ٹارچ جلا کر انہیں راستہ دکھایا اور وہ چاروں اس کے پیچھے گیراج کے شری دروازے سے باہر نکل آئے۔



ہوس کی آگ سرد پڑ چکی تھی۔ رانا آشا کے پاس سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”اپنے ساتھیوں کے واپس آنے سے پہلے مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے“ پلنگ کے کونے میں پڑی ہوئی اپنی شرٹ کو پہنتے ہوئے وہ بولا ”نہیں تو مجھے ان کے اٹلے سیدھے سوالوں کے جواب دینے پڑیں گے۔“

”لیکن تم نے کہا تھا کہ وہ لوگ فلم دیکھنے گئے ہیں؟“ آشا نے ناٹ گاؤن کے ٹن بند کر کے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ابھی تو ساڑھے دس ہی بجے ہیں۔“

”ان کا کیا بھروسہ؟“ رانا بولا ”اگر انہیں فلم پسند نہ آئی تو وہ انٹر ویل سے پہلے بھی اٹھ کر آسکتے ہیں“ اتنا کہہ کر وہ آشا کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگا اور پھر آگے بولا ”اب تو یہ جی چاہتا ہے کہ وہ لوگ روز اسی طرح فلم کا آخری شو دیکھنے چلے جایا کریں۔“

”ناکہ روزانہ میرے پہلو میں آکر بیٹھ جاؤ ہے نا؟“ کہہ کر آشا نے پھر اسے دبوچ لینے کی کوشش کی۔ لیکن رانا ذرا پیچھے ہٹ گیا اور ہاتھ اٹھا کر جلدی سے بولا ”ارے آشا اپنا پستول لینا تو بھول گیا۔“

”اسے میں نے سنبھال کر رکھ دیا ہے۔“ آشا نے اپنی انگلیوں سے اس کے بال بکھیر دیے اور بڑے ناز سے بولی ”عورت کا پہلو چھوٹا تو پستول کی یاد آگئی؟“

جواب دینے کی بجائے رانا اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارنے لگا اور آشا اسے دھیان سے دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے

احتیاط کے طور پر پوشیدہ رکھا ہوا ہے۔ لیکن جوش میں آکر اگر تم مجھ پر ہتھیار اٹھا بھی لیتے ہو تو تمہیں بھلا کیا ملے گا؟“

”مجھے اس درندے کا نام جانا ہے۔“ رگھوپتی غصے میں پیرٹ کر بولا۔ ”تم اس کی قیمت بتاؤ ریگن۔“

”نام جاننے کی قیمت؟“ چیانگ نے پوچھا اور چپ ہو گیا پھر چند لمحوں کی تاخیر کے بعد بولا۔ ”میں سوچ کر کل جواب دوں گا۔“

”کل کی پرسوں تو نہیں ہو گی نا؟“ رگھوپتی کے لہجے میں بے چینی کی جھلک تھی۔

”تم نہیں جانتے ریگن میرے لیے ایک ایک لمحہ بھی گزارنا مشکل ہو رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے کل کی بات پرسوں پر نہیں ٹلے گی۔“

چیانگ کی سپاٹ اور بھاری آواز سنائی دی۔ ”لیکن اس سے پہلے ایک اور سودا طے کرنا باقی ہے۔“

”کیسا سودا؟“

”اس فلم کے نیگیٹو خریدنے کا سودا۔“ چیانگ نے اور اونچی آواز میں کہا۔

”دس لاکھ کا سودا...“

”مگر نیگیٹو ہمیں کیا کرنا ہے؟“ گوپی ناتھ جلدی سے بول گیا لیکن رگھوپتی نے فوراً ہی اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ کر اسے آگے بولنے سے روک دیا اور خود ہی بولا

”ریگن سودا طے ہو جائے گا لیکن دس لاکھ کی رقم چکانے کے لیے ہمیں دس روز کی مہلت درکار ہو گی۔“

”اس کا جواب بھی کل دوں گا“ کہہ کر چیانگ نے گفتگو کے اس سلسلے کو بند کرنے کی غرض سے کہا ”بس اب کوئی سوال نہ پوچھنا میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اب تم لوگ جس راستے سے آئے تھے اس راستے سے باہر نکل جاؤ۔ گڈ ناٹ...“

اس کی آواز بند ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی دیوار کا خفیہ دروازہ کھل گیا

لوگوں سے تعلقات نہیں ہیں۔“ اتنا کہہ کر رانا نے آشا کی طرف دیکھا لیکن جب وہ کچھ نہیں بولی تو وہ پھر دھیرے سے بولا ”یا پھر تمہیں ہی یہ عادت پڑ گئی ہو اور کسی فائدے کی امید رکھے بغیر بھی....“ جواب دینے کی بجائے آشا نے ایک جھٹکے سے الماری کھولی۔ تو اچانک رانا کو اپنا پستول یاد آگیا اور وہ بولا ”پھر پستول کو بھول گیا۔ باتوں میں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ جلدی یہاں سے نکل جاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ لیکن جانے سے پہلے اسے ذرا دیکھتے جاؤ۔“ کہہ کر آشا نے اس کے ساتھ ایک رنگین تصویر رکھ دی اور کہا ”ہمارے آج کے ملق کی ایک یادگار تصویر....“

تصویر پر نظر پڑتے ہی رانا کی ٹانگیں کانپ گئیں۔ اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی چلی گئیں تصویر میں وہ آشا کی پہلو میں لیٹا ہوا تھا۔ ”ارے.... یہ تصویر تم نے کیسے کھینچ لی؟“

”میں نے نہیں کھینچی.... میں تو تمہارے ساتھ ہوں“ آشا بڑے شاطر انداز میں مسکرائی۔

”یہ کیرا آٹومیک ہے مسٹر سگرام رانا۔ تصویر خود بخود کھینچ گئی۔“ رانا کے چہرے کا رنگ بدل گیا وہ کبھی تصویر کو دیکھتا اور کبھی آشا کے چہرے کو تنکے لگتا۔

”اب میں سمجھا کہ تم درمیان میں بار بار سوچ آں کر کے روشنی کیوں کر دیا کرتی تھیں؟ تم نے مجھے بے وقوف بنایا ہے آشا.... جب میں نے بار بار روشنی کرنے کی وجہ پوچھی تھی تو تم نے کہا تھا کہ اپنے ساتھ لیٹے ہوئے مرد کا چہرہ دیکھ لینے سے انگلیں بیدار ہو جاتی ہیں۔“ بولتے بولتے رانا کا چہرہ تنگ ہو گیا۔ وہ غصے میں آکر تصویر کو پھاڑتا ہی چاہتا تھا کہ اچانک آشا نے اس پر اس کا پستول تان لیا اور مسکراتی ہوئی سفاک لہجے میں بولی ”میری نظروں کے سامنے ملن کی اس یادگار تصویر کو پھاڑنے کی اتنی جلدی کیا ہے مسٹر رانا؟ تم شاید یہ بھول گئے رانا سگرام کے ابھی پستول میرے ہاتھ میں ہے۔“

رانا اس کے کھیل کو نہیں سمجھا۔ اس نے آشا کے ہاتھ سے پستول چھین لینے

رانا سے پوچھا۔

”ارے ہاں..... رانا تم لوگوں کے آنے سے قبل وجے کا ایک دوست نیپال سے یہاں آیا تھا.... وہ کون ہے؟“

”تم شاید رگھوپتی کے بارے میں پوچھ رہی ہو“ رانا موزے پہنتا ہوا بولا ”نیپال رائل کاسینو میں کام کرتا تھا۔“

”اور وجے کے ساتھ جو گوری چڑی والی لڑکی گھومتی ہے وہ بھی رات گزارنے یہاں آنے لگی ہے“ کہہ کر آشا اس کے پاس آکر کھڑی ہوئی اور ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دونوں کا پڑنے والا عکس دیکھنے لگی۔ پھر تھوڑی تاخیر کے بعد بولی ”وہ دو دوستوں کے درمیان تھرا رہتی ہے۔ اس لیے کوئی گڑبڑ نہیں ہے نا؟“

ارے کوئی گڑبڑ نہیں ہے آشا“ رانا نے تنگ آئے ہوئے لہجے میں جواب دیا ”اصل میں جولی اور وجے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور رگھوپتی جولی کو بھابی کی طرح مانتا ہے۔“

”بھابی تو مجھے بھی بہت سے لوگ کہتے ہیں“ آشا نے کہا ”لیکن کبھی کبھی وہ بھی تمہاری طرح میرے پاس آجاتے ہیں۔“

یہ سنتے ہی رانا کی گردن ایک جھٹکے سے تن گئی ”اس کا مطلب ہے کہ تم اور بھی بہت سے لوگوں کے....“ بولتے بولتے رانا اس طرح رک گیا جیسے اسے آگے پوچھنے میں شرم آرہی ہو۔ ”میں تو یہ سمجھا تھا کہ تمہارا شوہر بہت دنوں سے باہر ہے اس لیے....“

”ہری پرشاد اگر میرے پاس بھی ہو تو بھی بہت دور جیسا ہے“ آشا کی آواز میں درد کے ساتھ ساتھ طنز بھی تھا ”مجھ سے شادی کرنے کے بعد اس کی جلدی جلدی ترقی ہونے لگی۔ اس لیے وہ مجھے خوش کرنے کے لیے سب سے کتنے لگا کہ مجھے پوری بہت اچھی ملی ہے۔ شی ازویری لکی گرل.... یہ سن کر مجھے ہنسی آجاتی تھی اور اس پر غصہ بھی آتا تھا۔“

”لیکن میری مہمان نوازی کرنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا آشا“ رانا ہنس کر بولا ”ہر پرشاد جی کو ترقی کے اوپری زینے تک چڑھانے کے لیے میرے بڑے

وجے کو دکھا دوں گی۔“

”لیکن آشا تم ذرا یہ تو سوچو میں یہاں بالکل اجنبی ہوں“ رانا ذرا گھبرائے

ہوئے لمبے میں بولا ”اور پچیس ہزار کی اتنی بڑی رقم مجھے یہاں کون دے گا؟“

”یہ بتانا میرا کام نہیں ہے“ آشانے کہا ”لیکن تم چونکہ میرے کالج کے ساتھی

ہو اس لیے ہمدردی کی خاطر بتا رہی ہوں کہ جس کے گھر مہمان ہو اس وجے کے لیے

یہ پچیس ہزار کی رقم کوئی بہت بڑی نہیں ہے۔“

”لیکن اتنی بڑی رقم وہ مجھے کیوں دے گا؟“ رانا نے کہا۔

”دیکھو رانا۔ اس سے پہلے کہ تمہارے ساتھی آجائیں تمہیں اوپر جانے کی

جلدی بھی ہے۔ اور مجھے بھی یہ سودا طے کر لینے کی جلدی ہے“ کہہ کر وہ ذرا دیر کے

لیے رکی ”دو روز قبل وجے نے بینک میں سے دو لاکھ روپے نکلوائے تھے۔ اگر مانگنے

پر تمہیں پچیس ہزار کی رقم نہ ملے تو اوپر جا کر جہاں وہ رقم رکھی ہو۔ اس میں سے

پچیس ہزار نکال لو۔“

”اس کا مطلب ہے کہ میں چوری کروں؟“ رانا غرا کر بولا۔

”تھوڑی دیر قبل جو حرکت تم نے میرے ساتھ کی ہے کیا وہ نیک کام تھا؟“

آشادانت پیس کر بولی ”یہ تو ڈاکا تھا۔ ڈاکا۔“

رانا ہار گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ آشا جیسی چالاک اور مکار عورت کو سمجھانا

اس کے لیے ناممکن ہے۔ لیکن آشا وجے کی دولت پاپ کی دولت ہے۔“

لیکن آشا اس کی یہ بات سن کر کھل کھلا کر ہنس پڑی پھر بولی ”ارے سنگرام

رانا میں بھی تو تم سے تمہارے پاپ کی ہی قیمت مانگ رہی ہوں۔“

اس جواب کے بعد رانا کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا پھر بھی وہ

ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنا آخری پانسہ بھی پھینک دینے کی لالچ کو نہ روک سکا

اور دھیمی آواز میں بولا ”اور فرض کر لو کہ میں خود ہی یہ تصویر تمہارے شوہر ہری

پر شادی کو دکھا دوں تو؟“

”تو۔۔۔“ آشا بے تحاشا ہنس پڑی ”ارے وہ تو ایسی کئی تصویریں کئی مردوں کے

ساتھ دیکھ چکا ہے۔ اس نے تو میری ان تصویروں کا ایک خوبصورت البم بنا رکھا ہے

کے لیے اس پر جھپٹا مارا تھا۔ لیکن آشا اس سے بھی زیادہ چالاک اور پھرتیلی نکلی۔

اس نے پیچھے ہٹ کر اسے پستول تک پہنچنے ہی نہیں دیا۔

”تم خود ہتھیار رکھتے ہو۔ لیکن اتنا بھی نہیں جانتے کہ اس کی چھینا جھپٹی۔ کتنی

خطرناک ثابت ہو سکتی ہے؟“ بولتے بولتے وہ اچانک ہنس پڑی اور بولی ”اس چھینا جھپٹی

میں اگر گولی چل گئی اور اس کی آواز سن کر کوئی اندر آگیا تو اس اجنبی دیش میں تم

پھنس جاؤ گے۔“

یہ سن کر رانا اوپر سے نیچے تک تھر تھرا گیا۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ پوری

طرح سے پھنس چکا ہے۔ نہ جانے اس عورت نے ایسی کتنی تصویریں کھینچ ڈالی ہوں

گی؟ بینک کی رقم کے ڈاکے میں تو وہ مجرم تھا ہی اور قانون کی نظر سے چھپنے کے باوجود

آج ایک حماقت کر بیٹھا تھا۔

”تم کیا چاہتی ہو آشا؟“ آخر وہ تھوک نکل کر بولا ”کیا ارادہ ہے تمہارا؟“

”ارادہ تو بہت سادہ اور بہت ہی سیدھا ہے“ آشا ایک ایک لفظ پر زور دے کر

بولی ”اصل میں پچھلے پانچ روز سے میں مسلسل جوئے میں ہار رہی ہوں۔ جس کے نتیجے

میں پر شادی کے پچیس ہزار روپے میں اب تک گنوا چکی ہوں اس لیے میں چاہتی

ہوں کہ ان کے آنے سے قبل وہ روپے ان کی جگہ پر رکھ دوں“

”پچیس ہزار؟“ رانا کے سر پر جیسے ہتھوڑا لگا ہو جوئے میں ہاری تم ہو اور

جرمانہ میں ادا کروں؟“

”تو کیا تم نے مجھے پانچ دس یا پچیس پچاس جتنی سستی عورت سمجھ رکھا تھا؟“

رانا کا جی چاہا کہ وہ جھپٹ کر اس کا گلا دبا دے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ جس

کے انگ انگ کو چوم رہا تھا وہی خوبصورت عورت اسے اس وقت ایک زہریلی ناگن

جیسی لگ رہی تھی۔ وہ چند لمحوں تک تو اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

”اور فرض کرو کہ میں یہ رقم تمہیں دینے سے انکار کر دوں تو؟“

”تو۔۔۔“ آشا بڑے بھیانک انداز میں ہنسی ہوئی اس کی طرف دیکھتی رہی پھر

بولی ”رقم اگر نہیں ملی تو یہ پستول میرے پاس رہے گا اور جو تصویر تمہارے ہاتھ میں

ہے ایسی دو تصویریں میرے پاس اور بھی ہیں وہ میں تمہارے دوست رکھتی اور مسٹر

رہا تھا وہ تو کوئی سخت سی چیز تھی گدے کے نیچے ایسی کیا چیز ہوگی؟ اس نے فوراً ہی سردا اٹھا کر دیکھا تو ایک پلاسٹک کا چھوٹا آفس بیگ اس کے ہاتھ میں آگیا اس نے فوراً ہی ہٹن دبا کر اسے کھولا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

سو سو کے نوٹ کی کئی گڈیاں اس بیگ میں پڑی تھیں۔ اس نے دس دس ہزار کی دس گڈیوں کو گن لیا اور پھر دھیرے سے بڑبڑایا ”یہ تو پورے لاکھ روپے ہیں اس میں سے اگر پچیس ہزار کم ہو گئے تو فوراً ہی پتا نہیں چلے گا۔“

اس خیال کے آتے ہی اس نے جلدی سے تین گڈیاں اٹھائیں اور اپنی جیب میں سرکا دیں۔ پچیس ہزار کے بدلے اس نے تیس ہزار روپے اڑا لیے تھے۔ لیکن پانچ ہزار واپس رکھ دینے کی نیت اس کے دل میں ضرور تھی۔

پھر اس نے روپے کی بیگ کو اسی طرح بستر کے نیچے رکھ دیا اور اپنا پسینا پونچھ کر جلدی سے نیچے پہنچ جانے کے لیے دوڑ پڑا۔ لیکن ابھی اس نے پہلے زینے پر ہی قدم رکھا تھا کہ کمپاؤنڈ سے سیڑھی کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر چونک پڑا۔ پھر یکایک اپنے سر پر ہاتھ مار کر اسے واپس لوٹ جانا پڑا..... آنے والے چار آدمی رگھوپتی، گوبی ناتھ، جولی اور وجے ہی تھے۔



”تم جواب کیوں نہیں دیتے رانا“ گوبی ناتھ نے اپنا سوال پھر دہرایا تو رانا نے دروازے کی طرف مڑی ہوئی گردن کو سیدھی کر کے اس کی طرف دیکھا لیکن اس کے من پڑے ہوئے دماغ میں کوئی جواب ہی نہیں آیا۔ بیس منٹ پہلے گوبی ناتھ وغیرہ فلم دیکھ کر جب واپس آئے تھے وہ وجے کے ایک لاکھ روپے میں سے تیس ہزار روپے چرا کر آٹھا کو پچیس ہزار دینے کے لیے نیچے جا رہا تھا لیکن اسے اوپر ہی رک جانا پڑا۔ چوری پکڑی جانے کے خوف سے اس وقت اس کا دل بھی دھڑکنے لگا تھا۔ آگے بڑھنے کا راستہ تو بند ہو چکا تھا۔ اس طرح واپس آکر اس دس دس ہزار کی تین گڈیوں کو بھی اسی جگہ واپس رکھ دینے کا وقت نہیں تھا۔ پریشانی کی حالت میں اسے یہ ضرور محسوس ہو گیا تھا کہ تیس ہزار روپے کی موٹی گڈیاں اس کی پتلون یا قمیص کی جیب میں

ایسی ہر تصویر کے لیے بہت قیمتی ہوتی ہے اور سنگرام تمھاری معلومات کے لیے میں تمھیں یہ بھی بتاتی چلوں کہ میں جس آٹو بینک پولو رائیڈ کیرے سے ایسی تصویریں اتارتی ہوں وہ کیرا بھی خود مجھے پر شادی نے ہی لا کر دیا ہے“

رانا کا چہرہ اس طرح لنگ گیا جیسے کوئی جواہری اپنی تمام پونجی ہار چکا ہو۔ اگر اسے اس وقت گوبی ناتھ وغیرہ کے واپس آجانے کا خوف نہ ہوتا تو وہ رات بھر آٹھا کو باتوں میں لگا کر اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیتا۔ لیکن حالات اسے چھکے مار کر باہر نکالنے پر تلے ہوئے تھے۔ بو جھل قدموں سے ذرا آگے بڑھ کر وہ بہ مشکل اتنا ہی کہہ سکا ”میں کوشش کرتا ہوں۔ اگر رقم ہاتھ لگی تو ابھی واپس آکر تمھیں دے جاتا ہوں۔ لیکن تب مجھے اپنا پستول واپس چاہیے۔“

”یہ قمیص ضرور واپس دوں گی سنگرام“ کہہ کر آٹھا دھیرے سے ہنسی ”محنت کرو گے تو ضرور رقم تمھارے ہاتھ لگ جائے گی۔ دو لاکھ جیسی بڑی رقم وجے جیسا کجس آدمی صرف دو روز میں خرچ نہیں کر سکتا۔ میں یہ مان ہی نہیں سکتی۔“

رانا نے اس کے آخری الفاظ سنے اور تیزی سے کمرے کے باہر نکل گیا چلتے چلتے وہ خود کو گالیاں دے کر بڑبڑا رہا تھا ”بے وقوف رانا یہ تو نے کیا کیا؟“

جب وہ اوپر پہنچا اور اس نے شہرا کو گہری نیند میں خراٹے لیتے ہوئے دیکھا تو اپنی پہلی بھول پر پردہ ڈالنے کے لیے دوسری بھول کرنے کے لیے بے چین ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے اس نے دو لاکھ روپے کی تلاش شروع کر دی جو آٹھا کے کہنے کے مطابق وجے نے دو روز قبل ہی بینک سے نکلوائے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ایک ناکام کوشش کر رہا ہے۔ کیونکہ اگر وجے کے پاس اتنی بڑی رقم ہو بھی تو بھی وہ اسے ایسی جگہ رکھنے کی حماقت تو نہیں کرے گا کہ وہ رقم آسانی سے کسی کے ہاتھ لگ جائے۔

اس نے کپڑوں کی الماری چھان ماری پھر رگھوپتی اور وجے کے سوٹ کیسوں کی تلاشی بھی لے لی۔ ہر کمرے کی وہ ساری جگہ بھی دیکھ ڈالیں جہاں رقم چھپانے کی امید بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن کہیں بھی رقم کا پتا نہیں لگا۔ آخر تھک ہار کر وہ وجے کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ لیکن بیٹھتے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا وہ جسے تکیہ سمجھ کر بیٹھنے جا



”ابھی تک اس کے دماغ سے ڈراؤنے خواب کا اثر نہیں گیا ہے“ تھک کر رگھوپتی نے کہا اور اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھ گیا اور تب رانا اندر ہی اندر کانپ کر رہ گیا تھا۔ اپنی بے وقوفی پر اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا اور دل ہی دل میں خود کو کوستے ہوئے بولا ”آخر مجھے بار بار اس طرف دیکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ ابھی رگھوپتی اخباروں کی تسمی میں چھپی ہوئی رقم نکال لائے گا۔“

لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ رگھوپتی نے دھیرے سے دروازہ کھول کر جھانکا اور پھر کہا تھا ”اٹھو رانا چلو میرے ساتھ نیچے۔“

کسی کو بھی رگھوپتی کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن رانا کے دل کا چور کانپ اٹھا اور اس کے ہونٹ پھر پھڑپھڑائے ”نیچے؟ کس لیے؟“

”یہ تسلی کرنے کے لیے آس پاس کوئی پولیس والا موجود نہیں ہے اور ہمارے درمیان تم بالکل خیریت سے ہو“ رگھوپتی نے جواب دیا اور دروازہ بند کر کے پھر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا پھر بولا ”سنو رانا ہم لوگ جو کچھ دیکھ آئے ہیں وہ اگر تم نے بھی دیکھا ہوتا تو اس وقت یوں چپ نہ بیٹھتے ہوتے۔ ہمارا خون کھول رہا ہے اور تم ہو کہ برف کی طرح ٹھنڈے بیٹھے ہو“

”تو پھر مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے؟“ اس گفتگو میں شامل ہونے کے لیے رانا کو جواب مل گیا۔ ”نقاب پہن کر کنواری لڑکیوں کی عصمت دری کرنے والا کون ہے یہ جانے بغیر بحث کرنے سے کیا حاصل ہو گا؟“

”ان لوگوں کو راستے میں بھی یہی سمجھاتا رہا ہوں۔“ گوپی ناتھ نے کہا۔ ”کہ پہلے دشمن کو پہچان لو پھر ہم اس کے بارے میں سوچیں گے۔“

”وہ تو کل جب میں ایک لاکھ روپے اس چینی کو دوں گا تو وہ اس کا نام بھی بتا دے گا“ رگھوپتی ذرا پر جوش لہجے میں بولا۔ ”اتنی رقم کا بندوبست تو ہمارے پاس ہے کیوں دے؟“

”ہاں بالکل۔“ کہہ کر وجہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ ”اگر کہو تو لاکھ روپے میں تمہیں اسی وقت دے دوں۔“

وجہ کو اپنی جگہ سے اٹھتے دیکھ کر رانا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اسے لگا

ٹھیک طور پر سامنا نہیں سکتیں۔ اس لیے جہاں موقع مل جائے وہیں چھپا دینے میں ہمتی ہے۔ اور تب ہی اس کی نظر دروازے کے قریب پڑے ہوئے پرانے اخباروں کی تسمی پر پڑی ٹھیک اسی وقت دروازے کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ اس لیے کوئی اور محفوظ جگہ ڈھونڈنے کا موقع ہی نہیں تھا۔ اس لیے اس نے نوٹوں کی گڈبوں کے ساتھ آٹا کے ساتھ کھنچی ہوئی اپنی تصویر کو بھی ان ردی اخباروں کی تسمی کے اندر چھپا دیا تھا۔

”ارے رانا.... تم پسینے پسینے کیوں ہو رہے ہو؟ اندر داخل ہوتے ہی گوپی ناتھ نے اس سے پوچھا ”کیوں کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں دیکھ لیا؟“

”ہاں گوپی“ چہرے پر بتے ہوئے پسینے کو اپنی آستین سے پونچھتے ہوئے اسے بہانہ سوجھ گیا ”میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ ہم لوگ بری طرح چھن گئے ہیں جب دروازے کی گھنٹی بجی تو مجھے لگا کہ پولیس نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔“

”تمہیں پینے سے منع کرنے میں بھی مصیبت ہے“ گوپی ناتھ اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا ”بن پئے سونے سے تمہیں ایسے ہی خراب خواب آتے ہیں۔“

گوپی ناتھ کی ان مذاق بھری باتوں کو سن کر اس نے سکون کا سانس لیا کہ آنے والی آفت فی الحال ٹل گئی ہے۔ اس لیے وہ سونے کے لیے مڑا ہی تھا کہ اس نے دیکھا کہ رگھوپتی نے تو سوئے ہوئے شہرا کو بھی جگا دیا تھا۔ رگھوپتی شہرا سے کہہ رہا تھا ”اٹھو اور میری بات سنو... اس وقت ہم لوگ جو کچھ دیکھ کر آئے ہیں اس پر بحث کر کے ہمیں فوراً“ ہی کوئی فیصلہ کرنا ہے۔“

آخر یہ لوگ ایسا کیا دیکھ کر آئے ہیں؟ یہ جاننے کے جتس میں شہرا کی آنکھ فوراً ہی کھل گئی تھی لیکن رانا کے بے چین دماغ میں تو اس وقت کوئی بات سما ہی نہیں رہی تھی کہ اسے گرم سم دیکھ کر رگھوپتی نے پوچھا ”تم کیوں چپ ہو گئے تمہیں کچھ بھی نہیں کہنا ہے؟“

رگھوپتی کو رانا سے زیادہ امید تھی اس لیے کہ وہ اسے گوپی ناتھ اور شہرا سے زیادہ پہلے سے جانتا تھا۔ اس لیے اس نے بڑی امید سے اس سے پوچھا تھا لیکن رانا کی گردن بار بار دروازے کی طرف گھوم جاتی تھی یہ دیکھ کر رگھوپتی کے دل میں کچھ اور ہی شک پیدا ہو گیا تھا۔

تھا کہ ریوالور کے ٹریگر پر دبی ہوئی اس کی انگلی کسی وقت بھی حرکت کر بیٹھے گی لیکن تب ہی جولی کی آواز نے اسے چونکا دیا ”ایک سیکنڈ گولی... اس درندے کا نام میں تم لوگوں کو بتاتی ہوں۔“

”تم؟“ وجہ سمیت سب ہی چونک پڑے لیکن گولی ناٹھ نے ریوالور پر اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ جولی پورے آدمے گھٹنے سے دل میں ہلچل مچاتے ہوئے اس نام کو اپنے ہونٹوں پر لانے کی ہمت اکٹھا کر رہی تھی۔ اس نے باری باری ہر ایک کی طرف دیکھا اور پھر آگے بولی۔ ”آپ لوگوں کا اور ہمارا دشمن ایک ہی ہے گولی ناٹھ... اس لیے آپ اپنا پستول وہیں رکھ دیں جہاں وہ پہلے تھا کیونکہ شاید اس کا نام سننے ہی آپ کو زبردست جھکنا لگے اور ریوالور کا ٹریگر دب جائے۔“

”جولی تم کوئی چال تو نہیں چل رہی ہو؟“ اپنے اس شک کا اظہار کرنے کے باوجود گولی ناٹھ نے رگھوپتی کے سامنے سے ریوالور ہٹا لیا اور پھر جولی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”اگر تم اس کا نام جانتی تھیں تو اب تک چپ رہنے کی کیا وجہ تھی؟“

”وجہ؟“ جولی دھماکہ کرنے والی گھڑی ذرا اور لمبی کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے یہ ڈر تھا کہ اس کا نام سن کر تم لوگ ہنسی میں نہ اڑا دو۔“

”پھر بھی تم اس طرح بول رہی ہو جیسے تمہیں پورا یقین ہو۔“ گولی ناٹھ نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میرا ریوالور ہوا کر تم بات بدلنے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”گولی ناٹھ غصہ آدمی کی عقل اور اس کی سمجھ بوجھ پر پردہ ڈال دیتا ہے۔“ جولی نے اس درندے کا نام بتانے کے بجائے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”میں نے تو ابھی ابھی بتایا ہے کہ آپ لوگوں کا ہمارا دشمن ایک ہی ہے۔ لیکن پھر بھی آپ نہیں سمجھ سکے۔“

”تمہارا مطلب نیپال کے راجا سے ہے؟“ رگھوپتی نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں۔“ جولی نے کہا ”نیپال کا ہونے والا راجا۔“

”کیا؟“ بیک وقت سب کے منہ سے نکلا۔ ”یوراج چندر بھوشن۔“

سب جولی کی طرف دیکھ رہے تھے مگر اس کے چہرے سے یہ نہیں لگتا تھا کہ وہ فراق کے موڈ میں ہو۔ ابھی ایک سیکنڈ قبل جو نام انہوں نے سنا تھا وہ ان کے دلوں میں ایک عجیب سی الجھن پیدا کیے ہوئے تھا۔ قلم کے پردے پر چپانگ نے انہیں جس

کہ بس اب اس کی چوری پکڑی جائے گی اور وہ اپنے ساتھیوں کا دشمن بن جائے گا۔ ”نہیں وجہ روپے جہاں پڑے ہیں وہیں رہنے دو۔“ گولی ناٹھ نے وجہ کو روکتے ہوئے کہا۔ ”یہ لاکھ روپے دے کر رگھوپتی اس کا نام معلوم کر لے گا یہ بعد کی بات ہے اس لیے بعد میں ہوگی۔“

وجہ پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا تو رانا کی جان میں جان آگئی۔ لیکن رگھوپتی اس موضوع سے ہٹنے کی لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے وجہ کے بیٹھنے ہی وہ گولی ناٹھ کی طرف دیکھ کر دانت پیستے ہوئے بولا ”اگر یہ بات بعد میں ہوگی گولی تو تمہارے ستاون لاکھ روپے کی بات بھی بعد میں ہوگی۔ جب تک میں اس درندے کو ڈھونڈ کر اس کا خاتمہ نہیں کر دیتا۔ اس وقت تک راجا شاہی حکومت کے خلاف تمہیں بھی اپنی بغاوت کو ملتوی کرنا پڑے گا۔“

”رگھوپتی۔“ گولی ناٹھ ناک پھلا کر غصے میں بولا۔ ”یعنی اب تم سووے بازی پر اتر آئے؟ ٹھیک ہے تم اپنا کام کرو اور ہمیں صرف وہ جگہ بتا دو جہاں روپے چھپائے گئے ہیں پھر ہمیں ہمارا کام کرنے دو۔“

”نہیں رگھوپتی مستحکم لہجے میں بولا۔ ”پہلے میرا کام ہو گا۔ پھر تمہارے ستاون لاکھ روپے۔“

”اگر ایسی بات ہے تو کیوں نہ ہم ابھی اس بات کا فیصلہ کر لیں۔“ کتنے کتنے گولی ناٹھ نے اپنے چہرے کی جیکٹ میں ہاتھ ڈال کر اپنا ریوالور نکال لیا۔ اور اسے رگھوپتی پر تان کر بولا۔ ”ہم تو جان کی بازی کھیلنے ہی نکلے ہیں۔“

اس کا ریوالور دیکھ کر ہر کوئی چونک پڑا تھا لیکن رگھوپتی کے چہرے پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ بڑے سکون سے کہہ رہا تھا ”گولی چلاؤ گولی ہم تینوں کے لیے ایک ایک گولی کافی ہوگی۔ لیکن ہماری جان لینے کے بعد بقیہ تین گولیاں تم تینوں کے کام آنے کی نیت آجائے گی... چلو اب کھیل لو جان کی بازی... کرو نا فارغ۔“ گولی کو رگھوپتی کی یہ بات بہت کڑوی لگی تھی اسے اپنے منہ کا ذائقہ بہت بدلا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے جڑے تنگ ہوتے جا رہے تھے۔ پھر یکایک اس کے ماتھے کی رگیں ابھر آئیں آنکھیں غصے سے پہلے سے زیادہ سرخ ہو گئیں۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر لگ ر

مگر جولی خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر تو بہت سے لوگوں کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔۔۔“ رگھوپتی نے کہا۔ ”یہ تو کوئی ایسی بات نہیں ہے خیر اب تم دوسری بات بتاؤ۔“

”دوسری بات... اس کے بائیں کندھے کی ابھری ہوئی ہڈی۔“ جولی نے اس طرح کہا جیسے اس نے ہم کا کوئی زبردست دھماکہ کیا ہو۔ لیکن اس دھماکے کا جب کسی پر کوئی اثر ہوتا دکھائی نہیں دیا تو خود ہی آگے بولی۔ ”کیا تم تینوں میں سے کسی کی بھی نظر اس کے بائیں کندھے پر نہیں پڑی؟ حالانکہ پردے پر اس کی پیٹھ کافی دیر تک دیکھنے میں آئی تھی۔ اس کی ایک ایک حرکت کے وقت میں گھور گھور کر اس کی اس غامی کو دیکھتی رہی تھی لیکن آپ...“

”ایک منٹ جولی۔“ رگھوپتی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکتے ہوئے کہا۔ ”میں مانتا ہوں کہ ہمارا دھیان اس بات پر نہیں گیا تھا۔ لیکن تمہاری یہ بات بالکل درست ہے کہ یوراج چندر بھوشن کے بائیں کندھے کی ہڈی ذرا ابھری ہوئی ہے۔“ لیکن تمہیں کیسے معلوم؟“ وجہ کے لیے اس کا تصور کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس لیے وہ بے چینی سے بول پڑا۔ ”ہو سکتا ہے یہ محض اتفاق ہو اور وہ نقاب پوش کوئی دوسرا آدمی ہو۔ صرف تھوڑی سی مماثلت پر کسی کو قصور وار سمجھ لینے سے ہم غلط راستے پر چل پڑیں گے۔“

”مگر تم یہی سب سوچنے لگو گے وجہ تو تمہارے ہاتھ کبھی تمہاری ہنسنے کی عزت لوٹنے والے کی گردن تک نہیں پہنچ سکتے۔“ رگھوپتی نے جوش میں آکر کہا۔ ”میں تمہیں بتاتا ہوں مجھے یوراج کے بائیں کندھے کے نقص کے بارے میں ایک شخص نے بہت پہلے بتایا تھا اور وہ شخص کلکتے کا ایک مسلمان درزی... سلطان احمد...“ درزی کا نام سن کر وجہ نے بڑی حیرت سے رگھوپتی کی طرف دیکھا لیکن رگھوپتی اس کی طرف دھیان دیے بغیر بولا۔ ”سلطان احمد سال میں دو تین بار صرف یوراج کے کپڑوں کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز کلکتہ سے کھنڈو آتا ہے۔ آنے جانے کے ٹکٹ کے علاوہ یوراج کی طرف سے اسے سوئی ہوئی میں ٹھہرایا جاتا ہے اور رات کو کاسینو میں جوا کھیلنے کے لیے اسے مفت کوپن بھی ملتے ہیں۔ ایک بار میں نے

نقاب پوش آدمی کو لڑکیوں کی عزت لوٹتے دکھایا تھا وہ نیپال کا سب سے معتبر شخص یوراج چندر بھوشن بھی ہو سکتا ہے یہ بات ماننے کے لیے وہ تیار ہی نظر نہیں آ رہے تھے۔

”جولی... یہ تم کس کی طرف انگلی اٹھا رہی ہو۔ اس کا تمہیں کچھ خیال بھی ہے؟“ وجہ دل میں اٹھی ہوئی ہلچل کو دبا کر بولا۔ ”جس شخص کو نیپال کی رعایا اپنا راجا بنا کر دیوتا کی طرح پوجنے والی ہے جس کے اندر نیکیاں ہی نیکیاں بھری ہوئی ہیں اور جس کے پاس بے پناہ دولت جائیداد شہرت اور طاقت موجود ہے اس کو اس قدر پستی میں جانے کی کیا ضرورت ہے جولی؟“

میں جانتی تھی وجہ کہ تمہیں ہی سب سے زیادہ صدمہ ہو گا۔“ جولی نے ایک گرا سانس لے کر کہا۔ ”مگر یہ کس نے کہا ہے کہ ہم جسے دیوتا بنا کر پوجتے ہیں وہ شیطان نہیں بن سکتا؟ جس کے پاس بے پناہ دولت اور طاقت ہو اس کے لیے تو ہر کام کرنا آسان ہوتا ہے۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے جولی۔“ گوپی ناتھ جلدی سے بولا۔ ”راجاؤں کو چھوٹا سمجھ لینے والے ہی دھوکا کھاتے ہیں۔“

”لیکن جولی... ہم سب نیپالی ہونے کے باوجود نقاب میں چھپے ہوئے اس شخص کو پہچان نہیں سکے اور تم...؟“ رگھوپتی نے انک انک کر پوچھ ہی لیا۔

”میں اسے کیسے پہچان گئی اس پر حیرت ہو رہی ہے نا؟“ جولی اس طرح بولی جیسے وہ اس سوال کے لیے تیار ہی بیٹھی ہو ”میں نے تو آپ لوگوں کے یوراج کو صرف ایک بار ہی دیکھا تھا... اس وقت جب ”کوٹا کھانا“ کی رسم ادا ہونے سے پہلے مجھے وجہ سے ملاقات کی اجازت لینے کے لیے یوراج کے سامنے حاضر ہونا پڑا تھا۔ اس تھوڑی دیر کی ملاقات میں اس کی دو خاص باتیں میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھیں۔ سب ایک ٹک جولی کو دیکھ رہے تھے اور اس کی بات سن کر حیران ہو رہے تھے۔ اس لیے کسی نے بھی اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ جولی چند لمحوں کی خاموشی کے بعد آگے بولی۔ ”ایک تو یہ کہ نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک دوڑ جاتی ہے...“

سب کا ہی دشمن ہے؟“ رگھوپتی نے گولپی ناتھ سے معاملہ پکا کرنے کی غرض سے کہا۔  
 ”اس پاپی کو اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے اگر ہم پانچوں کو اپنی جان سے بھی  
 ہاتھ دھونا پڑے تو بھی ہم تیار ہیں۔“

”پانچ نہیں چھ کو رگھوپتی۔“ جولی نے اپنے سینے پر انگلی رکھ کر اسے یاد دلاتے  
 ہوئے کہا ”میں نے تمہیں دشمن کا نام بتایا اور تم نے مجھے ہی بھلا دیا؟“

اس کی بات سن کر وہ پانچوں چونک پڑے وہ حیران ہو رہے تھے کہ ایک غیر ملکی  
 لڑکی ان کے ساتھ ایک انتہائی خطرناک کھیل میں شریک ہونے کے لیے کیسے تیار ہو  
 گئی؟“

”اگر مجھے لڑکی سمجھ کر تم لوگ اس معاملے سے الگ رکھنا چاہتے ہو تو یہ تم  
 لوگ ایک بڑی بھول کر رہے ہو۔“ ان سب کی طرف باری باری دیکھ کر جولی نے کہہ

دیا اس کام میں تمہیں کہیں نہ کہیں ایک عورت کی ضرورت تو پڑے گی ہی۔“  
 جولی کی اس وزنی دلیل کے آگے کسی نے کوئی سوال نہیں کیا اور گفتگو کا رخ  
 دوسری جانب موڑ دیا۔

”تو رگھوپتی اب ہمیں بینک کے ستاون لاکھ روپے کا معاملہ بھی جلدی طے کر  
 لینا چاہیے۔“ کہہ کر گولپی ناتھ نے وجے کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے

وجے کہ زمین میں دفن ان دونوں بکسوں کی طرف کسی کا دھیان نہیں جائے گا؟“  
 ”ہاں۔ اس کا مجھے یقین ہے۔“ وجے کی بجائے رگھوپتی نے جواب دیتے ہوئے

کہا۔

”لیکن اس سے پہلے ہمیں دو ایک اور ضروری کام کرنے ہیں۔“

”کیسے کام؟“ گولپی ناتھ نے پوچھا۔

”وہ تو کل چیانگ سے ملنے کے بعد ہی معلوم ہو گا۔“ رگھوپتی بولا۔

”تو کیا صرف دشمن کے نام کی تسلی کرنے کے لیے تم اب بھی اسے لاکھ روپے  
 دینے کے لیے تیار ہو؟“ گولپی ناتھ نے پوچھا لیکن رگھوپتی کے جواب دینے سے پہلے  
 ہی وجے بول پڑا۔ ”تم سب لوگ میری یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر جولی کا اندازہ  
 صحیح بھی ہے تو بھی محض اندازے کے سہارے آگے بڑھنے کا میں قائل نہیں ہوں

ہم کر اس سے کہا تھا ”لگتا ہے ہمارے نیپال کے سارے درزی مر گئے ہیں جب ہی  
 تو ہمارے یوراج جی تمہیں اتنا خرچ کر کے کلکتے سے بلاتے ہیں؟ میری یہ بات سن کر  
 سلطان احمد نے کہا تھا اصل میں ایک درزی کی فٹنگ پسند آجانے کے بعد ان بڑے  
 لوگوں کو کسی اور درزی کی فٹنگ پسند نہیں آتی۔ تمہارے یوراج صاحب اگر پیرس جا  
 کر بھی اپنے کپڑے سلوائیں گے تو بھی انہیں مجھ جیسی فٹنگ نہیں مل سکتی۔ میں نے  
 اس کی بات ہنسی میں اڑانے کی کوشش کی تو اس نے راز دارانہ لہجے میں کہا تھا۔  
 دیکھو کسی کو بتانا مت اصل میں یوراج چندر بھوشن کے بانیں کندھے کی ہڈی ذرا  
 ابھری ہوئی ہے اور میں نے ان کی اس خامی کو پکڑ لیا ہے۔ اس لیے میں ان کے  
 بانیں کندھے کی سلائی کے وقت خاص خیال رکھتا ہوں تاکہ لباس کے اوپر سے یہ خامی  
 نظر نہ آئے۔“

”تب تو جولی کا لگایا ہوا اندازہ درست ہے۔“ رگھوپتی کی بات سننے کے بعد رانا  
 نے کہا۔ ”رگھوپتی ہمارے ملک میں ہر سال نہ جانے کتنی کنواری لڑکیاں غائب ہو جاتی  
 ہیں یقیناً“ انہیں اغوا ہی کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی مجرموں کا کوئی پتا نہیں چلتا۔۔۔ ایسا  
 کیوں ہوتا ہے؟“

ایسا اس لیے ہوتا ہے جب محافظ خود ہی لیرے بن جاتے ہیں۔ کافی دیر بعد شہر  
 نے زبان کھولی۔ ”اب مجھے یہ امید ہو گئی ہے کہ ہمارا کام ضرور پورا ہو جائے گا۔  
 کیونکہ تم لوگوں کے کہنے کے مطابق جن پانچ لڑکیوں کی فلم تم لوگوں نے دیکھی ہے  
 ان میں ایک ایسی لڑکی بھی تھی جو ہماری کنواری دیوی رہ چکی ہے۔ اور کنواری دیوی  
 کی عزت لوٹنے والا بے موت مرتا ہے لہذا اس شیطان پر بھگوان کا تر ضرور ٹوٹے  
 گا۔“

”شہر کی بات بالکل درست ہے۔“ گولپی ناتھ بھی جو شیلے لہجے میں بولا۔ ”جو  
 آدی کنواری دیوی جیسی لڑکی کی عزت پر حملہ کرنے سے نہ ڈرتا ہو ایسے آدمی کے دن  
 پورے ہو چکے ہوتے ہیں اس کے باپ کا گھڑا بھر چکا ہوتا ہے۔ اس میں وہ کسی وقت  
 بھی اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ سکتا ہے۔“

”تو اب یہ بات طے ہو چکی ہے کہ وہ نقاب پوش چاہے جو کوئی بھی ہو۔ ہم

خود ہی انکار کر دے گا لیکن رگھوپتی نے انکار کرنے کی بجائے کہا ”ٹھیک ہے جولی میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا لیکن ایسے میں ملاقات کی جگہ ہمیں سلطانہ بیگم کے گھر کی بجائے کہیں اور ملے کرنا پڑے گی۔“

”ہاں.... کیونکہ میں سلطانہ بیگم کے گھر پر پیٹنگ گیٹ کے طور پر رہ چکی ہوں۔“ جولی نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اور ہاں میں کسی معاملے پر دخل اندازی نہیں کر سکوں گی اس لیے یہی بہتر ہے کہ چینی سے کہیں اور ملاقات کی جائے... اب یہ بتاؤ کہ اگر تم لوگوں کو کافی پینی ہے تو میں بنا لاؤں؟“

”کافی؟“ گوپی ناتھ نے چونک کر اپنی جیب سے بوتل نکالی اور بولا۔ ”اب تو یہ ٹھنڈی کافی پی کر ہم سو جانا چاہتے ہیں۔“

دھسکی کی بوتل پر نظر پڑتے ہی رانا کی آنکھوں میں چمک لہرانے لگی۔ تھوڑی دیر قبل وہ نیچے آشا کے گھر میں اس کے ساتھ پی چکا تھا لیکن اس کے باوجود اسے طلب محسوس ہو رہی تھی باقی سب لوگ چونکہ سونے کی تیاری کرنے لگے تھے اس لیے وہ اور گوپی ناتھ بوتل کھول کر بالکونی میں جا بیٹھے۔ دونوں نے پینا شروع کیا تو رانا نے یہ سوچ رکھا تھا کہ وہ پیتے پیتے آشا والی ساری بات گوپی ناتھ کو بتا دے گا لیکن پیتے پیتے اس کا ارادہ بدل گیا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ گوپی ناتھ سے کچھ نہیں کہے گا بلکہ جب سب لوگ سو جائیں گے تو وہ نیچے جا کر آشا کو پچیس ہزار روپے دے آئے گا اور اپنا پستول بھی واپس لے آئے گا۔

اس بدلے ہوئے ارادے نے اس کے پینے کی رفتار تیز کر دی۔ اور اس کے بے چین دماغ پر شراب کا نشہ چھانا چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ نشہ اس پر اس قدر غالب آگیا کہ اس نے بالکونی میں ہی اپنے پاؤں پھیلا دیے وہ نشے کی نیند میں سو چکا تھا۔



”کل رات گھر میں چوری ہو گئی ہے اور چور ہم میں سے ہی ایک ہے۔“ سب لوگوں کے سامنے روپے والا وہ بیگ جو شوہا کل رکھ کر گئی تھی رگھوپتی نے کھول دیا

اور اگر تم لوگ ایسا کرتے ہو تو مجھے اس معاملے سے الگ سمجھو۔“ وجے کی یہ بات سن کر سب کے ساتھ جولی بھی چونک پڑی۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وجے نے کیا سوچ کر ایسا کہا ہے؟ ایسے حالات میں وہ اس معاملے سے لاتعلق کیسے رہ سکتا ہے؟“

”شاید تم لوگوں کو میری بات بہت کڑوی لگی ہو گی اور تم لوگ یہ بھی سوچ رہے ہو گے کہ چونکہ میرے خون میں نیپال راج شاہی کا نمک شامل ہے اس لیے میں راج شاہی کے خلاف قدم اٹھانے سے ہچکچا رہا ہوں۔“ کتے کتے وجے اچانک ہی گھمبیر ہو گیا اور انتہائی جذباتی لہجے میں آگے بولا۔ ”اپنی جس بہن کو تلاش کرنے کے لیے میں نے گناہ کا بوجھ اٹھایا تھا اور جس کی خاطر مجھے وطن چھوڑنا پڑا تھا اس بہن کو بریاد کرنے والے دزدے کو تو کیا کوئی دیوتا بھی ہو تو بھی میں اسے معاف نہیں کروں گا.... لیکن دشمن کو پوری طرح پہچانے بغیر میں کوئی قدم اٹھانے کے خلاف ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہم سے اندازہ لگانے میں کوئی غلطی ہو جائے اور کوئی بے قصور ہمارے انتقام کا نشانہ بن جائے۔ میرے پاس جو لاکھ روپے پڑے ہیں وہ میرے اور کسی کام کے نہیں ہیں۔“

”ٹھیک ہے...“ گوپی ناتھ نے رگھوپتی کی طرف دیکھ کر دھیرے سے کہا۔ ”وجے اگر دشمن کے نام کی تسلی ہی کرنا چاہتا ہے تو کل تم اس چینی سے مل کر اس سے نام معلوم کر لو ممکن ہے سب کا اندازہ غلط ثابت ہو اور چینی ہمیں کسی اور کا نام بتائے۔“

”اگر اس چینی سے ملاقات کے وقت میں بھی رگھوپتی کے ساتھ جاؤں تو کسی کو اعتراض تو نہیں ہو گا؟“ گوپی ناتھ کے خاموش ہوتے ہی جولی نے پوچھا لیکن اس کی وجہ بتانے میں تمہیں بھی تو کوئی اعتراض نہیں ہو گا نا؟“ گوپی ناتھ نے ہنس کر پوچھا لیکن جولی کے چہرے پر بدستور گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی اور اس نے اسی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”وجہ بتانا اس وقت مناسب نہیں ہو گا لیکن میں یہ یقین دلاتی ہوں کہ میرے جانے سے کام نہیں بگڑے گا۔“

اس کی بات سن کر سب نے رگھوپتی کی طرف دیکھا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید وہ

اور دھاکہ کرتے ہوئے بولا تو صبح کی چائے پیتے ہوئے وہ پانچوں چونک پڑے۔ رانا کا ہاتھ تو اس طرح کانپ گیا کہ چائے چھلک پڑی تھی۔

”چور ہم میں سے ایک ہے۔“ گولپی ناتھ نے سگار کا دھواں رگھوپتی کے منہ پر جھوڑتے ہوئے غصے میں سینٹرل ٹیبل پر ہاتھ مارا اور آگے بولا۔ ”رگھوپتی تم ہمیں کیا سمجھتے ہو؟ رات ہم چاروں باہر گئے تھے اور گھر میں میرے دو ساتھی رانا اور شیرا رہ گئے تھے اس لیے تم ان پر چوری کا الزام لگا کر پھنسانا چاہتے ہو؟“

”میں نے یہ نہیں کہا ہے گولپی ناتھ کہ تمہارا کوئی ساتھی چور ہے۔“ رگھوپتی بڑے ہی سکون سے بولا۔ ”میں نے تو یہ کہا تھا کہ چور ہم میں سے کوئی ایک ہے اس لیے کہ اب ہم میں کوئی فرق نہیں رہا ہے تمہارے ساتھی ہوں یا میرے ہم سب ایک ہی ہیں اس بیک میں سے رات کو تیس ہزار روپے کی رقم غائب ہوئی ہے اور مجرم اس وقت میرے سامنے بیٹھا ہے۔“

یہ سننا تھا کہ گولپی، جولی اور وجے کی نگاہیں رگھوپتی کے سامنے بیٹھے ہوئے رانا اور شیرا پر جم گئیں شیرا بہت غصے میں نظر آ رہا تھا اور اس کی سرخ آنکھیں رگھوپتی کو گھور رہی تھیں یکایک وہ اونچی آواز میں بولا۔ ”رگھوپتی تم ہم پر شک کر رہے ہو۔“ اور۔۔۔

”مجرم میں ہوں۔“ شیرا کی بات ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ رانا کے اس اچانک اقرار نے سب کو دم بخود کر دیا۔ ”تیس ہزار روپے میں نے ہی رات کو اس بیک میں سے نکالے تھے لیکن یہ رقم ابھی گھر سے باہر نہیں گئی ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ اٹھا اور دروازے کی طرف جانے کے لیے بڑھا ہی تھا رگھوپتی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا ”ردی اخباروں کی تمہی کے اندر جو رقم تم نے چھپائی تھی وہ اس بیک میں واپس آچکی ہے۔“ رگھوپتی کا یہ دوسرا دھاکہ سن کر سب کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں رگھوپتی اپنے مخصوص لمبے میں کہہ رہا تھا۔ ”رات کو تم بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے اس کی وجہ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن صبح سویرے جب میں نے بیک نکالا تو تم نے اسے ٹھیک سے بند نہیں کیا تھا اس لیے مجھے خیال آیا کہ روپے گن لوں۔ پھر جب تیس ہزار کی تین گڈیاں کم نظر آئیں تو میں سمجھ گیا کہ یہ

کسی باہر کے آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ چور اگر باہر کا ہوتا تو وہ ساری رقم لے جاتا۔۔۔“

”لیکن رانا۔۔۔ تمہیں ایسا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟“ گولپی ناتھ نے دانت پس کر رانا کی طرف دیکھا۔ ”ہم کتنے نیک اور کتنے اچھے ارادے لے کر اپنے وطن سے نکلے ہیں اور تم نے۔۔۔“

”اس میں قصور اس کے اکیلے کا نہیں ہے۔“ رگھوپتی نے اسے درمیان میں ہی روک دیا اور بیک کے نیچے دبئی ہوئی تصویر کو نکالتے ہوئے بولا۔ ”نیچے رہنے والی عورت نے اسے پھنسایا ہے۔“

”گولپی ناتھ نے جھپٹ کر تصویر رگھوپتی کے ہاتھ سے لے لی اور پھر اس تصویر پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں وہ کبھی تصویر کو دیکھ رہا تھا اور کبھی رانا کو۔ رانا کی گردن گناہ کے خوف سے جھکی ہوئی تھی۔

”اسی حالت میں اس نے تصویر بھی کھینچ لی اور تم بے خبر رہے؟“ کہہ کر گولپی ناتھ نے لپک کر رانا کی کلائی پکڑی۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ یہ نیپالی سفارت خانے کے خزانچی کی بیوی ہے؟“

رگھوپتی نے اٹھ کر گولپی ناتھ کی گرفت سے رانا کی کلائی چھڑائی۔ رانا کی آنکھوں میں پچھتاوے کے آنسو تھے اور وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔ ”یہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ جب تم لوگ مجھے اور شیرا کو چھوڑ کر چلے گئے تو میں پینے کی طلب محسوس کرنے لگا۔ اور اسی لیے میں نیچے والے نوکر کو تلاش کرنے کے لیے نیچے گیا تھا۔ میں اسے کمپاؤنڈ میں ڈھونڈ رہا تھا کہ اس نے مجھے کھڑکی سے دیکھ لیا اور پہچان گئی۔“ اس کے بعد کی بات وہ جولی کی موجودگی کی وجہ سے گول کر گیا۔ مگر بات مکمل کرنے کی غرض سے آگے بولا۔ ”بس اس کے بعد اس نے یہ تصویر مجھے دی اور میرا ہتھول اپنے پاس رکھ لیا۔ ایسی دو اور تصویریں بھی اس کے پاس ہیں۔ مجبوراً اپنا ہتھول اور اپنی دونوں تصویریں حاصل کرنے کے لیے مجھے اسے پچیس ہزار روپے چکانے کے لیے ایسا کرنا پڑا تھا۔“

”اس کا مطلب یہ کہ تم نے چوری کی؟“ گولپی ناتھ غصے سے چیخا۔ ”اگر تم نے

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو رگھوپتی۔“ گولی ناتھ الجھے الجھے لہجے میں بولا۔ ”تمہاری اس بات سے تو ہم اور زیادہ الجھ گئے ہیں۔ تم صاف صاف بتاؤ رگھوپتی کہ ہماری سمجھ میں بھی کچھ آئے۔“

”اس کی بات میری سمجھ میں آرہی ہے۔“ جولی نے کہا۔ ”لیکن پہلے یہ بتاؤ رگھوپتی کہ جو بات آشنا خود نہیں جانتی وہ بات تمہیں کیسے معلوم ہو گئی؟“

”کاسینو... جولی کاسینو۔“ رگھوپتی فخریہ لہجے میں بولا۔ ”میں نے پورے چھ برس تک کاسینو میں کام کیا ہے اور کاسینو ایک ایسی جگہ ہے جہاں درزی سے لے کر ڈاکٹر جیسے لوگ آتے ہیں ان لوگوں سے مجھے بہت سی جانی اور انجانی باتیں معلوم ہوتی رہتی تھیں۔“ اتنا کہہ کر وہ مسکرایا۔ پھر آگے بولا۔ ”لیکن اب اس کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال مت پوچھنا کیونکہ آج مجھے اس کے ساتھ جوا کھیلنا ہو گا میں جا رہا ہوں مجھے دیکھنا ہے کہ میری جیت ہوتی ہے یا ہار؟“

”لیکن تم کرنا کیا چاہتے ہو یہ تو بتاؤ؟“ گولی ناتھ نے گھبراہٹ اور بے قراری سے پوچھ لیا۔ ”پہلے یہ تو سوچ لو کہ اگر تم ہار کر آئے تو ہم سب کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اور تب تمہارا انتقام اور ہمارا مقصد دونوں ادھورے رہ جائیں گے۔“ لیکن رگھوپتی نے راز نہیں کھولا۔ وہ ہاتھ روم میں گھس کر گنگناتے ہوئے نہانے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ کرتا پاجامہ پہن کر ہاتھ روم سے باہر نکلا اور لاکھ روپے سے بھرا ہوا بیگ اور رانا کی تصویر اٹھا کر ان سب کو حیران کرتا ہوا آشنا سے ملنے کے لیے کمرے کے باہر نکل گیا۔

اس کا یہ انداز دیکھ کر جولی دل ہی دل میں وجہ اور رگھوپتی کا موازنہ کرنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ دونوں گہرے دوست واقعی بڑے باہمت ہیں مگر ایک سوچ سمجھ کر دھیرے دھیرے چلنے کا عادی ہے اور دوسرا جلد باز اور جھٹ پٹ نتیجہ چاہتا ہے اب دیکھنا ہے وہ کیا کر کے آتا ہے؟“

چوری جیسی حرکت کرنے کی بجائے کھلے دل سے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہوتا تو...“

”اب چھوڑو اس بات کو گولی۔“ رگھوپتی اسے ٹھنڈا کرنے کی غرض سے بولا۔ ”جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا... اب ہمیں ان دو تصویروں کو اس کے پاس سے لینا ہو گا۔“

”رانا۔“ گولی ناتھ پر غصے سے بولا۔ ”تم نے تو اپنے ساتھیوں کو بھی شرمندہ کر دیا ہے تم ہمارے ساتھ مہاراجا کے ظلم کے خلاف بغاوت کرنے کے ارادے سے آئے اور مہاراجا کے ہی آفسر کی بیوی کے جال میں پھنس گئے؟“

”بس اب چپ ہو جاؤ گولی۔“ کافی دیر سے خاموش بیٹھے ہوئے وجے نے گولی کو چپ کراتے ہوئے کہا۔ ”تم اس عورت کو نہیں جانتے گولی جب میں یہاں رہنے کے لیے آیا تھا تو اس نے پہلے مجھ پر بھی جال ڈالا تھا۔ کسی قسم کی شرم و حیا کے بغیر وہ ہر اجنبی مرد سے کہہ دیتی ہے کہ ہری پرشاد جی باپ بننے کے لائق نہیں ہیں۔ میں ماں بننے کے لیے ترس رہی ہوں ممتا کی تڑپ سے مجبور عورت کی طرف کوئی بھی ہمدردی کی نظر ڈال سکتا ہے۔ اور یہ رانا تو پھر بھی اس کے کالج کا ساتھی رہ چکا ہے۔“

”ممتا کی تڑپ سے مجبور عورت...“ رگھوپتی ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑا کر درمیان میں ہی چپ ہو گیا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا سب چپ چاپ اسی کو دیکھتے رہے تھے رانا بہت پر سکون نظر آ رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ وجے نے اس کی طرف داری کی تھی مگر اس وقت وہ رگھوپتی کے منہ سے کچھ سننے کے لیے بے قرار نظر آ رہا تھا۔

”لیکن ہر پرانے شخص سے اپنی ممتا کے لیے بھیک مانگنے والی عورت اب تک کیوں ماں بننے سے محروم ہے؟“ رگھوپتی کا یہ سوال ان سب کو بڑا عجیب سا لگا تھا۔ مگر کسی کے کچھ پوچھنے سے پہلے جولی ہی پوچھ بیٹھی۔ ”یعنی تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”مجھے لگتا ہے کہ آشنا مردوں کو بے وقوف بنانے کے چکر میں خود ہی بے وقوف بنتی جا رہی ہے۔“ رگھوپتی بہت ہی گھمبیر لہجے میں بولا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ ماں بننا چاہے تو بھی ماں کبھی نہیں بن سکتی۔ یہ بات شاید وہ نہیں جانتی لیکن میں یہ بات جانتا ہوں۔“

گھر بھیج دیا کرتے تھے۔“

آپ بھیج دینے کی بات کہہ رہی ہیں؟“ رگھوپتی نے اپنی چال کی ابتدا کی اور بولا ”ارے کبھی کبھی تو ہم خود آکر انہیں گھر پر چھوڑ جاتے تھے۔ اور یہ ذمہ داری زیادہ تر میرے سر پر ہی آتی تھی۔“

”تب تو آپ کافی قریب کے آدمی ہیں۔“ آشا نے مسکرا کر کہا۔ ”کیا نام بتایا تھا آپ نے؟“

”ابھی میں نے اپنا نام بتایا ہی کہاں ہے؟“ رگھوپتی ہنس کر بولا۔ ”لیکن یاد رہ جانے والا نام ہے رگھوپتی۔“

”رگھوپتی“ آشا نے دہرایا اور بولی۔ ”بولنے میں ذرا دشوار لگتا ہے۔“

”ہاں.... خاص کر کے عورتیں جب میرا نام لیتی ہیں تو انہیں ذرا دشوار لگتا ہے۔“ رگھوپتی نے ذرا طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن پرانی ملاقات کو تازہ کرنے کی بات تو ابھی آپ نے سنی ہی نہیں۔ ایک بار جب پرشاد جی بہت نشے میں تھے تو میں انہیں رات کے دو بجے گھر چھوڑنے آیا تھا۔ اس وقت اپنے گھر میں آپ اور ڈاکٹر تھاپا بھی کچھ ایسی ہی حالت میں تھے۔“

آشا کو ایک شدید جھٹکا لگا اور پہلی بار اس کے جڑے کچھ تنگ سے ہو گئے یہ دیکھ کر رگھوپتی کو مستی چڑھی اور وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”بے چارے پرشاد جی لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آپ کی جانب بڑھے۔ وہ آپ کو اپنی ہار جیت کی بات بتانا چاہتے تھے لیکن آپ نے انہیں واپس میری طرف دھکیل دیا تھا اور بڑے ہی تلخ لہجے میں کہا تھا ”چلید... ہو... تم زندگی اور جوئے میں کبھی جتنے ڈالے نہیں ہو۔“

”آپ کو تو ایک ایک لفظ یاد رہ گیا ہے“ آشا اندر ہی اندر دانت پیس کر بولی۔ ”اور اس برسوں پرانی بات کو یاد دلانے کے لیے آج آپ کو نیچے آنا پڑا ہے کیوں؟“

رگھوپتی نے کوئی جواب نہیں دیا وہ چپ چاپ بیٹھا آشا کے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ جب وہ کچھ نہیں بولا تو آشا خود ہی بولی۔ ”ویسے شرافت اور انسانیت کا تقاضا تو یہی ہے کہ جس کے مہمان بن کر آئیں ہیں اس کو ساتھ لے کر پڑوسی کے گھر جانا چاہیے۔“

”کیا میں اندر آسکتا ہوں؟“ دروازے کے پتوں بچ کھڑے ہوئے رگھوپتی نے پوچھا تو آشا چند لمحوں تک اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ اس الجھن میں تھی کہ ہاں کے یا انکار کر دے؟ لیکن رگھوپتی کو تو جیسے اس کی اجازت کی پروا ہی نہیں تھی۔ وہ تو اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کمرے کے اندر داخل ہو کر آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ ”کمال ہے۔“ صوفے پر بیٹھنے کے بعد آشا کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”میں اتنے دنوں سے اوپر مہمان بن کر آیا ہوں لیکن ایک بار بھی آپ کا دیدار نہیں ہوا۔“ آشا اس کی بے تکلفی پر سوچنے لگی کہ اسے اس پر خوش ہونا چاہیے کہ ناراض؟ وہ ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس لیے اس سے کوئی فیصلہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ دو تین روز قبل اسے اوپر کی بالکونی سے رگھوپتی نے دیکھا لیا تھا۔ لیکن وہ تو اسے دیکھ کر بھی نہیں پہچان سکی تھی۔ اور اب بھی وہ اسی الجھن میں مبتلا تھی۔

”آپ کو کیس دیکھا ہے یہ تو مجھے یاد آرہا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد وہ بولی۔ ”لیکن یہ یاد نہیں آتا کہ ہمارا کبھی تعارف بھی ہوا ہو؟“

یہ سن کر رگھوپتی دل ہی دل میں مسکرایا اور اپنے آپ سے بولا عورت چالاک ہے۔ سوچ سمجھ کر چال چل رہی ہے۔ میں یاد دلاتا ہوں آشا دیوی۔ رگھوپتی کا یہ انداز مخاطب آشا کے دل کو چھو گیا۔ لیکن اس نے اپنے چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ اور دلچسپی سے رگھوپتی کی طرف دیکھنے لگی۔ جو کہہ رہا تھا ”اس وقت ہری پرشاد جی دہلی کے سفارت خانے میں کیشیر نہیں تھے بلکہ وہ کھٹنڈو میں ہی ایک بینک میں کلرک تھے اور ہمارے کاسینو میں تقریباً ”روزانہ آتے تھے۔“

”اچھا“ آشا ہنستے ہوئے بولی۔ ”اور آپ کاسینو والے روز انہیں تلاش کر کے



”جی بات ہے آشا دیوی۔“ رگھوپتی نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ ”انسانیت اور شرافت تو یہ بھی کہتی ہے کہ کسی کے مہمان کو اپنے گھر میں بلا کر عیش کرانے کے بدلے اس سے بڑی رقم کا مطالبہ بھی نہ کیا جائے۔“

آشا اس طرح صوفے سے اچھل کر کھڑی ہوئی۔ جیسے رگھوپتی کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اس کے دل کے پار اتر گیا ہو۔ ”تو یہ بات ہے؟“ وہ سانپ کی طرح پھنکار کر بولی۔ ”تو یہ پہلے ہی کیوں نہیں بتا دیا کہ تم رانا کی دلالی کرنے آئے ہو؟“

اس کا غصہ دیکھ کر رگھوپتی کو لگا کہ وہ ابھی بل کھاتی ہوئی اندر چلی جائے گی اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے اس کا پھیرا ناکام بنا دے گی۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے جھپٹ کر اپنے قریب رکھا ہوا بیگ اٹھا کر کھولا اور اندر رکھی ہوئی گڈیوں کو ہاتھ میں لے کر بولا۔ ”رانا کو آپ نے بالکل سچ بتایا تھا وجہ کے کمرے میں پورے لاکھ روپے پڑے تھے۔“

آشا کا تا ہوا چہرہ یکایک ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں اس طرح چمکنے لگیں جیسے اچانک ہی کوئی معجزہ رونما ہو گیا ہو۔ وہ بڑی لالچی نظروں سے رگھوپتی کے ہاتھ کو تاک رہی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر رگھوپتی کو اسے دوبارہ اپنے آپ میں لانے کے لیے کنا پڑا۔ ”بیٹھے نا اور سچ بتائیے گا آشا دیوی آپ کو پیسے کی لالچ ہے یا اولاد کی؟“

”کیا مطلب؟“ وہ پھر غصے میں آکر دانت پیسنے ہی جا رہی تھی کہ اسے محسوس ہوا کہ رگھوپتی کے اس سوال میں طنز کی بجائے ہمدردی کی جھلک تھی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ نرم پڑ گئی اور بولی۔ ”دولت اور عہدے کی لالچ تو صرف پرشاد کو ہے۔ میں تو صرف ماں کے عہدے کے لیے ترس رہی ہوں۔“

”اور اس کے باوجود آپ ماں نہیں بن سکتیں۔“ رگھوپتی نے پر یقین لہجے میں کہا۔ ”شاید آپ میں ہی کوئی خامی...“

”نہیں... نہیں...“ آشا اس طرح بولی جیسے رگھوپتی کی یہ بات اسے بڑی بری لگی ہو۔ ”مجھ میں کوئی خامی نہیں ہے۔ ڈاکٹر تھپا سے میں نے چیک کرایا تھا۔“

”ڈاکٹر تھپا... ہونہ...“ رگھوپتی نے حقارت سے کہا۔ ”آشا دیوی اس ڈاکٹر تھپا نے آج سے پانچ سال پہلے آپ کا اپنڈکس کا آپریشن کیا تھا یاد ہے آپ کو؟“

”ہاں... لیکن آپ کو یہ کس نے بتایا؟“ آشا نے چونک کر پوچھا۔

”ڈاکٹر تھپا بھی ہمارے کاسینو کا پرانا کھلاڑی ہے آشا دیوی۔“ رگھوپتی ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ ”اور اس آپریشن میں اس نے آپ کا اپنڈکس کا نہیں بلکہ آپ کی متاکو ہی کاٹ کر پھینک دیا تھا۔“

”کیا؟“ آشا بوکھلا گئی اور چیخ کر بولی۔ ”تم کیا مجھ سے میری متا چھیننے آئے ہو؟“

”میں نہیں۔“ رگھوپتی نے سکون سے جواب دیا۔ ”آپ کی ماں بننے کی ملاحیت خود آپ کے شوہر نے آپ سے چھین لی تھی۔ اور اس کام میں ڈاکٹر تھپا نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ اصل میں پرشاد جی خود باپ بننے کے قابل نہیں تھے... لیکن وہ کسی پرانے مرد کے بچے کا باپ کہلوانا بھی نہیں چاہتے تھے۔“ رگھوپتی کی بات میں سچائی کی جھلک تھی جو آشا نے محسوس کر لی تھی۔

”تو اس لیے میرے ساتھ یہ ظلم؟“ آشا کی آنکھیں نم ہو گئیں اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اس کی ترقی کے لیے میں بیوی سے طوائف بنی اور وہ میری متا کا میرے ہونے والے بچوں کا قاتل بنا؟ اپنی خامی کا بدلہ لینے کے لیے اس نے مجھے بانٹ کر دیا۔“ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رگھوپتی اٹھ کر اس کے قریب گیا اور دھیرے دھیرے اس کی بیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر اسے تکی دتا ہوا بولا۔ ”آشا بہن... تمہاری متا بھری گود آج سے ساڑھے پانچ سال پہلے ہی اجاڑ دی گئی تھی لیکن تمہاری ماں بننے کی خواہش کو آج میں نے چھین لیا ہے۔ اس لیے کہ کہیں اس خواہش کے پیچھے تم اپنی زندگی کو مزید برباد نہ کر ڈالو۔“ رگھوپتی جذبات کی رو میں اسے آپ کے بجائے ”تم“ کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔

”یعنی میں غیر مردوں کو پھنساتی نہ پھروں۔“ کہہ کر وہ کھڑی ہوئی اور آگے بولی۔ ”آپ بیٹھیں میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ اپنی ساڑی کے پلو سے اپنے آنسو پوچھتی ہوئی تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اور تب ہی رگھوپتی کو لگا کہ وہ اندر جا کر

سلا تھا۔

لیکن تب ہی کارنر ٹیبل پر رکھے ہوئے ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ رگھوپتی نے مردن گھا کر فون کی طرف دیکھا۔ لیکن آشنا نے کوئی توجہ نہیں دی تو رگھوپتی کو ہی آگے بڑھ کر ریسیور اٹھانا پڑا۔ ”ٹرنک کال ہے کھنڈو سے۔“ کہہ کر رگھوپتی آشنا کی طرف دیکھنے لگا۔ مگر آشنا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کسی فون کی پرواہی نہ ہو۔ یکایک رگھوپتی کی سماعت سے ہری پرشاد جی کی آواز ٹکرائی جو دوسری جانب سے پوچھ رہا تھا۔ ”ہیلو... کون وجے کمار؟“

”ہاں.... وجے ہی ہوں۔“ رگھوپتی کو کہنا پڑا۔

”کیا آج صبح سویرے ہی آشنا کے پاس آگئے ہو؟“

دوسری طرف سے پرشاد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”یا دن رات نیچے ہی ڈیرہ ڈال رکھا ہے؟“

”یوں ہی سمجھ لیجئے۔“ رگھوپتی دھیرے سے بولا۔

”میری غیر موجودگی میں آشنا تمہاری ٹھیک طرح سے خدمت تو کر رہی ہے نا؟“

”ہاں.... ایسی خدمت تو کسی نے زندگی میں نہیں کی ہے۔“ رگھوپتی نے جواب دیا۔

”بینک سے اور روپے نکلوائے یا نہیں؟“ ہری پرشاد کی آواز میں لالچ کی جھلک محسوس ہو رہی تھی۔ ”پاپ کی دولت کو کھلے ہاتھ سے خرچ کر رہے ہو نا؟“

”ارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“ رگھوپتی اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر اتنی ہوشیاری سے بولا کہ اس کی آواز پہچانی نہ جائے۔ ”بینک میں سے دو لاکھ روپے نکلوائے تھے جس میں سے ایک لاکھ خرچ بھی ہو گئے۔“ کہہ کر اس نے آشنا کو آنکھ ماری۔

”مجھے تو یوراج کی رسم تاجپوشی کی تیاری میں ابھی یہیں رکنا پڑے گا۔“

دوسری جانب سے ہری پرشاد کہہ رہا تھا۔ ”بڑے شاندار طریقے سے یہ رسم ادا کی جائے گی۔ آخری ایک ہفتے تک پورے نیپال میں جشن منانے کے پروگرام بنائے گئے ہیں۔ اور سری پنچ چندر بھوشن کی تاجپوشی کی فلم پورے نیپال میں راج محل سے

کہیں کچھ کر نہ بیٹھے؟ رگھوپتی ابھی کچھ سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ آشنا اپنے ساتھ ایک ہاتھ میں دو تصویریں اور دوسرے ہاتھ میں رانا کا پستول لیے ہوئے توقع کے خلاف جلد ہی واپس آگئی اور رگھوپتی کے سامنے آکر دونوں تصویریں بڑھاتی ہوئی بولی۔ ”یہ سارے لیجئے اب مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔“

رگھوپتی اس کے اندر پیدا ہونے والی اس اچانک تبدیلی کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا اور تصویریں لینے کی بجائے وہ اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ چند لمحوں تک جب رگھوپتی نے اپنا ہاتھ نہیں بڑھایا تو آشنا نے دونوں تصویریں اس کی گود میں پھینک دیں اور پوچھا۔ ”یہ آپ اس طرح کیا دیکھ رہے ہیں؟“

”آپ نے اتنی جلدی فیصلہ کر لیا اس پر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔“ کہہ کر رگھوپتی نے اپنی گود میں سے تصویریں اٹھائیں اور دوسرا ہاتھ بیگ کے ہینڈل کو تھامنے کے لیے بڑھایا ہی تھا کہ اچانک آشنا نے پستول کا رخ اس کی طرف کر کے بڑے ہی کرخت لہجے میں کہا۔ ”نہیں.... مسٹر رگھوپتی اس بیگ کو ہمیں چھوڑتے جائیں۔“

رگھوپتی کی گردن ایک جھٹکے سے اونچی ہو گئی۔ اسے آشنا کی اس دوسری تبدیلی پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے یقین کرنا پڑ رہا تھا کیوں کہ وہ مذاق کے موڈ میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول تھا۔ جس کا رخ اسی کی طرف تھا اور پستول کو آشنا نے اس طرح پکڑ رکھا تھا جیسے یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہ ہو۔ رگھوپتی کو دل ہی دل میں بیچھتاوا محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اسے بغیر ہتھیار کے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔

”میں کتنی جلدی فیصلے بدل سکتی ہوں۔ یہ جان کر آپ کو صدمہ ہوا ہے نا؟“ وہ پستول والا ہاتھ دھیرے دھیرے ہلاتی ہوئی بولی۔

”نہیں.... مجھے تو آپ کی اتنی کامیاب اداکاری پر حیرت ہو رہی تھی۔“ رگھوپتی نے پرسکون نظر آنے کی کوشش کی، وہ بازی ہار چکا تھا لیکن پھر بھی اپنے لہجے میں تلخی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ”واقعی ایسے کھیلوں کی آپ ایک ماہر کھلاڑی ہیں۔“ اتنا کہہ کر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے اٹھتے دیکھ کر آشنا چونکا ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اب اس کے اور رگھوپتی کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ رگھوپتی ہاتھ بڑھا کر پستول چھین نہیں

”تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ ابھی ہمارے مہمان آنے والے ہیں۔“ آرڈر کے لیے کھڑے ہوئے چائنیز، ریسٹورانٹ کے ویٹر سے رگھوپتی نے کہا۔ ”بس اب وہ آتے ہی ہوں گے۔“

”اوکے سر۔“ ویٹر نے ادب سے سر جھکا دیا اور میز کے قریب سے ہٹ گیا۔ وجے نے گھڑی پر نظر ڈالی اور رگھوپتی سے بولا۔ ”سوا سات ہو چکے ہیں جب کہ ریگن کو تو سات بجے کا وقت دیا گیا تھا؟“

”وقت تو سات کا ہی تھا وجے۔“ رگھوپتی آس پاس کی میزوں کا جائزہ لیتا ہوا نیپالی زبان میں بولا ”مگر ہمارے جتنی غرض اس کو بھی ہے۔“

”آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟“ جولی نے گلاس اٹھا کر پانی کا ایک گھونٹ پیا اور پھر ٹوٹی پھوٹی نیپالی میں بولی۔ ”کیا ریگن یہ سب پیسے کی خاطر ہی کر رہا ہے؟“

”وہ ظاہر تو یہی کرتا ہے۔“ دل میں دبا ہوا شک رگھوپتی کے ہونٹوں پر آگیا۔ ”پھر بھی پیسے کے علاوہ اس کا کوئی خاص مقصد بھی ہونا چاہیے۔“

”مجھے تو وہ جاسوس جیسا لگتا ہے۔“ وجے کی آواز میں گہرا ہٹ تھی ”اور میرا تو یہ خیال ہے کہ وہ ہماری ایک ایک حرکت پر نظر رکھ رہا ہے۔ اس وقت وہ بھلے دیر سے ہی ہمارے سامنے آئے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی آدمی تو اس وقت ہمارے آس پاس بیٹھا ہو گا۔“

”اگر ایسی بات ہے تو ہم لوگوں کو اس کے بارے میں باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“ جولی نے دھیرے سے کہا تو ان تینوں کے درمیان تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

رگھوپتی اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ اس چینی کا قلم کے نیگیٹو بیچ کر پیسے کمانے کے علاوہ اور کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ اگر وہ چاہے تو خود یوراج چندر بھوشن کو بلیک میل کر کے لاکھوں روپے وصول کر سکتا ہے۔ لیکن جولی کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ سوال چل رہا تھا کہ قلم میں نظر آنے والے نقاب پوش کے بارے میں اس نے جو اندازہ لگایا ہے اس پر اس چینی نے اتفاق نہیں کیا تو؟ اگر اس نے یوراج چندر بھوشن کی بجائے اس نقاب پوش کا کوئی اور نام بتایا تو؟“

دکھائی جاتی گی اس کے لیے تقریباً ”دو سو پرو جیکٹر کے آرڈر دیے گئے ہیں۔ تاکہ دور دراز کے لوگ بھی تاجپوشی کا آنکھوں دیکھا حال دیکھ اور سن سکیں۔ اس کے علاوہ بہت سے رنگارنگ پروگراموں کی تیاریاں بھی ہو رہی ہیں۔“

ہری پرشاد کی باتیں سن کر رگھوپتی کو لگ رہا تھا کہ وہ اگر اسی طرح ریسپور تھائے کھڑا رہا تو ہری پرشاد بولتا رہے گا اور اس کے ہاتھ آیا ہوا موقع اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی وہ جلدی سے بولا ”اب میں ریسپور آشا کو دیتا ہوں لیجئے بات کر لیجئے۔“ کہہ کر اس نے ریسپور آشا کی طرف بڑھا دیا۔ مگر ریسپور اس کے ہاتھ میں دینے سے پہلے وہ دھیمی آواز میں آشا سے بولا تھا۔ ”پرشاد جی لاکھ روپے کی بات سن کر بہت خوش ہوئے ہیں آپ کو شاباش دیں گے۔“ پھر جیسے ہی آشا نے ریسپور لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ویسے ہی رگھوپتی نے بڑی پھرتی سے اس کے پستول والے ہاتھ کی کلائی پکڑ لی اور فوراً ہی ایک جھٹکے سے اس کی کلائی مروڑ دی۔ اس اچانک جھٹکے سے پستول آشا کے ہاتھ سے چھوٹ کر دروازے کی طرف جاگرا اور آشا کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

”کیا ہوا آشا؟“ دوسری طرف سے پرشاد نے چیخ کر پوچھا تھا اور ریسپور اس سے آتی ہوئی اس کی آواز ان دونوں نے صاف سنی تھی۔ آشا نے ریسپور اپنے کان سے لگایا تو ہری پرشاد کہہ رہا تھا ”لگتا ہے وجے کافی رنگیلا آدمی ہے۔ مجھ سے بات کرنے کے لیے بھی تمہیں ایک منٹ کے لیے نہیں چھوڑتا۔ چلو کوئی بات نہیں۔ تم اسے سنبھالو۔“ اس کے ساتھ ہی آواز بند ہو گئی اور لائن کٹ گئی۔

”ذلیل“ آشانے غصے میں دانت پیس کر کہا اور ریسپور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ ”کون ذلیل؟“ روپے کے بیگ دونوں تصویریں اور رانا کی پستول کو اپنے قبضے میں لے کر رگھوپتی دروازے کی جانب مڑ کر بولا۔

”اور کون؟“ میرا کمینہ شوہر۔“ آشا اس قدر غصے میں بولی کہ اگر اس وقت اس کا شوہر موجود ہوتا تو وہ اس کی گردن ہی دبا دیتا۔ آشا کی آنکھوں میں نفرت اور انتقام کی ایک بھیانک آگ جل رہی تھی۔

چینی نے ان سے ہاتھ ملانے کی بجائے اپنی گردن کو ذرا سا خم دے کر ان کے استقبال کا شکریہ ادا کیا اور خالی پڑی ہوئی چوتھی کرسی پر بیٹھ گیا پھر باری باری ان تینوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”پہلے تو میں آپ لوگوں سے اس تاخیر کی معافی مانگوں گا۔“ اتنا کہہ کر وہ اس طرح ہنس پڑا کہ اس کے دو سونے کے دانت صاف نظر آنے لگے۔ ”اصل میں ایک لیڈی کے ساتھ شام کے شو میں ایک ہندی فلم دیکھنے کا پروگرام تھا۔۔۔۔۔ اس لیے انٹرویو تک اسے کہنی دینا پڑی اب آدھے گھنٹے بعد یہاں سے فارغ ہو کر پھر اس کے ساتھ شامل ہو جاؤں گا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ رگھوپتی بولا اور پھر اپنے دونوں ساتھیوں کا تعارف کراتے ہوئے بولا ”یہ ہیں میرے دوست مسٹر وجے کمار اور یہ ہیں مس جولی مسٹر وجے کی خاص فرینڈ۔“

”ان دونوں کو کل رات کو دیکھا تو تھا۔۔۔“ چینی جولی کی طرف تاک کر بولا۔ ”اور آج ان کا نام بھی معلوم ہو گیا۔۔۔ وجے اور جولی۔۔۔ دونوں اچھے نام ہیں۔ نیپالی اور آسٹریلیا کی جوڑی بڑی شاندار ہے۔“

”تھینک یو۔“ وجے نے تو کہہ دیا لیکن جولی ذرا چونک پڑی۔ آخر اس چینی کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ وہ آسٹریلیا کی رہنے والی ہے؟ اور آخر یہ سوال اس کے ہونٹوں پر آئی گیا ”مگر آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں آسٹریلیا کی رہنے والی ہوں؟“

”یہ تو آپ کا ناک نقشہ ہی بتا رہا ہے۔“ چینی نے پھر اپنے سونے کے دانت دکھائے ”میں آپ کے ملک میں سات مہینے رہ کر آیا ہوں۔“

یہ جواب سن کر جولی سوچنے لگی کہ شاید وہاں بھی یہ شخص جاسوسی کے لیے ہی آیا ہو گا؟ ٹھیک اسی وقت ویٹر آرڈر لکھنے کے لیے آگیا۔ تو چیانگ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا میں تو صرف چکن سوپ ہی لوں گا۔ کیونکہ ڈنر تو مجھے کسی اور کے ساتھ لینا ہے۔“

”اپنی لیڈی پائزر کے ساتھ؟“ جولی نے ذرا بے تکلف ہو کر پوچھا تو چیانگ نے اپنے دانت نہیں دکھائے بلکہ صرف گردن ہلا کر ہی اثبات میں جواب دیا اس درمیان رگھوپتی نے اپنے تینوں ساتھیوں کے لیے بیرے کو آرڈر دے کر اسے رخصت کر دیا۔

مگر وجے کو یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ جولی اس چینی سے ملنا کیوں چاہتی ہے؟ وہ اپنا ارادہ کیوں ظاہر نہیں کر رہی ہے؟ پھر تیسرے ہی منٹ پر ان تینوں نے سمجھ لیا کہ ان کی خاموشی نے تو اس پورے ماحول کو اداس بنا کر رکھ دیا ہے۔

”تمہارا کیا خیال ہے رگھوپتی؟“ خاموشی توڑنے کے لیے وجے نے صبح والی بات شروع کی۔ ”پھری ہوئی آشا کس سے اپنا بدلہ لے گی۔ اپنے شوہر سے یا ہم سے؟ رگھوپتی اس کا سوال سن کر دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے جواب سوچ ہی رہا تھا کہ جولی بول پڑی۔ ”آج دوپہر کو جب اچانک وہ کھٹنڈو جانے کے لیے ایئر پورٹ روانہ ہوئی تو میں واقعی پریشان ہو گئی تھی کہ پرشاد جی کو وہاں جا کر ضرور رانا کے بارے میں بتا دے گی۔ بینک کی رقم لوٹنے میں چونکہ رانا ملوث ہے اس لیے نیپال کی حکومت دہلی پولیس کی مدد سے ان تینوں کے ساتھ ہم تینوں کو بھی ڈاکوؤں کی مدد کے الزام میں گرفتار کر لے گی۔“ لیکن جولی کی یہ بات سن کر بھی جب رگھوپتی خاموش بیٹھا مسکراتا رہا تو وجے سے برداشت نہیں ہوا اور وہ بول پڑا۔ ”رگھوپتی تمہارا یہ اطمینان اور سکون کسی دن ہم سب کو کسی بڑی مصیبت میں ڈال دے گا۔“

”اور وجے تمہارے اندر اس بھروسے اور اطمینان کی کمی ہے۔ تمہاری یہی خامی ہمارے کام میں رکاوٹ بھی بن سکتی ہے۔“ رگھوپتی نے کہا۔ ”رہ گئی آشا کی بات تو وہ رانا کے بارے میں کسی سے کوئی فریاد نہیں کرے گی۔ کیونکہ رانا کے ساتھ اس کی ناپسندیدہ تصویریں بھی ہمارے پاس ہیں اور اس کا مطلب کیا ہوتا ہے جانتے ہو؟ یہی کہ آشا نے رانا کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی کیونکہ دونوں ایک دوسرے کو عرصے سے جانتے ہیں اور دونوں کے درمیان بہت عرصے سے ناجائز تعلقات ہیں۔ اس لیے بینک لوٹنے کے جرم میں وہ بھی برابر کی شریک ہے۔ پولیس جب رانا کو گرفتار کرے گی تو اس کے ساتھ وہ تصویریں بھی پولیس کے ہاتھ میں آجائیں گی۔ اور آشا اتنی بے وقوف بھی نہیں ہے کہ وہ یہ باتیں نہ سوچے۔“

اس کی اس ٹھوس دلیل کے آگے وجے کو کوئی دلیل نہیں سوجھی۔ ویسے بھی کچھ بولنے کا اب اس کے پاس موقع ہی نہیں تھا کیونکہ انہیں جس کا انتظار تھا وہ مہمان آپہنچا تھا۔

اسے بڑی خوشی ہوئی ہو۔ چیاگنگ نے سوپ پینے کی اور ان تینوں نے چائیز رائس کھانے کی ابتدا کر دی تھی۔ اس لیے ایک بار تھوڑی دیر کے لیے پھر خاموشی چھا گئی۔ لیکن فوراً ہی چینی نے سوپ کے چمچے کو میز پر رکھ دیا اور اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا سگریٹ لگا۔ رگھوپتی کی طرف دیکھ کر بولا ”ہاں تو اب ہمیں اس فلم کے نیگیٹو کا سودا کر لینا چاہیے۔“

”اسی لیے تو ہم ملے ہیں۔۔۔“ اتنا کہہ کر رگھوپتی نے جان بوجھ کر بات نامکمل چھوڑ دی۔

”سمجھ گیا۔“ چینی نے رگھوپتی کے انداز کے مطابق ہی کہا۔ ”مگر پہلے آپ لوگ اس فلم کے ہیرو کا نام جاننا چاہتے ہیں یہی نا؟“

”ہیرو نہیں ولن۔“ وجہ منہ کا نوالہ چباتے ہوئے بولا۔

”ہیرو ہو یا ولن۔“ جولی چینی کے بولنے سے پہلے ہی بول پڑی۔ ”اس کا نام تو ہمارا جانا ہوا ہی ہے۔“

”جانا ہوا ہے؟“ چینی نے اس طرح کترائی ہوئی نظروں سے جولی کی طرف دیکھا جیسے جولی نے اس کے ہاتھ سے لاکھ روپے کے نوٹ چھین لیے ہوں ”وہ نام کس طرح آپ کا جانا ہوا ہے مس جولی“

”مشہور تو وہ ایک ہیرو کی حیثیت سے ہے مسٹر ریگن۔“ جولی نے دوسری بازی بھی جیت لینے کے انداز میں کہا۔ ”لیکن آپ کی فلم میں اس نے ولن کا رول کیا ہے۔“

یہ سن کر چیاگنگ نے اپنا سگریٹ الیش ٹرے میں کچل دیا اور سوپ کا چمچ اٹھا لیا۔ جولی نے ٹشو پیپر اٹھایا اور اس کے کونے میں بال پین سے کچھ لکھنے لگی۔ پھر نشو بہنو کو چیاگنگ کی جانب کھسکا کر بولی۔ ”لیجے پڑھ لیجے۔ اور اب آپ کے ہاں۔۔۔ یا ناں کے جواب پر ہی نیگیٹو کے سودے کا دار و مدار ہے۔“

ٹشو پیپر پر لکھے ہوئے نام کو پڑھتے ہی چیاگنگ کے ہاتھ سے سوپ کا چمچ چھوٹ کر پلیٹ میں آگرا اور اس چمچے کے گرنے کی جو آواز ہوئی تھی اس میں جولی کو ”ہاں“ کی گونج سنائی دے گئی تھی۔

اب دونوں طرف بات کرنے کی جلدی تھی لیکن پھر بھی آدھے منٹ تک خاموشی چھائی رہی۔

”آپ لوگوں کو کل رات والی فلم کیسی لگی؟“ چیاگنگ نے اس انداز سے باز شروع کی جیسے کوئی بڑا موجد کارنامے کی تعریف سننے کے لیے بے قرار ہو۔

اگر وجہ کو اس فلم میں ذاتی دلچسپی نہ ہوتی تو وہ کہہ چکا ہوتا کہ بس دیکھ کر بھول جانے والی فلم تھی مگر وہ ایسی کوئی بات نہ کہہ سکا کیونکہ اس فلم کی یاد سے ابھی تک اس کے جسم میں کپکپاہٹ سی طاری ہو جاتی تھی۔ لیکن جولی نے تو اس کی تعریف کر کے وجہ اور رگھوپتی کو چونکا ہی دیا۔

”مسٹر ریگن۔“ اس نے چینی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”فلم کے بارے میں مجھے زیادہ معلومات تو نہیں ہیں لیکن اس فلم کو دیکھنے کے بعد اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ اس کی فلم بندی کے دوران ایک سے زیادہ کیمرے استعمال کیے گئے ہیں۔“

”کریکٹ۔“ چیاگنگ کے آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”آپ کی نظر کافی تیز ہے۔ کیمروں کے بغیر ان مناظروں میں سچائی کی بھلک نظر نہیں آسکتی تھی۔“

”لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ جولی نے پوچھا۔ ”مختلف سمتوں میں رکھے ہوئے دو کیمروں کو آپ نے تنہا کیسے آپریٹ کیا ہو گا؟“

”میں تنہا؟“ چینی چونک کر جولی کی طرف دیکھنے لگا۔ اپنی تعریف سننے کی لالچ! وہ آدھی بات تو قبول کر ہی چکا تھا کہ دو کیمروں کی مدد سے فلم بندی کی گئی تھی۔ اب اس بات کو بدلنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ جب تک ویٹر میز پر پلیٹیں رہا۔ اس وقت تک تو خاموشی رہی۔ پھر ویٹر کے جانے کے بعد چینی نے دھیرے۔ کہا۔ ”مس جولی آپ بہت سمجھدار بھی ہیں۔ خیر میں نے دونوں کیمرے اس طریقے سے رکھے تھے کہ انہیں اکیلا ہی ہینڈل کر سکوں لیکن آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ میں۔ اکیلے ہی دو کیمروں کو آپریٹ کیا ہو گا؟“

جس طرح آپ کو یہ پتا چل گیا کہ میں آسٹریلیا کی رہنے والی ہوں اسی طرح یہ جواب دے کر تو جولی نے پہلی بازی میں ہی چینی کو چت کر دیا تھا۔ اس جواب وجہ نے میز کے نیچے سے اس طرح اپنے جوتے سے جولی کا سینڈل والا پاؤں دبایا:

سے دبا کر چیاگ سے کہا۔ ”بولے پانچ لاکھ روپے لے کر صرف پانچ منٹ کی فلم بنانے کے لیے آپ تیار ہیں۔“

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے مس جولی؟“ سوپ کی پلیٹ دور ہٹاتے ہوئے چیاگ بول اٹھا۔ ”یہ کسی فلم کی شوٹنگ تو ہے نہیں کہ جب چاہا پروگرام بنا کر کیمرہ اشارت کر دیا؟ آئندہ ماہ تو ہمارے ہیرو کی تاج پوشی کا جشن ہونے والا ہے اور ابھی سے پورے ملک میں اس کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔“

”ہمیں اس جشن سے پہلے ہی یہ کام ختم کرنا ہے مسٹر ریگن۔“ رگھوپتی کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ جولی کی تائید میں بولا۔ ”اگر تمہیں پانچ لاکھ کا پلان منظور ہے تو ہمیں بھی دس لاکھ کا نیگیٹو خریدنے میں دلچسپی ہے۔“

چیاگ نے اس طرح اپنا سر ہلایا جیسے وہ بڑی الجھن میں پڑ گیا ہو۔ پھر یکایک اس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک سنہرے رنگ کا سگریٹ کیس نکالا پھر جب اس نے سگریٹ سٹکا کر اس کا پہلا کش لیا تو اس کے دھوئیں کی عجیب بو سے تینوں سمجھ گئے کہ چیاگ جس کا سگریٹ پی رہا ہے۔

”پہلے تو آپ نے اس نقاب پوش کا نام معلوم کرنے کے بعد فلم کا نیگیٹو خریدنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔“ چیاگ سگریٹ کا دوسرا کش لے کر اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے بولا ”اور اب کہہ رہے ہیں کہ ایک دوسرا کلزا شوٹ کر دوں تو پھر سودا ہو گا۔ اس طرح بار بار بات بدلنا مجھے پسند نہیں ہے۔“

”لیکن بدلنے کی قیمت بھی تو چکا رہے ہیں۔“ جوش میں آکر رگھوپتی نے دلیل پیش کی لیکن پھر فوراً ہی اپنے لمبے نری پیدا کر کے بولا ”مسٹر ریگن آپ کو ہماری اتنی مدد تو کرنی ہی چاہیے۔“

”ہوں۔“ چیاگ نے سوچنے کے انداز میں منہ میں زبان پھیری۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد بولا ”کل والی فلم کے آخری سین کو فلمائے ہوئے ابھی صرف ایک مینا ہی ہوا ہے۔ اس لیے اتنی جلدی دوسرا پروگرام کیسے ترتیب کیا جا سکتا ہے؟ اس کے علاوہ ہیرو کے بچے میں کوئی شکار بھی تو پھنسا چاہیے نا؟“

”شکار پھنسنے کا انتظام ہم کر دیں تو؟“ جولی کا یہ مشورہ سن کر وجے کانپ اٹھا

چیاگ نے یوراج چندر بھوشن کے نام والے کانڈ کو دھیرے دھیرے پھاڑ ڈالا۔ پھر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا اور ٹھہرے ٹھہرے لمبے میں بولا۔ ”مس جولی جس نام کو اپنی زبان پر لانے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی اس نام کو کانڈ پر لکھنے کی ہمت آپ نے دکھائی ہے۔“

یہ سن کر رگھوپتی اور وجے اچھل پڑے۔ جولی نے جو اندازہ لگایا تھا وہ درست نکلا تھا۔

”اس کا مطلب تو یہ ہوا مس جولی کہ نام بتانے کی فیس جو ایک لاکھ روپے تھی وہ میں کھوپچا ہوں۔“ چینی تھکی تھکی سی آواز میں بولا۔

”لیکن ہاں کہنے کی پچاس ہزار فیس تو ہمیں دینی ہی پڑے گی؟“ رگھوپتی نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”ہم ایسے لوگوں میں سے نہیں ہیں جو سودے میں بے ایمانی کرتے ہیں۔“

”یعنی آدھا لاکھ۔“ چینی نے رقم گنتے ہوئے کہا۔ ”اور دس لاکھ فلم کے نیگیٹو کے دونوں ملا کر ساڑھے دس لاکھ ہو گئے۔ اس لیے اپنی بات پکی ہو گئی۔“

”نہیں مسٹر ریگن۔“ جولی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”دوسرے بھی پانچ لاکھ روپے آپ کے نصیب میں لکھے ہوئے ہیں۔“

اب چیاگ کے ساتھ ساتھ وجے اور رگھوپتی بھی اچھل پڑے۔ جولی باتوں باتوں میں بہت آگے نکلتی جا رہی تھی۔ اور ان میں سے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کرنا کیا چاہتی ہے؟ وہ تینوں تجسس بھری نظروں سے جولی کو دیکھ رہے تھے اور جولی بڑے پراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”مسٹر ریگن۔ ابھی آپ کو ایک اور لڑکی کی ایسی ہی فلم بنانی ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ یہ بات کہی تو چیاگ نے ہی تھی لیکن یہ بات تو وجے اور رگھوپتی کی سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد چیاگ نے آگے کہا۔ ”مس جولی آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ایک اور لڑکی کا ایسا ہی واقعہ مجھے قلبند کرنا ہو گا؟“

”ہاں... اب آپ ٹھیک سمجھ۔“ جولی نے میز کے نیچے وجے کا پاؤں اپنے پاؤں

جوش میں آکر جواب دیا لیکن رگھوپتی کو ان کا اس طرح اونچی آواز میں بولنا اچھا نہیں لگا۔ اس لیے وہ بولا۔ ”تم لوگوں کو کچھ ہوش بھی ہے؟ یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟“

رگھوپتی کی اتنی سی بات سن کر ہی جولی سمجھ گئی کہ بولتے بولتے اس کی آواز بھی سمجھ اونچی ہو گئی تھی جو ان سب کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی لیکن پھر بھی اس نے سوری کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور مسکراتی نظروں سے چیانگ کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”آپ ہی کیسے مسٹر ریگن اگر شادی سے پہلے یہ شخص مجھ پر اتنا رعب جاتا ہے تو پھر شادی کے بعد کیا کرے گا“

”اگر آپ مجھ سے پوچھتی ہیں تو بتاتا ہوں۔“ چیانگ نے ہنس کر اپنے سونے کے دانت دکھا دیے پھر آگے کہا۔ ”عورت اور مرد کو بھگڑتے دیکھنے میں بھی مزہ آتا ہے لیکن اس وقت ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ یہ پروگرام ہم پھر کبھی کر لیں گے۔“

اتنا کہہ کر اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا تو ان تینوں نے اس کی بے چینی کو محسوس کر لیا اور رگھوپتی نے اس کا دھیان گھڑی سے ہٹانے کی کوشش میں جلدی سے کہا۔ ”ہم معاملہ طے کر کے ہی اٹھیں گے۔ آپ کے ساڑھے پندرہ لاکھ پکے۔“

”لیکن ایڈوانس میں پانچ لاکھ لوں گا۔“ چیانگ نے کہا۔

”پانچ نہیں۔“ رگھوپتی بولا۔ ”دس فیصد کے حساب سے ڈیڑھ لاکھ۔ دس روز کے اندر۔۔۔ اور بقیہ رقم کھٹنڈو پہنچ کر۔۔۔“

چیانگ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا ”رقم پہلے طے یا بعد میں لیکن ساری رقم آپ کو دہلی میں ادا کرنی ہوگی۔“

”کس کو؟“ رگھوپتی نے پوچھا۔

”نام اور پتا میں بعد میں بتاؤں گا۔“

”ہمیں منظور ہے“ کہہ کر رگھوپتی نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا لیکن چیانگ ہاتھ ملانے سے پہلے ایک اور بات طے کر لینا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ ذرا آگے جھک کر رگھوپتی سے بولا۔ ”کھٹنڈو پہنچنے کے بعد اگر فلم بنانے کا موقع آپ لوگ نہ پیدا کر سکے

اس کا چہرہ غصے میں تنگ ہو گیا۔ وہ جولی پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرنا چاہتا تھا کہ جولی نے اس کے ارادے کو بھانپ لیا اور فوراً ہی اپنا پیر اس کے پیر پر رکھ کر اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ رگھوپتی کو بھی جولی کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن پھر بھی وہ جواب کے لیے چیانگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جولی کو گھور رہی تھیں۔

”آپ بہت گہرے پانی میں اترنے کی کوشش کر رہی ہیں مس جولی۔“ چیانگ نے بڑے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ”اپنے بچے میں پھنسے ہوئے شکار کو نرپا نرپا کر کھانے میں اس ہیرو کو بڑا مزہ آتا ہے۔ اور پھر اس لڑکی کا درد آپ زندگی بھر بھول نہیں سکیں گی مس جولی۔“

”مجھے خود کہاں وہ درد برداشت کرنا ہے؟“ جولی نے جلدی سے کہہ ڈالا۔

”جس طرح آپ کو پانچ لاکھ میں تیار کریں گے اسی طرح پچاس ہزار میں کسی لڑکی کو تیار کر لیں گے۔“

”چپ ہو جاؤ جولی۔“ میز پر زور سے ہاتھ مار کر وجے غصے میں بولا۔ ”بند کرو ایسی ذلیل سودے بازی کو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تمہیں ایسا بے ہودہ خیال کیسے آگیا؟“

کوئی اور موقع ہوتا تو وجے کے غصے میں سرخ چہرے کو دیکھ کر جولی گھبرا جاتی۔ لیکن اس موقع پر تو وہ پوری تیاری کر کے ہی آئی تھی۔ اس لیے وہ بڑے ہی بھاری اور سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ”میرے ذہن میں اس خیال کی جنم دینے والی وہ فلم ہے جو کل رات ہم نے دیکھی تھی۔ ذرا یہ تو سوچو کہ پورے چھ سال تک بے چاری روکھی نے کیسے کیسے درد سے ہوں گے؟ اس عرصے میں نہ جانے کتنے مردوں نے اس کے نرم و نازک جسم کو کچلا ہو گا؟ جس جنم کی آگ میں وہ جل چکی ہے اس کا تصور بھی تم مرد لوگ نہیں کر سکتے۔“

”اور اس کے باوجود تم ایک اور معصوم لڑکی کو اس دوزخ میں دھکیلنا چاہتی ہو؟“ وجے غراہٹ بھری آواز میں بولا۔

”ہاں۔ کیونکہ دوزخ کے بچے بغیر دوزخ کو تباہ نہیں کیا جاسکتا۔“ جولی نے

جولی کی یہ بات سن کر ایک لمحے کے لیے چیانگ کو اس پر شک سا ہونے لگا۔ لیکن پھر جولی کا بھولا بھالا چہرہ دیکھ کر اس کا سارا شک دور ہو گیا۔ اور وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ”اس کے بچے میں پھنس جانے والی مجبور اور بے بس لڑکی ایسی ہمت ہی کیسے کر سکتی ہے؟ لیکن ہاں ایک لڑکی نے اپنی عزت بچانے اور اس پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔۔۔“ چیانگ اتنا کہہ کر رک گیا۔ تب جولی کا جی چاہا کہ وہ اس سے پوچھے کہ وہ لڑکی کون تھی اور اس نے کس طرح اس درندے کا مقابلہ کیا تھا؟ لیکن اس نے پوچھنے کی بجائے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ چیانگ چند لمحوں تک کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر بولا۔ ”بھری ہوئی اس لڑکی کو جب اس نقاب پوش نے اپنے دونوں بازوؤں میں دلوچا تو اس لڑکی نے ہمت کر کے اپنے دونوں ہاتھ کے انگوٹھے اس کے آنکھوں والے سوراخ میں گھسا دیے۔ اس طرح اس بے چاری نے اس کے آنکھیں پھوڑ ڈالنے کی کوشش تو کی تھی لیکن چہرے کا نقاب پھاڑنے کے سوا وہ کچھ نہ کر سکی۔ اور اس کے بدلے میں اس بے چاری کو بڑی خطرناک اور بہت ہی سخت سزا ملی وہ سزا ایسی بھیانک تھی کہ مجبوراً ہمیں اس لڑکی اور اس کی دی جانے والی سزا کے فلمائے ہوئے منظر کو اپنی قلم سے نکال دینا پڑا۔“

”اوہ۔۔۔“ جولی نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا۔

”مس جولی۔۔۔ آپ جس لڑکی کو تیار کریں گی اسے ایسی کوئی حرکت کرنے کی اجازت مت دیجئے گا۔“ چیانگ نے جانے کے لیے قدم بڑھاتے ہوئے اسے ایک آخری تاکید کی ”اپنی شیطانی خواہش کی تکمیل کے لیے وہ شیطان عورتوں کو بڑے عجیب عجیب طریقے سے اذیت دیتا ہے۔“

”تھینک یو مسٹر ریگن۔“ جولی نے دھیرے سے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنا پرس کھول کر کانفد کے پرزے اس میں ڈال کر واپس آگئی اور چیانگ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ جب جولی وجے اور رگھوپتی کی طرف واپس آ رہی تھی تو اس وقت وہ دونوں اپنی آوازوں کو دبائے ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔ وجے رگھوپتی سے پوچھ رہا تھا۔ ”اگر تم اور جولی کوئی خطرناک کھیل کھیلنے کا ارادہ رکھتے ہو تو مجھے اپنے اس کھیل میں شامل مت کرنا۔“

تو بھی ساڑھے پندرہ لاکھ کی طے شدہ رقم آپ کو ادا کرنی پڑے گی۔ اور اس میں کم قسم کی آٹا کافی نہیں چلے گی۔ ”کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔“ ”بولو منظور ہے؟“ ”منظور ہے“ رگھوپتی نے بھی اٹھ کر جواب دیا۔

اس کا جواب سن کر چیانگ نے اس طرح اپنا ہاتھ بڑھایا جیسے وہ ساڑھے پندرہ لاکھ کی رقم وصول کر رہا ہو۔ اس نے رگھوپتی کا ہاتھ اپنے دونوں نرم نرم ہاتھوں میں لے لیا اور پوچھا۔ ”پہلی قسط دس روز میں تو مل جائے گی نا؟“ ”شاید ہفتے بھر میں ہی مل جائے۔“ رگھوپتی مسکرا کر بولا۔

”تب تو مجھے آپ لوگوں کا کام کرنے میں بہت مزہ آئے گا۔“ کہہ کر چیانگ نے باری باری وجے اور جولی کے سامنے گردن جھکائی اور قدم اٹھاتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”اب مجھے سیدھے سینما ہال میں جا کر اس لیڈی کے پہلو میں بیٹھ جانا ہے۔“ وجے اور رگھوپتی اسے جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ لیکن جولی اس طرح دروازے کی طرف بڑھتے چیانگ کے پاس دوڑ گئی جیسے اسے اچانک کوئی بات یاد آگئی ہو۔ ”ایک منٹ مسٹر ریگن۔۔۔“ وہ بولی۔

”پھر کیا یاد آگیا مس جولی۔“ چیانگ نے پلٹ کر پوچھا۔

”وہ کانفد جس پر قلم کے ہیرو کا نام لکھا تھا میں نے۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”کانفد کا وہ کلزا آپ کی جیب میں ہی رہ گیا ہے۔“

چیانگ ایک لمحے تک جولی کو دیکھتا رہا۔ پھر اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بولا۔ ”آپ نے اگر مانگا نہ بھی ہوتا تو بھی میں اسے کسی کے ہاتھ میں جانے کے لالچ ہی نہ رکھتا۔“ اتنا کہہ کر اس نے کوٹ کی جیب سے مٹھی بھر کر کانفد کے پرزے نکالے اور جولی کے دونوں ہاتھوں میں ڈال دیے پھر دھیرے سے پوچھا۔ ”اب تو سکون ہو آپ کو؟“

”اب لگے ہاتھوں ایک اور بات بھی پوچھ لوں۔۔۔“ اصل میں وہ کانفد واپس لے کے بہانے یہی بات پوچھنے آئی تھی۔ ”اس نقاب پوش نے آج تک اتنی لڑکیوں کی عزت لوٹی ہے کیا ان میں سے کوئی ایسی لڑکی نہیں تھی جو اس کے سامنے مزاحمت کے اسے نقصان پہنچاتی؟“



دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں چکا چوندہ ہو جائیں گی۔ اور کھیل ختم ہو جائے گا۔  
 ”نہیں وجے... کھیل اسی وقت شروع ہو گا۔“ رگھوپتی نے آگے جھک کر راجا  
 دارانہ لہجے میں کہا۔ ”مرحوم مہاراجا کے جانشین کے روپ میں اپنے ہونے والے راجا  
 کے کالے کرتوتوں کی فلم دیکھ کر نیپال کی عوام میں کھلبلاہٹ مچ جائے گی۔ لوگ چیخ  
 پڑیں گے۔ چنانچہ سے خریدے ہوئے فلم کے نیگیٹو سے ہم دو سو پرنٹ تیار کرا کر  
 ایک ہی وقت میں ان دو سو پروجیکٹروں کے ذریعے پورے ملک میں وہ فلم دکھا دیں  
 گے۔“

”اور فلم کے آخری منظر میں جب اس کے چہرے سے نقاب اتر جائے گا تو  
 دیوتا کی طرح پوجا جانے والا درندہ اپنے عوام کے سامنے نکلا ہو جائے گا۔“ بولتے وقت  
 جولی کی آنکھوں میں انتقام کی آگ برسنے لگی تھی۔ ”بدلہ لینے کے لیے اس سے اچھا  
 موقع اور کب ملے گا؟“

”اور فرض کر لو کہ یوراج کے چہرے سے نقاب نہ ہٹایا جاسکا تو؟“ وجے نے  
 پوچھا۔

”تو...“ جولی نے وجے کی طرف دیکھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سوچ کر کچھ کہتی  
 رگھوپتی بول پڑا ”تو بھی ہم نے جو فلم دیکھی ہے وہ ہم عوام کو دکھا کر یہ ظاہر کریں گے  
 کہ یہ شیطان کوئی اور نہیں بلکہ نیپال کا ہونے والا راجا چندر بھوشن ہے۔“

”یہ بھی مان لیتے ہیں کہ اس سے لوگوں میں بے چینی کی کیفیت پھیل جائے  
 گی۔“ وجے نے ایک اور خدشے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”ایسے میں نیپال کی فوج  
 خاموش بیٹھی رہے گی؟ بغاوت کو روکنے کے لیے وہ حکومت کی طرف سے میدان میں  
 آجائے گی اور مجبور عوام پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔ یہ بھی سوچا ہے کہ جب  
 فوج اور عوام آمنے سامنے آجائیں تو ہزاروں جانیں جاتی ہیں؟ نہیں رگھوپتی ہمیں اپنا  
 ذاتی انتقام لینے کے لیے غریب اور بے بس لوگوں کی قربانی نہیں دینی چاہیے۔“

”لیکن وجے اب یہ ہمارا ذاتی انتقام نہیں رہا۔“ رگھوپتی جوش میں آکر بولا۔  
 اس نے صرف تمہاری بہن کی ہی نہیں اپنی رعایا کی بہو بیٹیوں کی بھی عزت لوٹی ہے  
 یہ تو ایک عوامی بغاوت ہو گی۔ چین میں ماوزے تنگ نے بددق کی...“

روکھی کا بدلہ لینے کے لیے میں اور جولی اپنی جان کی قربانی دینے سے بھی دریغ  
 نہیں کریں گے وجے۔“

رگھوپتی نے جذباتی لہجے میں کہا۔ وجے اسے جواب دینے کے بارے میں سوچ ہی رہا  
 تھا کہ جولی پر اس کی نظر پڑ گئی جو اپنی کرسی پر آکر بیٹھ چکی تھی۔ وجے نے اس کی  
 طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم بھی سن لو جولی آئندہ سے کوئی بھی بات تم ہم تینوں کے  
 مشورے کے بغیر کسی چوتھے آدمی کے سامنے نہیں لاؤ گی۔“

”مجھے منظور ہے۔“ جولی نے دھیرے سے کہا ”میں آئندہ ایسا ہی کروں گی۔  
 لیکن تم بھی آئندہ یہ مت کہنا کہ اس معاملے سے تم الگ رہو گے۔ وجے تم اتنا تو  
 سوچو کہ دس لاکھ میں فلم کے ایک ٹیکٹو کا ٹکڑا خرید کر ہم کرنا کیا چاہتے ہیں؟ اس  
 نقاب پوش کو بے نقاب کرنے کے لیے وہ فلم ادھوری ہے۔ اسی لیے میں نے ایک  
 دوسری لڑکی کے منظر کی فلمبندی کا مشورہ دیا تھا۔“

”لیکن اس لڑکی کے ذریعے تم اس درندے کو کیسے بے نقاب کرو گی؟“ وجے  
 نے پوچھا۔

”اس کے چہرے کا نقاب چیر کر اسے...“ جولی نے کہا۔  
 ”ہوں...“ وجے کی گردن اچانک اونچی ہو گئی۔ وہ جولی کی طرف ٹاکتا رہا اور دل  
 ہی دل میں سوچتا رہا کہ یہ غیر ملکی لڑکی اس حد تک بھی سوچ سکتی ہے؟“

”ویری گڈ آئیڈیا۔“ جولی کو داد دیتا ہوا رگھوپتی بول اٹھا۔ ”وجے ہم بالکل صحیح  
 راستے پر جا رہے ہیں۔ درندے کو اس کے انجام تک پہنچانے میں دیوتا بھی ہماری مدد  
 کر رہے ہیں۔ صبح کو ہری پرشاد نے کھٹمنڈو سے ٹرک کال پر جو باتیں کہی تھیں ان کی  
 اہمیت کا اندازہ اس وقت میں نہیں لگا سکا تھا۔ اصل میں یوراج چندر بھوشن کی رم  
 تاجپوشی کے جشن کی تیاریوں میں ہمارے کام کی بھی ابتدا ہونے والی ہے۔ ایک ہفتے  
 کے جشن کے درمیان ایک رات پورے نیپال میں دو سو پروجیکٹر کے ذریعے مردم  
 مہاراجا کے جانشین کی فلم عوام کو دکھائی جائے گی۔“

”تو اس میں ہمارے کام کی کیا بات ہے؟“ وجے رگھوپتی کی بات کو نہیں سمجھا  
 تھا اس لیے اس نے منہ بنا کر کہا۔ مرحوم مہاراجا کے جانشین کی گدی نشینی کی رم

”بس ایک کام پڑ گیا ہے تم سے۔“

”تمہیں؟ مجھ سے کہا؟“ دوسری طرف سے شوبھا نے مذاق کے لہجے میں کہا۔

”کیوں کیا تمہارے سفارت خانے کے کسی آدمی کو تباہ کرنا ہے؟“

”نہیں شوبھا... تمہیں میرے ساتھ چند دنوں کے لیے نیپال چلنا ہو گا۔“ جولی

نے کہا۔

”نیپال؟“ شوبھا کی آواز میں حیرت کے ساتھ ساتھ خوف کی جھلک بھی تھی۔

”وہاں بھلا میرا کیا کام ہے؟“

”یہ میں فون پر نہیں بتاؤں گی۔“ جولی نے رگھوپتی اور وجے پر ایک نظر ڈال کر

کہا۔ ”ہاں تقریباً پندرہ دن ٹھہرنا پڑے گا۔“

”پندرہ دن؟“ شوبھا نے چونک کر کہا۔ ”یعنی آدھا مہینا؟“

شوبھا کی گھبراہٹ کو محسوس کر کے جولی نے سوچا کہ وہ شوبھا کو بتا دے کہ اس

آدھے مہینے کا معاوضہ اس کی کمائی سے بھی دس بیس گنا زیادہ ہو گا لیکن پھر اس نے

سوچ کر اپنا ارادہ بدل دیا کہ جو عورت ہاتھ میں آئے ہوئے لاکھ روپے واپس کر گئی ہو

اس کے جذبات کی قیمت اس طرح نہیں لگائی جاسکتی۔

”تم چپ کیوں ہو گئیں جولی۔“ شوبھا نے ہی دوسری طرف سے کہا۔ ”میں نے

کافی دنوں سے چھٹیاں نہیں کی ہیں۔ اس بہانے پندرہ دن تمہارے ساتھ نیپال میں

رہنے کا مزہ آئے گا؟“ لیکن آج کل میں ہی جانے کا ارادہ ہے تو پھر یہ ممکن نہیں ہو

گا؟“

”آج کل میں نہیں شوبھا۔“ جولی دل ہی دل میں خوش ہو کر بولی۔ ”دس روز

بعد جانے کا پروگرام ہے۔ تم آؤ گی تو ہم پر یہ تمہارا بہت بڑا احسان ہو گا۔“

”ہم سے کیا مراد ہے تمہاری؟“ شوبھا نے پوچھا۔ ”یہ بھی بتا دو کہ تمہارے سوا اور

کس پر میرا احسان ہونے والا ہے؟“

”ہم سے مراد ہے وجے، رگھوپتی میں اور روکی۔ ہم سب پر۔“ جولی نے بتایا۔

”تب تو میں ضرور آؤں گی۔“ شوبھا کی آواز میں سنجیدگی کی جھلک تھی۔ ”لیکن

میں کسی پر کوئی احسان نہیں کروں گی۔ بلکہ جو کام ہو گا اسے اپنا کام سمجھ کر کر دوں گی۔“

آگ پیدا کی تھی۔ اور بھارت کے ماتما گاندھی نے ستیہ گرہ کو اپنا ہتھیار بنایا تھا۔

اس طرح نیپال بھی ظلم کے خلاف بغاوت کرے گا۔“

رگھوپتی کی یہ باتیں سن کر وجے بڑی گھمبیر نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

اس وقت اس کے دل میں خود اس کی آواز ہی گونج رہی تھی۔ ”تمہاری قربانی رائیگاں

نہیں جائے گی میری لاڈلی بہن۔ تمہاری چٹاکی آگ بغاوت کی مشعل بن کر جلتی دکھائی

دے رہی ہے روکی۔ ظلم اور جبر کا یہ تاریک دور ضرور ختم ہو کر رہے گا۔“



”یہ آتے ہی کس کو فون کرنے بیٹھ گئیں جولی؟“ وجے نے پوچھا تو جولی کو خیال

آگیا کہ چانینیز ریسٹورنٹ میں ان تینوں نے یہ طے کیا تھا کہ آئندہ کوئی بھی قدم تینوں

کے مشورے کے بغیر کوئی نہیں اٹھائے گا۔ اور وہ اس وقت وجے اور رگھوپتی سے

پوچھے بغیر ہی آگے قدم اٹھانے لگی ہے۔ لیکن اس نے جو نمبر ملایا تھا وہ لگ چکا تھا۔

اس لیے وجے کو کچھ بتانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ دوسری طرف سے جب اسے ایک

جانی پہچانی آواز سنائی دی تو اسے کہنا پڑا۔ ”ہیلو... کون شوبھا؟“

شوبھا کا نام سن کر شاید وجے اور رگھوپتی اس کی وجہ سمجھ چکے تھے۔ اس لیے

وہ چپ بیٹھے تقریبی نگاہوں سے جولی کو دیکھتے رہے، جو ریسپور کان سے لگائے۔ دوسری

جانب کی بات سن رہی تھی! ”جولی تمہاری آواز سن کر بڑی حیرت ہو رہی ہے۔“

دوسری طرف سے شوبھا کہہ رہی تھی۔ ”اس وقت تو میرے پاس میرے مرد گاہکوں

کے فون آتے ہیں۔“

”میرا خیال تھا کہ تم اس وقت فون پر نہیں ملو گی۔“ جولی جلدی جلدی اسے اپنا

کام بتا دینا چاہتی تھی لیکن پھر بھی اس نے صبر سے کام لیتے ہوئے کہا ”کیا میں نے غلط

وقت پر فون کر دیا ہے؟“

”نہیں نہیں۔ تم نے بالکل صحیح وقت پر فون کیا ہے جولی۔“ شوبھا نے جواب

دیا۔ ”میں چھٹی پر ہوں اور مہینا وار چھٹی کا آج دوسرا روز ہے۔ اب تم بتاؤ کیا

ضرورت پیش آگئی میری؟“

”میرا نام؟“ وجے اچھل پڑا۔ ”ایسی بے وقوفی بھی کی جاتی ہے؟“  
 ”گوپی بھی یہی کہہ رہا تھا۔“ رگھوپتی نے کہا۔ ”باتوں باتوں میں پولیس کو کوئی  
 اور شک ہو گیا تو کسی بھی وقت ہم سب بھی اندر پہنچا دیے جائیں گے۔“  
 ”گوپی اور رانا کہاں ہیں؟“ وجے نے پوچھا۔

”کنٹ پیلس پولیس چوکی کے پاس چکر لگا رہے ہیں۔ گوپی کہہ رہا تھا کہ وہ اس  
 پوزیشن میں نہیں ہیں کہ پولیس کے سامنے جاسکیں۔“ رگھوپتی نے کہا۔ ”اس نے یہ  
 بھی بتایا ہے کہ وہ آدھے گھنٹے سے فون کر رہا تھا۔ لیکن لائن انکمیج مل رہی تھی اب  
 کل اتوار ہے۔ اور پیر کے دن بھی اس کی ضمانت نہیں ہوگی۔“ اتنا کہہ کر وہ اٹھا اور  
 آگے بولا۔ ”چلو وجے۔ ہم وہاں جا کر کوئی راستہ سوچتے ہیں۔“  
 ”اور میں؟“ جولی پوچھ بیٹھی۔ ”مجھے یہاں اکیلے چھوڑ کر جاؤ گے؟“  
 ”تمہارا وہاں کوئی کام نہیں ہے۔“ وجے بول اٹھا۔ ”کیا خبر ہم کب واپس  
 آئیں؟“

”میرے بغیر تم لوگوں کا کام نہیں بنے گا؟“ جولی نے کمپیوٹر جیسی تیزی سے  
 سوچ کر جواب دیا۔ ”مجھے تیار ہونے کے لیے صرف پانچ منٹ دینے ہوں گے۔  
 پانچ منٹ کی بجائے جولی ساڑھے چار منٹ میں ہی تیار ہو گئی تھی لیکن اسے  
 دیکھ کر وہ دونوں بری طرح سے چونک پڑے تھے۔  
 ”جولی یہ تم نے فرکٹ اور بھڑکیلا فراک کیوں پہنا ہے؟“ وجے نے کہا۔ ”ہم  
 لوگ کسی پارٹی میں تو نہیں جا رہے ہیں۔“

”مگر جولی وجے کی بات سن کر ہنس پڑی اور ہنستے ہوئے بولی۔ ”اپنے وجے کمار کو  
 پولیس چوکی سے چھڑا کر لانے کے لیے ایسا گٹ اپ ضروری ہے۔“  
 ”اس کا مطلب ہے کہ تم۔“ رگھوپتی اپنی بات مکمل نہیں کر سکا تھا کہ جولی بول  
 پڑی۔ ”ہاں اگر وجے کو اعتراض نہ ہو تو میں گرفتار ہو جانے والے وجے کمار کی منگیتر  
 بن کر وہاں جانا چاہتی ہوں۔“ اتنا کہہ کر جولی نے ان دونوں کے ہاتھ اپنے دونوں  
 ہاتھوں میں تھام لیے اور چل پڑی۔ اس کا یہ پر اعتماد انداز دیکھ کر وہ دونوں ایک لفظ  
 بھی نہیں بول سکے۔

”بولتے بولتے یکایک اس کی آواز بھر گئی اور وہ جذباتی ہو کر بولی۔ ”اگر تم لوگ مجھے  
 اپنا سمجھتے ہو۔ تو۔“  
 ”تھینک یو شوہا۔“ اس کے جذبات سے متاثر ہو کر جولی نے ریسیور رکھنے کا  
 ارادہ کیا ہی تھا کہ اسے یاد آگیا۔ ”شاید دو چار روز کے لیے میں دہلی سے باہر جاؤں  
 گی۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد میں تم سے رو برو ملوں گی۔“  
 ”کوئی بات نہیں۔“ شوہا نے کہا۔ ”مجھے بھی ان چار پانچ دنوں میں ایک  
 ضروری کام انجام دینا ہے۔“ کہہ کر شوہا نے جلدی سے فون بند کر دیا۔ اس نے گڑ  
 بائے یا گڈ ٹائٹ کہنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ جولی کو اس پر ذرا حیرت  
 بھی ہوئی تھی پھر وہ ریسیور رکھ کر وجے اور رگھوپتی کو کچھ بتانے کے لیے ان کی طرف  
 بڑھ ہی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

”اس وقت کس کا فون ہو گا؟“ رگھوپتی اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں دیکھتا ہوں۔“  
 ”کون گوپی ناتھ؟“ اس نے ریسیور کان سے لگا کر کہا۔ ”بولو کیا بات ہے؟“  
 ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو گوپی؟“ رگھوپتی کے چہرے کی گھبراہٹ اور اس کی آواز  
 کی کپکپاہٹ نے وجے اور جولی کو الجھن میں ڈال دیا۔ لیکن فون پر ہونے والی گفتگو  
 کے مکمل ہونے تک انہیں صبر کرنا پڑا۔ ریسیور رکھنے کے بعد رگھوپتی تیزی سے ان کی  
 طرف گھوما اور تیز تیز سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”رانا کی طرح آج شہر نے بھی ایک  
 مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ سالے کو جیب میں گھونسنے کا جی چاہ رہا تھا لیکن راستے میں  
 جیب کی بندھی ڈاؤن ہو گئی اس لیے جناب کو بغیر لائٹ کے جیب چلانے کے الزام  
 میں پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔“

”لیکن یہ کوئی بہت بڑا جرم تو نہیں ہے۔“ جولی نے جلدی سے کہا۔ ”جرا  
 ادا کر کے تو چھوٹ سکتا ہے۔“

وہ چھوٹا جرم کر کے بڑے جرم میں پھنس گیا ہے۔“ رگھوپتی نے کہا۔ ”ا  
 کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی نہیں ہے۔ پولیس چوکی میں جا کر اپنا غلط نام بتانے  
 بجائے اس نے تمہارا نام لیا ہے۔ اس نے پولیس کو بتایا ہے کہ اس کا نام وجے ک  
 آریہ ہے۔“

سے شہر کو سمجھایا کہ وہ ایکٹنگ کر رہی ہے۔

”وجہ ڈیر میں نے تم سے اہمبسی کی کار استعمال کرنے کے لیے کہا تھا لیکن تم میری بات نہیں مانے اور اپنے دوست کی ٹوٹی پھوٹی جیب میں بیٹھ کر پارٹی میں آنے کی ضد کی تھی۔ اب تم ہی بتاؤ میرا کیا ہو گا؟ تمہارے بغیر میں دوستوں اور دوسرے لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گی؟“ کہتے کہتے وہ رونے لگی اور پھر روتے ہوئے انپکٹر کی جانب مڑ کر بولی۔ ”سر اگر آپ اسے لاک اپ میں بند رکھنا چاہتے ہیں تو مجھے اس کے ساتھ بند کر دیں۔“

”دیکھیے مس اینڈرسن۔“ ایڈینیٹ کارڈ میں لکھے ہوئے اس کے نام کو پڑھ کر انپکٹر نے اسے سمجھایا۔ ”آپ نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اس لیے۔“

”میں نے جرم کیا ہے سر۔“ جولی نے سسکیاں لیتے ہوئے درمیان میں ہی انپکٹر کی بات کاٹ دی ”میں نے وجہ کمار سے محبت کر کے ایک بہت بڑا جرم کیا ہے سر۔ میں ایک غیر ملکی لڑکی ہوں۔ اس کے پیار میں میں نے اپنا وطن چھوڑا ہے اور اب میں اس سے شادی کرنے کے بعد اپنا مذہب بھی چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ میرا جرم نہیں ہے تو آپ اسے اور کیا کہیں گے سر؟“

”ڈارلنگ تم ذرا حوصلہ رکھو۔“ پیچھے سے آکر شہر نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر تسلی دینے کی کوشش کی تو جولی سسک سسک کر روتی ہوئی کرسی پر گر پڑی اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر بڑبڑانے لگی۔ ”آہ اب میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں ہوں۔ میں سب کو کیا جواب دوں گی کہ دولہا کہاں غائب ہو گیا تھا؟“

”انپکٹر بڑی ہمدردانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ بولا پلیز آپ رونا بند کر دیں۔“ اس نے جولی کا کارڈ اسے واپس کرتے ہوئے آگے کیا۔

”کل آپ کی شادی ہے نا؟“

جولی نے اپنا رونا جاری رکھا اور صرف سر ہلا کر انپکٹر کے سوال کا جواب دے دیا۔

”کہاں ہے صاحب؟ کہاں ہے میرا وجہ ڈارلنگ؟“ پولیس چوکی میں آکر انپکٹر کی میز کے سامنے کھڑی ہو کر جولی ہانپتی کانپتی آواز میں انگریزی میں بول رہی تھی۔ ”انپکٹر یہ کتنی بڑی رنجیدی ہے۔“

انپکٹر دو چار لمحے تک تو اسے دیکھتا ہی رہا۔ اس کا قیمتی فرکوٹ خوبصورت چہرہ نیلی آنکھیں اور دلکش ہونٹ.... دیکھتے دیکھتے وہ یکایک چونک کر سیدھا بیٹھ گیا اور بولا۔ ”آپ شاید اس کے بارے میں پوچھ رہی ہیں جسے بغیر لائسنس اور بغیر لائٹ کے گاڑی چلانے کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے؟“

”ہاں سر وہی تو ہے میرا وجہ“ کہہ کر اس نے پرس میں سے شناختی کارڈ نکال کر انپکٹر کے سامنے رکھ دیا اور بولی ”دیکھیے سر آسٹریلین اہمبسی کا میرا یہ کارڈ۔ کل تو میری وجہ سے شادی ہونے والی ہے۔ اور سر اس خوشی میں اس وقت اکبر ہوٹل میں ایک پارٹی ہونے والی ہے۔ سب مہمان ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اگر اس پارٹی میں میرا وجہ نہیں ہو گا تو لوگ کیا کہیں گے؟ آدھے گھنٹے بعد تو خود سفارت کار صاحب پارٹی میں پہنچ جائیں گے۔“

اس کی عاجزی سن کر انپکٹر کی پلکیں جھک گئیں۔ اور اس نے سپاہی کی طرف دیکھ کر اسے ملزم کو پیش کرنے کا حکم دیا۔ پھر جولی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے آپ اس سے مل سکتی ہیں۔“ یہ سن کر جولی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اداکاری کرتے کرتے وہ بچ بچ جذباتی ہو گئی تھی۔ اور پھر اسے اس بات کا بھی ڈر تھا کہ کہیں شہر اس کے سامنے آکر کوئی الٹی سیدھی بات نہ کر دے کہیں شہر خود کو اس کا منگیتر ثابت نہ کر سکا تو پولیس اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟“

سپاہی کے ساتھ جیسے ہی شہر داخل ہوا کہ جولی نے دوڑ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور ”اوہ مائی ڈیر.... اوہ مائی ڈارلنگ۔“ کہتی ہوئی اسے دیوار کی جانب لے گئی اور انپکٹر کی طرف پیٹھ کر کے اس طرح شہر کے چہرے پر اپنا چہرہ رکھ کر آواز بڑھانے لگی جیسے وہ اس کا منہ چوم رہی ہو۔ اور اسی لمحے اس نے آنکھ کے اشارے

کی طرح چمکتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ اور پھر وہی سوال اس کے ہونٹوں پر آگیا۔ ”اب تو پاؤ کہ وجہ نے بینک کیش کے دونوں بکس کہاں دفن کیے ہیں؟“ لیکن دو گھنٹے میں پانچویں بار یہ سوال صرف اس کے ہونٹوں تک آکر رہ گیا تھا۔ رگھوپتی کو زیادہ پوچھ گچھ پسند نہیں تھی اس لیے گولپی ایسا کوئی کام کر کے اسے ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یوں رگھوپتی کے ساتھ اس نے دہلی میں صرف تین روز ہی گزارے تھے لیکن اس کے باوجود اسے رگھوپتی پر اتنا اعتماد ہو چکا تھا کہ وہ تین برس پرانے دوست ہوں۔

”چار روز قبل شام کے وقت انہوں نے روکھی کے اپارٹمنٹ کے نیچے سے وجہ کے منہ پر چادر ڈال کر اسے اٹھالیا تھا۔ اور پھر جیب میں ٹھونس کر اسے اس کے گھر میں لے آئے تھے اور پھر وہیں ان کی ملاقات جولی اور رگھوپتی سے ہوئی تھی۔ اس وقت پہلی نظر میں رگھوپتی اسے ایک چالاک دشمن جیسا لگا تھا۔ اور اسے محسوس ہوا تھا کہ اگر رگھوپتی نہ ہوتا تو وہ بڑی آسانی سے وجہ کو قابو میں کر کے اس سے ستاون لاکھ کا پتا اگلا لیتے۔ لیکن پہلی ہی ملاقات میں رگھوپتی نے اپنی شخصیت اور اپنی ہوشیاری کا رعب ڈال کر ان کے دل و دماغ پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ جمعے کی رات کو جب وہ جیاگ کے خفیہ ٹھکانے پر فلم دیکھنے گئے تھے۔ تب بھی رگھوپتی کی عقل مندی اور بہادری نے اسے بہت متاثر کیا تھا اور پھر سنپیر کی صبح کو آشا کے ہاتھوں بلیک میل ہونے والے رانا کو جس ہوشیاری سے رگھوپتی بچا لایا تھا اس نے تو گولپی ناتھ کو اور بھی اس کا گروید بنا دیا تھا۔ اور اس نے خوش ہو کر رگھوپتی کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا تھا۔ ”تم واقعی بہت ہوشیار اور قابل ہو رگھوپتی آج سے ہمارے اس گروہ کی سرداری تم ہی سنبھالو۔ کیونکہ ہم تو جوازیوں کی طرح داؤ کھیلتے رہتے ہیں جب کہ تم داؤ لگانے کے ساتھ عقل بھی استعمال کرتے ہو اور سامنے والے کے داؤ کو ناکام بنانے کا گر بھی جانتے ہو۔“

”ایسی بات نہیں ہے گولپی ناتھ۔“ اس وقت رگھوپتی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس سے کہا تھا۔ ”کسی کی پاک روح کی طاقت ہمارے ساتھ ہو تو ہم میں ہر رکاوٹ کو پار کرنے کا حوصلہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔“ اور اسی رات جب پولیس نے شہر کو پکڑ کر حوالات میں بند کر رکھا تھا تو وہ

”تو میں آپ کو ایڈوانس میں ایک ویڈیو تحفہ دیتا ہوں۔“ انسپکٹر نے مسکرا کر کہا۔ لیکن یہ سننے کے بعد بھی جولی نے اپنی گردن اونچی نہیں کی۔ انسپکٹر آگے کہہ رہا تھا۔ ”میں آپ کو آپ کا محبوب واپس کر رہا ہوں بس۔۔۔“

ایک لمحے کے لیے تو جولی کو یقین ہی نہیں آیا لیکن پھر کہیں انسپکٹر کا ارادہ بدل نہ جائے۔ اس خیال سے اسے تھوڑی جلدی کرنی پڑی۔ اس نے اٹھ کر انسپکٹر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جھک کر ایک ساتھ دو تین بار تھینک یو۔ تھینک یو۔۔۔۔۔“ بول گئی اور پھر اپنا پرس کھول کر بولی۔ ”اگر آپ چاہیں تو میں اس کی طرف سے جرمانہ ادا کر دوں؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں مس اینڈرسن اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ انسپکٹر خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ اپنے وجہ کمار کو لے جاسکتی ہیں آپ جائیں کیونکہ آپ دونوں کو پارٹی میں بھی پہنچنا ہے۔“

یہ سن کر جولی نے زیادہ وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے جلدی سے شہر کا ہاتھ پکڑا اور اتنی تیزی سے پولیس چوکی سے باہر نکل گئی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ پولیس پھر شہر کو پکڑ نہ لے۔ وہ شہر کے ساتھ سڑک کے فٹ پاتھ پر آگے بڑھ رہی تھی۔ اور کچھ فاصلے پر واقع ایک ریستورنٹ میں گولپی ناتھ وجہ رانا اور رگھوپتی اس طرح گم سم بیٹھے تھے جیسے انہیں موت کی سزا سنائی گئی ہو۔ لیکن جب انہوں نے دور سے جولی کو شہر کے ساتھ آتے دیکھا تو ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی ابرا گئی۔



نیپال اور بھارت کی سرحد کے قریب گھنے جنگل کے علاقے میں شام سے پہلے ہی آدھی رات جیسا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ ایک کچے سے مکان کے پاس تین چار پائیاں پڑی تھیں۔ جن پر چھ آدمی بیٹھے ہوئے چائے اور پراٹھا کھا رہے تھے۔ پراٹھے کے نوالے کے ساتھ ہری مرچی کو دانت سے کاٹنے کے بعد گولپی ناتھ نے پیٹروکس کی روشنی میں رگھوپتی کی طرف دیکھا تو اس وقت اسے رگھوپتی بھی ستاون لاکھ کے خزانے

دوسرے سے مل گئے۔ گوپی ناتھ، رانا اور شپرا جب آپس میں مل گئے تو تینوں کے دل و دماغ میں ستاون لاکھ روپے کا جنون سوار تھا۔ اب انہیں صرف وجہ اور رگھوپتی کی آمد کا انتظار تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے آتے ہی ستاون لاکھ کی رقم ان کے قبضے میں آجائے گی۔ بس وجہ جیسے ہی اس جگہ کی طرف اشارہ کرے گا۔ وہ زمین کھود کر رقم نکال لیں گے۔“

لیکن جب منگل کو دوپہر کے بعد رگھوناتھ کی جیب میں انہوں نے وجہ اور جولی کو نہیں دیکھا تو ان کی انگلیوں پر پانی پھر گیا۔ جیب میں رگھوناتھ اور رگھوپتی ہی بیٹھے تھے۔ ان دونوں کے اترتے ہی گوپی ناتھ نے رگھوپتی سے وجہ اور جولی کے بارے میں پوچھنا چاہا تھا۔ مگر رگھوپتی ان تینوں کے ساتھ چوتھے آدمی کو دیکھ کر شک میں پڑھ گیا تھا۔ یہ دیکھ کر گوپی ناتھ نے فوراً اپنے چوتھے ساتھی کا تعارف اس سے کراتے ہوئے کہا۔“ اس سے ملو رگھوپتی یہ سریندر موہن ہے۔ یہ الہ آباد کا رہنے والا ہے لیکن پچھلے سال سے فارسٹ آفیسر اسٹنٹ کی حیثیت سے اس علاقے میں رہتا ہے۔ بھارت میں یہ بھی ہمارا ساتھی ہے اور رگھوناتھ کا دوست بھی ہے۔ یہاں سے بینک کی لوٹی ہوئی رقم کے بکس کو ہم اس کی مدد سے ہی لے جانے والے تھے۔“

سریندر موہن سے ہاتھ ملاتے ہی رگھوپتی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ اور وہ بولا تھا۔“ سریندر موہن ہم سب کو یہاں جمع کرنے کا سہرا تمہارے ہی سر جاتا ہے۔“ اس کی اس بات کا مطلب سریندر سمیت کوئی بھی نہیں سمجھا تھا۔ اس لیے جب سب اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تو رگھوپتی کو کہنا پڑا ”سریندر اگر تم بینک کے کیش کے بدلے وجہ کمار کے دونوں بکس اٹھا کر نہ لے گئے ہوتے تو آج ہم سب یہاں جمع ہی نہ ہوئے ہوتے۔“

یہ سن کر سریندر موہن کو پہلے تو یہی لگا کہ رگھوپتی اس کی اس بے وقوفی پر طنز کر رہا ہے۔ لیکن رگھوپتی کے چہرے پر اسے کوئی تاثرات نظر نہیں آئے۔ تو اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میری بے وقوفی کو وجہ نے زمین میں دفن کر دیا اور یہ بھی ہماری خوش قسمتی ہے ورنہ ہم میں سے دو چار تو اس وقت نیپال جیل میں بیٹھے ہوتے۔“

رگھوناتھ اپنے ساتھ آئے ہوئے ایک دیہاتی مزدور بنی سے جیب میں سے

سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے اس کو چھڑانے کی ترکیبیں سوچ رہے تھے لیکن کوئی بات بن نہیں رہی تھی اور تب جولی چٹکی بجاتے ہوئے شپرا کو حوالات سے نکال کر باہر لے آئی تھی۔ یہ دیکھ کر گوپی ناتھ کو یقین ہو گیا تھا کہ واقعی روکھی کی روح ہی دیوی بن کر ہر قدم پر ان کی مدد کر رہی ہے۔

اس لیے جب سینچر کی رات کو رگھوپتی نے ان تینوں کو فوراً دہلی چھوڑ دینے کے لیے کہا تھا تو رگھوپتی ناتھ شپرا اور رانا نے اس کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ رگھوپتی نے ان سے کہا تھا ”تم تینوں کو الگ الگ ستر کرنا ہے۔ کوئی ٹرک میں کوئی بس میں اور کوئی تیل گاڑی میں بیٹھ کر بھارت اور نیپال کی سرحد پر واقع اس پرانے مندر میں منگل کی دوپہر تک پہنچ جانا ہے۔“ رگھوپتی نے اتنا کہہ کر ان سب کی طرف دیکھا لیکن کسی نے بھی جب کوئی بات نہیں کہی تو وہ آگے بولا تھا۔ ”اور رگھوناتھ کی جیب میں وجہ اور جولی کے ساتھ میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

لیکن روانہ ہوتے وقت گوپی ناتھ پوچھ بیٹھا تھا۔ ”اس کے بعد کا سارا پروگرام تو تم نے سوچ رکھا ہے نا؟“

”کچھ سوچا ہے اور کچھ سوچنا باقی ہے۔“ کہہ کر رگھوپتی نے ان تینوں سے ہاتھ ملا کر تاکید کی تھی۔ ”اب ہمارے گروپ میں رگھوناتھ بھی شامل ہو گیا ہے کیونکہ یہ جیب بھی اس کی ہے۔ اس لیے اب ہم سات ایک ہی ہیں۔ ہمارا مقصد ایک ہے۔ اس لیے ہمیں ایک ہو کر ہر رکاوٹ کا سامنا کرنا ہے۔ اگر آج کی طرح ہمارا کوئی ساتھی پولیس کے شکنجے میں پھنس جائے تو اسے اپنا منہ ہر حالت میں بند رکھنا ہو گا۔ اور اگر منہ کھولے بغیر چارہ ہی نہ ہو تو منہ کھول کر دانتوں کے بیچ میں اپنی زبان کھل دینی ہو گی۔ مگر کسی کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ بتانا ہو گا۔“

یہ تاکید کرنے کے بعد رگھوپتی نے بڑی سنجیدگی سے انہیں سمجھا دیا کہ آج کے بعد ہمیں اپنا ہر قدم یہ سوچ کر اٹھانا ہے کہ یہ زندگی کی طرف نہیں بلکہ موت کی طرف اٹھ رہا ہے۔

رگھوپتی کی اس بات کو اپنی گرہ میں باندھ کر وہ تینوں الگ الگ راستوں سے دہلی سے نکل گئے۔ اور پھر پیر کی شام کو وہ سرحد کے قریب والے مندر میں ایک

اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ اور بقیہ رقم پٹنہ کس طرح لے جانی جائے گی اس کے بارے میں تو ہمیں سوچنا ہے اور اس کے لیے ابھی ساری رات ہمارے پاس پڑی ہے۔ ”اتنا کہہ کر وہ تھوڑی دیر کا اور پھر چاروں طرف نگاہ ڈال کر بولا۔ ”اب چلو پہلے ذرا یہاں کے مندر کے درشن بھی کر لیں۔“

رگھوپتی نے مندر کا ذکر کر کے بات ٹال دی تھی۔ یہ بات گوپی ناتھ نے محسوس تو کر لی تھی لیکن اسے رگھوپتی کا ارادہ مشکوک نظر نہیں آیا تھا۔ پھر جب وہ لوگ مندر سے جیب میں بیٹھ کر واپس آ رہے تھے تو راستے میں گوپی ناتھ نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا تھا۔ ”کیوں نہ ساتھ ساتھ وہ جگہ بھی دیکھ لی جائے۔ جہاں رقم۔“

رگھوپتی اس کی بات سمجھ گیا کہ وہ اس جگہ کو دیکھنے کے لیے بے چین ہے جہاں وجے نے رقم چھپائی ہے لیکن اس کے باوجود اس نے گوپی ناتھ کو کوئی جواب نہیں دیا۔ جب تھوڑی دیر تک رگھوپتی کچھ نہ بولا۔ تو گوپی ناتھ دل ہی دل میں یہ سوچنے لگا کہ یہاں آتے وقت رگھوپتی وجے کی بتائی ہوئی جگہ کو دیکھتا آیا ہے۔ جب ہی وہ خاموش ہے یکایک رگھوپتی اس کے دل کی بات تاڑ گیا اور بولا ”گوپی ناتھ ہم یہاں آتے وقت راستے میں کہیں بھی نہیں ٹھہرے تھے۔ اس علاقے میں داخل ہوتے ہی میں تو جیب میں ہی سو گیا تھا۔“

گوپی ناتھ کو اپنے سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ پھر کھانے کے بعد ایک بار پھر یہی سوال اس کے ہونٹوں پر آگیا۔ ”رگھوپتی اندھیرا چھا جانے سے پہلے اگر ہم ایک بار وہ جگہ دیکھ لیں تو اچھا ہو گا۔“

یہ سن کر رگھوپتی مسکرا دیا۔ ہنسی کھانے کی پلیٹیں اٹھا کر جب دوسری طرف چلا گیا تو وہ گوپی ناتھ سے بولا ”گوپی ناتھ وہ جگہ تو ہم سب ساتھ جا کر دیکھ آئے ہیں۔“

”دیکھ آئے ہیں؟ کیا مطلب؟“ گوپی ناتھ کی طرح شہرا اور رانا بھی چونک پڑے۔

”ہم ندی کنارے گئے ہی کب ہیں؟“

”نیک کی رقم ندی کنارے نہیں بلکہ مہادیوی کے قدموں کے نیچے چھپائی گئی ہے۔“

سامان اتروا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر گوپی ناتھ پوچھ بیٹھا۔ ”ارے رگھوپتی تم یہ سب کیا اٹھا لائے ہو؟“

”یہ فلم کی شوٹنگ کا سامان ہے۔“ رگھوپتی مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ایک مودی کیمرہ دو ری فلیکٹر اور اس صندوق میں میک اپ کا سامان اور کاسٹیوم وغیرہ ہیں۔ کل ہمیں یہاں ایک فلم کی شوٹنگ کرنی ہے نا؟“

سوائے رگھوناتھ کے وہ چاروں حیرت سے رگھوپتی کو تاکنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے سوالات جھانک رہے تھے۔ کس کی فلم؟ کیسی فلم؟ پھر رگھوپتی نے مزید تفصیل بتاتے ہوئے آگے کہا۔ ”ہماری اس فلم کا نام ہے ”جئے ہشتھی ناتھ“ کل صبح یہاں کے مندر کے سامنے اس کا کلا نمکس سین فلمایا جائے گا۔ اس منظر میں ہیرو ولن کے بچے سے ہیروئن کو چھڑا کر اسے ایک ہیلی کاپٹر میں لے اڑے گا۔“

”ہیلی کاپٹر میں؟“ گوپی ناتھ حیرت سے بولا۔

”ہاں صبح کو وجے اور جولی ہیلی کاپٹر میں ہی آئیں گے اور فلم کا ولن سریندر موہن تو ہمارے سامنے ہی موجود ہے۔“ رگھوپتی نے ہنس کر کہا اور دھیرے سے سریندر موہن کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ سریندر تو رگھوپتی کی بات سن کر مسکرا دیا۔ لیکن رانا کو تسلی نہیں ہوئی اس لیے وہ پوچھ بیٹھا۔ ”لیکن ان کے پاس ہیلی کاپٹر کہاں سے آئے گا؟“

”الہ آباد سے۔“ رگھوپتی نے فوراً ہی جواب دیا اور آگے بولا۔ ”ساتھ ہزار روپے کرائے کا وہ ہیلی کاپٹر تم لوگوں کو منگا تو لگے گا۔ لیکن بہت سوچنے کے بعد ہیروئی بی ایک راستہ سب سے محفوظ نظر آیا۔ کیونکہ اتنی بڑی رقم کو زمین کے راتے لے جانا خطرے سے باہر نہیں ہے۔ آج کل اسمگلنگ کو روکنے کے لیے ہر جگہ چیک پوسٹ قائم کر دیے گئے ہیں اس لیے یہی ایک ترکیب سمجھ میں آئی تھی۔“

ترکیب تو ٹھیک ہے لیکن الہ آباد سے یہ اتنی بڑی رقم ہمیں پٹنہ پہنچانی ہوگی۔ اس کا کیا ہو گا؟ گوپی ناتھ نے اپنا سر کھجاتے ہوئے پوچھا تھا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہاں سے روانہ ہونے والا ہیلی کاپٹر سیدھا پٹنہ لے جایا جائے؟“

”گوپی .... ہیلی کاپٹر میں تو رقم کا کچھ حصہ ہی الہ آباد جائے گا۔“ رگھوپتی

کی لاش دکھائی۔ پھر ہم نے فوراً ہی ایک آدمی کو کنویں میں اتار کر ہرن کے بچے کی لاش تو باہر نکال لی لیکن پجاری جی کا کہنا تھا کہ اب کنویں کے اس گندے پانی سے وہ مہادیوی کے چروں کو نہیں دھو سکتے۔ اس لیے اب کنویں کا سارا پانی نکلوا دیں۔۔۔

”پھر...؟“ گوپی ناتھ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”کیا کیا تم نے؟ پانی نکلوانے کا ارادہ تو ملتوی کر دیا تھا؟“

”ہاں... اس وقت فوراً ہی یہ کام نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے ارادہ ملتوی ہی کر دیا۔“ سرندر موہن نے کہا۔ ”میں نے پجاری جی کو سمجھا دیا کہ ہمارا یہ آدمی بنی ایک دوسرے کنویں میں سے آپ کو روزانہ دو بائلیاں پانی کی لا کر دیا کرے گا۔ اور اس سے آپ مہادیوی کی پوجا پاٹ کر لیجے گا تب تک میں محکمہ جنگلات سے کنویں کو صاف کرانے کے خرچ کی منظوری لے لوں گا“

”اف...“ گوپی ناتھ نے سکون کا ایک سانس لیا۔ ”اگر مہادیوی نے ہمارے خزانے کی حفاظت نہ کی ہوتی تو آج ہمیں یہاں سے خالی ہاتھ ہی واپس جانا پڑتا۔ اب ہمارا کام ختم ہو گیا تو کنویں کی صفائی کا خرچا ہم خود پجاری جی کو دے جائیں گے۔“

”ارے اگر ہمارا مقصد حل ہو گیا تو مہادیوی کے اس پرانے مندر کو ہم ایک عالی شان مندر بنا دیں گے۔“ شہرا نے خوش ہو کر کہا۔ ”لیکن اب ہم بیٹھے کیوں ہیں چل کر ہمیں اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔“

لیکن رگھوپتی نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے سفاری سوٹ کی جیب میں سے تاش کی دو گڈیاں نکالیں اور گوپی ناتھ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”چلو ہم لوگ ذرا ری کھیل کر اپنا دل بسلائیں۔ تم سب کو رمی آتی ہے نا؟“

جواب دینے کی بجائے گوپی ناتھ عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ دیکھ کر رگھوپتی مسکرایا پھر اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارتا ہوا بولا۔ پیارے گوپی ناتھ جب آدمی کی زندگی میں سنسنی خیز لمحات آجائیں تو دل پر بے چینی اور گھبراہٹ کو طاری ہونے لگتا رہتا چاہیے۔ نہیں تو عین امتحان کے وقت آدمی زروس ہو جاتا ہے۔“

یہ سن کر کوئی بھی ایک لفظ نہیں بولا۔ اور پھر وہ سب بیٹھ کر رمی کھیلنے لگے۔

”مہادیوی کے قدموں کے نیچے؟“ رگھوپتی کی بات سن کر سرندر موہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور بولا۔ ”مگر مہادیوی کے مندر کے آس پاس تو خشک اور پتھریلی زمین ہے اور اگر وجے نے وہیں کہیں ان دونوں بکسوں کو دفن کیا ہے تو اس نے کھدائی کا اتنا محنت طلب کام کب کیا ہے؟“

تب رگھوپتی راز کھولنے سے پہلے پر اسرار انداز میں ہنسا اور پھر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ”بے چارے وجے کو یہ کہاں معلوم تھا کہ ان پیٹیوں میں بینک کے ستاون لاکھ روپے موجود ہیں۔ وہ تو ان دونوں پیٹیوں کو راجا کے گناہوں کا بوجھ ہی سمجھ رہا تھا۔ جو نیپال سے اس کے ساتھ آئی تھیں وہ تو اس گناہ کے بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس لیے اس نے آنکھیں بند کر کے ان دونوں پیٹیوں کو مندر کے پچھواڑے والے کنویں میں دھکیل دیا تھا۔“

”مندر کے کنویں میں؟“ وہ پانچوں اس طرح چونک پڑے جیسے کسی نے انہیں اچانک ہی گھرے کنویں میں دھکا دے دیا ہو۔ سرندر موہن اس جھٹکے سے فوراً ہی سنبھل گیا اور بولا۔ ”میں تو روزانہ صبح و شام مندر میں مہادیوی کے درشن کے لیے آتا ہوں۔ لیکن میرے تو تصور میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وجے نے میری بے وقوفی کو مندر کے کنویں میں دبا دیا ہو گا۔“

رگھوپتی نے ان سب کو ندی کنارے کی بات کہہ کر دھوکے میں رکھا تھا لیکن اس کے باوجود گوپی ناتھ کو اس پر ناراضگی نہیں تھی۔ وہ اب بہت سکون اور اطمینان محسوس کرتے ہوئے بولا۔ ”چلو شکر ہے رقم محفوظ ہے، اب اطمینان ہو گیا۔“

”تمہیں تو اطمینان ہو گیا لیکن میری بے چینی میں تو اضافہ ہو گیا ہے۔“ کہہ کر سرندر موہن نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ رگھوپتی کو بھی چونکا دیا۔

”کچار روز قبل ہی اس کنویں میں ہم نے آدمی اتارا تھا۔“

”وہ کیوں؟“ گوپی ناتھ گھبرا گیا۔ اور بقیہ لوگوں کے چہرے بھی سرندر موہن کی بات سن کر تنگ ہو گئے۔ ایک لمحہ ٹھہر کر سرندر موہن پھر آگے بولا۔

”اس رات ایک چپتے سے اپنی جان بچانے کے لیے بیچارہ ایک ہرن کا بچہ کنویں میں گر گیا تھا۔ صبح جب میں مندر میں آیا تو مجھے پجاری نے کنویں میں تیرتی ہوئی اس



پھر پانی کے اندر غائب ہو گیا۔

اس کا یہ دوسرا غوطہ پہلے غوطے سے کچھ طویل تھا۔ اس لیے گوبی ناتھ گھبرا کر کنویں کی منڈیر پر چڑھ گیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اگر اس بار بنی نے اپنا سرانکار میں ہلایا تو وہ خود کنویں میں کود پڑے گا۔ لیکن پانی کی سطح پر ابھرتے ہوئے جب بنی نے اپنی کامیابی کا اشارہ کیا تو ان کے دل خوشی سے اچھل پڑے اور گوبی ناتھ کنویں کے اندر کودنے کے بجائے پلٹ کر خشک دھرتی پر آگرا۔ لیکن پھر بھی کسی نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ سب کی توجہ تو بنی پر مرکوز تھی جو کنویں کے اندر سے کہہ رہا تھا۔ ”میرے پاؤں کسی صندوق جیسی چیز سے ٹکرائے تھے۔“

”تو اب اس ہک والے رے کے ساتھ سریندر موہن ایک موٹے رے کو ہلاتے ہوئے بولا۔“ بیٹی کے دونوں جانب ہینڈل ہیں جن میں سے ایک میں ہک کو پھنسا دینا۔“

تیسری بار ایک اور لمبا غوطہ لگانے کے لیے بنی کو ذرا اپنے ہوش و حواس بحال کرنا پڑے۔ وہ تھوڑی دیر کنویں کی دیوار کو تھامے گہرے گہرے سانس لیتا رہا لیکن اس کی یہ ذرا سی تاخیر بھی اوپر کھڑے ہوئے لوگوں کو بہت ناگوار گذر رہی تھی۔ رگھوپتی تو آنکھیں بند کیے بھگوان سے دعائیں کرنے لگا تھا۔ رانا شپرا کی بھی یہی حالت تھی جب کہ گوبی ناتھ اپنا ہاتھ دل پر رکھے وہیں خاموش بیٹھ گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے ان کی خاموشی سے جنگل کا سکوت اور گہرا ہو گیا تھا۔

اور پھر تیسرا غوطہ لگانے کے بعد بنی نے باہر نکل کر رے کو ہلا کر اسے اوپر کھینچنے کا اشارہ کیا۔ تو گوبی ناتھ چھلانگ لگا کر رگھوپتی سے لپٹ گیا۔ اور سریندر موہن رے کو اوپر کھینچنے لگا۔ لوہے کے ہک کے ساتھ پھنسا ہوا ٹین کا بکس پانی کی سطح پر دکھائی دیا۔ تو رانا خوشی سے جھوم کر چلایا ”مل گیا... مل گیا...“

اس کی آواز سے جیسے جنگل میں کھلبلی سی مچ گئی ہو۔ سب کے چہرے مسرت سے دمک رہے تھے۔ پھر جب سریندر موہن نے رے کو کھینچ کر بکس کو کنویں کی منڈیر پر رکھا تو ایک ساتھ چھ آدمی اس کی طرف جھپٹے۔ گوبی ناتھ نے ہاتھ سے بکس کے اوپر کا پانی ہٹا دیا اور رانا اس پر لٹکے ہوئے تالے کو کھینچ کر اطمینان کرنے لگا کہ وہ

آسمان پر پورا چاند تھا اور اس کی چاندنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی یہ چاندنی اس گھنے جنگل کے گھنے اندھیرے کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ رسی سے بندھے ہوئے پیٹروکس کی روشنی میں بنی دھیرے دھیرے کنویں کے ایک ایک سوراخ پر پیر بجاتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ اور اس وقت اوپر کھڑے ہوئے چھ آدمیوں کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ پہلے تو رگھوپتی نے بنی کو اس کام میں شامل کرنے پر اعتراض کیا تھا لیکن سریندر موہن نے اسے سمجھایا تھا کہ بنی ایک وفادار نوکر ہے اور ایسے وفادار آدمی کو اندھیرے میں رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ اسے اپنے اعتماد میں لے لیا جائے۔ کیونکہ اس میں کم خطرہ ہے۔ رگھوپتی نے ٹھنڈے دل سے اس کی بات سنی تھی۔ اور پھر جواب میں کہا تھا۔ ”یہ تو ٹھیک ہے کہ بھروسا کر کے آدمی کے اعتماد کو جیتا جاسکتا ہے لیکن یہ بے چارہ ہماری منزل اور ہمارے مقصد سے واقف نہیں ہے۔ ایسی حالت میں یہ غریب نیپال کے راجا شاہی حکومت کے خلاف بغاوت میں ہمارے کیا کام آسکتا ہے؟“

پھر جب انہوں نے بنی کے سامنے کنویں میں اترنے کی بات کی تو بنی تھوڑی دیر تک سوچتا رہا اور پھر بولا ”جناب رات کے وقت کنویں میں اترنا ذرا خطرناک تو ہے کیونکہ اسکی دیواروں کے سوراخ میں پرندے اپنا گھونسلہ بنا کر اس میں اندھے دے دیتے ہیں جس کی وجہ سے اکثر رات کے وقت وہاں سانپ آجاتے ہیں پھر بھی اگر آپ لوگ چاہیں تو میں کنویں میں اتروں گا۔“

اور اس کے بعد وہ واقعی تیار ہو کر کنویں میں اتر گیا تھا۔ اور وہ چھ کنویں کی منڈیر سے جھانک کر اسے نیچے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ جب بنی کا پاؤں کنویں کے پانی سے ٹکرایا تو اس نے سر اٹھا کر انہیں اشارے سے سمجھایا کہ اب وہ کنویں میں ڈبکی لگا رہا ہے۔

پھر چندرہ بیس سینکڑ کی اس کی پہلی ڈبکی نے اوپر کھڑے ہوئے چھ آدمیوں کے جسموں میں ایک سنسناٹ سی دوڑا دی۔ پھر جب ہانپتا ہوا بنی پانی کی سطح پر نمودار ہوا تو ان چھ آدمیوں کی بارہ آنکھیں اس کے چہرے کے تاثرات کو جاننے کے لیے اسے دور سے گھورنے لگیں۔ بنی نے اپنا سرانکار میں ہلا کر انہیں پہلا جھٹکا دیا اور

ہانا تھا کہ دشمن اسی طرح چپ چاپ چلے جائیں تو اچھا ہے۔ کیونکہ اس وقت راتقل کے دھماکا کرنے میں سخت خطرہ تھا۔ راتقل کی آواز سن کر محکمہ جنگلات کے دو چار آدمی دوڑے آگے تو ساری بات کھل جائے گی۔ اور کنویں کے اندر سے برآمد ہونے والے کیش بکس کا راز بھی کھل جائے گا۔

جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر سریندر موہن رک گیا۔ اس نے کمر سے لٹکتی ہوئی ٹارچ لائٹ اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ پھر اس نے جیسے ہی ٹارچ کا بٹن دبایا ویسے ہی چیتے کی ہیمانک چٹکھاڑ کے ساتھ کسی آدمی کی دلخراش چیخ سنائی دی۔ کنویں کے قریب کھڑے ہوئے پانچ لوگوں کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی اور جھاڑیوں کے قریب پہنچ جانے والے سریندر موہن کی ٹانگیں کانپ گئیں۔

وہ تیمور کی چیخ تو پہچان گیا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس آدمی کی چیخ تھی؟

”سریندر میں آ رہا ہوں۔“ اچانک رگھوپتی بولا اور بھاگ کر اس کے قریب آگیا پھر آگے بولا۔ ”اپنا رگھوناتھ تو اندر گیا ہے۔“

”اندر؟“ سریندر موہن کا جسم کانپ گیا۔ اس نے ٹارچ کی لائٹ رگھوپتی کے ہاتھ میں تھما دی اور آگے بڑھتا ہوا بولا۔ ”تم ٹارچ روشن رکھ کر میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ اگر ہمیں دیر ہو گئی تو رگھوناتھ....“ آخری الفاظ اس کے منہ میں رہ گئے کیونکہ کنویں کے اندر اترے ہوئے بنسی نے بھی چیتے کی آمد کی گرجدار آواز سن لی تھی اور اس کی آواز سنتے ہی کنویں سے باہر نکل آیا تھا اور اس نے کنویں کے اندر لٹکے ہوئے پیڑوکس کو بھی کھینچ کر اوپر لے لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اندھیرے میں چھپا ہوا خوف ناک چیتا کسی بھی سمت سے کسی پر بھی کسی وقت حملہ کر سکتا ہے۔ جھاڑیوں میں تھوڑا اندر جاتے ہی چیتے کی غراہٹ کی آواز نے رگھوپتی اور سریندر کے قدم روک لیے۔ انہیں اندھیرے میں چمکتی ہوئی دو بڑی بڑی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اپنے شکار میں غل پھپھانے والوں پر تیمور چھلانگ لگانے کی تیاری میں تھا۔ یہ دیکھ کر سریندر موہن نے اس کی دونوں چمکتی ہوئی آنکھوں کے درمیان میں نشانہ ٹاک لیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ راتقل کی لہبی پر دبی ہوئی اس کی انگلی کو حرکت ہوتی بنسی جلتے ہوئے

بند تو ہے نا؟ سب اس ایک بکس کو دیکھ کر اس طرح بوکھلا گئے کہ انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ وہ دوسرے بکس کو پانی سے نکالنے کی بات ہی بھول چکے تھے۔ اور تب ہی قریب کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی ہوئی اور سب ہی چونک پڑے۔ سریندر موہن کی گردن ایک جھٹکے سے اس طرف گھومی تو سب کی نگاہیں بھی اس طرف اٹھ گئیں ہر کوئی خوف اور گھبراہٹ سے اسی جانب ٹاک رہا تھا۔ اندھیرے میں کوئی نظر تو نہیں آ رہا تھا لیکن گھنی جھاڑیوں کے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس تو ہوا ہی تھا۔

”ارے رسی تو پھینکتے۔“ اچانک کنویں کے اندر سے بنسی کی آواز سنائی دی۔ تو وہ سب کے سب خوف سے کانپ گئے۔ سریندر موہن تیزی سے کنویں کی منڈیر پر جھک گیا اور اپنی ناک پر انگلی رکھ کر اوپر دیکھتے ہوئے بنسی کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اور ٹھیک اسی وقت جھاڑیوں کے پیچھے سے ویسی ہی سرسراہٹ ہوئی اور ان سب کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ سریندر موہن مندر کے پچھواڑے والے برآمدے میں رکھی ہوئی راتقل لینے کے لیے دبے پاؤں آگے بڑھا لیکن اتنی دیر میں رگھوناتھ کو نہ جانے کیا سوچھی کہ وہ اپنی جیب سے پستول نکال کر ان جھاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔ رگھوپتی نے اسے روکنے کی کوشش میں آواز نکالی ہی چاہی تھی لیکن اسے خیال آیا کہ اس کی آواز سن کر جھاڑیوں میں روپوش دشمن ہوشیار ہو جائیں گے۔ اسی لیے وہ چپ ہو گیا اور اپنا پستول جھاڑیوں کی طرف تان کر ہوشیار ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ سریندر موہن اپنی راتقل اٹھا کر گھومتا رگھوناتھ آگے بڑھ کر گھنی جھاڑیوں کے اندر غائب ہو گیا تھا۔ سریندر موہن راتقل لے کر پلٹا تو اسے اپنے ایک ساتھی کی کمی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ راتقل ہاتھ میں لے کر دبے پاؤں آگے آتے ہوئے بہت ہی دھیمی آواز میں بولا۔ ”سب لوگ کنویں کی منڈیر کی اوٹ میں چھپ جائیں۔ کوئی ذرا بھی جنبش نہ کرے تیمور بہت ہی خطرناک آدمی ہے۔“

”کون تیمور؟“ یہ سوال پوچھ کر کسی نے بھی سریندر موہن کو غل پھپھانے کی کوشش نہیں کی کسی کو یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ سریندر موہن کو یہ بتا دے کہ رگھوناتھ تو جھاڑیوں کے اندر جا چکا ہے۔ آگے بڑھتے ہوئے سریندر موہن نے محسوس کر لیا تھا کہ جھاڑیوں میں ہلچل جاری ہے۔ شاید دشمن ڈر کر بھاگ رہے ہیں.... وہ

معلوم آگے کس پر کیا گزرے؟“



”آدھی رات کے وقت جیپ کی آواز سنتے ہی بند کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر ایک سنناہٹ سی دوڑ گئی۔ وہ ڈھائی گھنٹے سے ایک دوسرے کے آنے سامنے بیٹھے تھے مگر کوئی بھی ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ رقم کے جن دو بکسوں کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اتنا خطرہ مول لیا تھا اس کو حاصل کر لینے کے بعد ان کے تالے توڑ کر رقم کو دیکھ لینے کا تجسس بھی سب کے دل کے اندر دم توڑ گیا تھا۔ جیسی دیوار کے سارے بیٹھا اونگھ رہا تھا اور گوپی ناتھ اپنا بچا ہوا سگار سلگا کر اس کا دھواں اڑا رہا تھا۔

گھر کے اندر داخل ہونے والے سریندر موہن کے قدموں کی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی تو ان سب کی نگاہیں دروازے کی جانب اٹھ گئیں۔ سریندر موہن کے ننگے جسم سے پسینا بہہ رہا تھا۔ اور چہرے پر تھکن کے آثار بہت نمایاں نظر آرہے تھے۔

”جھگوان کا شکر ہے۔ اس وقت تو وہ خطرے سے باہر ہے۔“ سریندر موہن نے کہا اور کرسی پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا پھر آگے بولا۔ ”گردن میں پورے گیارہ ٹانکے لگے ہیں لیکن زخم بہت زیادہ گہرے نہیں ہیں۔ شہرہ رگ تک تیمور کے ناخن نہیں پہنچ سکے تھے۔ اس لیے موت کا خطرہ فی الحال ٹل گیا ہے۔“

”تب تو وہ ضرور بچ جائے گا۔“ گوپی ناتھ نے دھیرے سے کہا۔ ”وہ بے چارہ تو صرف ہماری دوستی کے ناطے ہمارا ساتھ دینے آیا تھا۔“

”بچ تو جائے گا لیکن کچھ روز لگ جائیں گے۔ اس وقت تو وہ بے ہوشی کی حالت میں ہے۔“ کہہ کر سریندر موہن تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر بولا ”مگر اس کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی مجھے اس کے پاس پہنچ جانا چاہیے۔ ڈر ہے کہیں بے ہوشی کی کیفیت میں وہ کچھ بک نہ دے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے مجھے ہائے بغیر جھاڑیوں کے اندر داخل ہونے کی حماقت کیسے کر لی تھی؟ کچھ عرصے سے

پیٹروکس سمیت وہاں پہنچ گیا اور پیٹروکس کی روشنی نے جنگل کے گھنے اندھیرے کو ہلکا کر دیا۔ پیٹروکس کی روشنی سے چیتا یکا یک ہی بوکھلا گیا اور چھلانگ لگانے کا ارادہ ملتوی کر کے وہ گھنے جنگل میں کہیں غائب ہو گیا۔

پیٹروکس کی روشنی میں وہ تینوں دس بارہ قدم آگے بڑھے ہی تھے کہ اچانک ایک جگہ انہیں زمین پر رگھوناتھ پڑا نظر آیا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی کچلی ہوئی گردن پر سے خون کی موٹی موٹی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ اور وہ اس درد کی تکلیف سے زمین پر پڑا پڑا بے بسی سے اپنے ہاتھ پاؤں میخ رہا تھا۔ سریندر موہن نے جلدی سے اپنی شرٹ اتاری اور اس کی گردن کے زخم پر پریٹ دیا اور بولا۔

اب جلدی سے اسے اٹھا کر جیپ تک لے چلو۔“

جب رگھوناتھ کو اٹھایا گیا تو گیلی زمین پر خون جما ہوا تھا رگھوناتھ کے ہاتھ کی کلائی سے بھی کافی خون بہہ رہا تھا۔

صدے سے نڈھال اس کے ساتھی اسے اٹھا کر جیپ تک لے آئے۔ اس وقت تک رگھوناتھ کے زخمی گلے سے آوازیں نکلتی بند ہو گئیں تھیں یہ دیکھ کر وہ سب ایک اور صدے کو محسوس کرنے لگے ”کیا رگھوناتھ ختم ہو گیا ہے؟“

”میں اسے جنگل کے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں“ جیپ کے اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ کر سریندر موہن نے انہیں سمجھایا۔ ”تم لوگ فوراً ہی کنویں سے دوسرا بکس بھی نکال کر اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاؤ۔ صبح تک چیتے کے حملے کی بات اس پاس میں پھیل جائے گی اور پھر چند روز تک ہمیں موقع نہیں ملے گا۔“ اتنا کہہ کر اس نے جیپ اشارت کی اور بڑھاتا ہوا بولا۔ ”رگھوناتھ کو میں ہر قیمت پر بچانے کی کوشش کروں گا۔“

زخمی رگھوناتھ کو لے کر جیپ روانہ ہو چکی تھی لیکن اس کے بعد بھی تھوڑی دیر تک وہ پانچوں چپ چاپ ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے وہیں کھڑے رہ گئے تھے۔ گوپی ناتھ ایک گہرا سانس لے کر یہ سوچ رہا تھا کہ جہاز میں سے ان دونوں کیش بکس کو اتارنے کے بعد ان کے ساتھی شرما کو سانپ نے ڈس لیا تھا اور اب کنویں سے بکس نکالتے وقت ان کے دوسرے ساتھی رگھوناتھ پر چیتے نے حملہ کیا تھا۔ اب نہ

چالیس ہزار کے یہ پر خطر نوٹوں کو سریندر موہن اس وقت تک کہیں زمین میں دفن کر دے گا۔ جب تک ہمارا کام پورا نہیں ہو جاتا۔ بقیہ یہ انتالیس لاکھ روپے تم لوگ سنبال لو۔“

رگھوپتی نے ستاون لاکھ کی رقم کو جس طرح تقسیم کیا تھا اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوا تھا اور نہ ہی کسی نے کچھ کہا تھا۔ لیکن پھر بھی رگھوپتی نے انہیں حساب سمجھاتے ہوئے کہا ”اصل میں سترہ لاکھ ساٹھ ہزار میں سے ساڑھے پندرہ لاکھ تو ہمیں اس چینی کو دینے پڑیں گے اور ڈیڑھ لاکھ روپے اس لیگٹو کے پرنٹ بنوانے پر خرچ ہوں گے۔ اب رہ گئے ساٹھ ہزار تو وہ پہلی کاپی کے کرائے میں ادا ہو جائیں گے۔“

”تب تو تمہارے پاس اچانک ضرورت کے لیے کچھ بھی نہیں بچے گا۔“ گوپی ناتھ نے حساب کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”تم ایسا کرو رگھوپتی ضرورت کے لیے دو ٹین لاکھ روپے اور رکھ لو۔“

”نہیں گوپی ناتھ۔“ رگھوپتی بولا۔ ”وہ بے کے پاس ابھی مہاراجا کے پاپ کے بچے ہوئے روپے پڑے ہیں۔ اس لیے وہ کافی ہو جائیں گے۔ خیر چھوڑو۔ اب ہمیں اپنے اگلے منصوبے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔۔۔ لیکن پہلے تمہیں مجھے کچھ معلومات فراہم کرنی ہوں گی۔ تم یہ بتاؤ کہ اگر راجا شاہی کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتے وقت ہمیں مقابلے کے لیے طاقت استعمال کرنے کی ضرورت پیش آگئی تو اس کے لیے کتنے جوان تیار ہیں؟“

”ہمارے ساتھ تقریباً“ سوا دو سو افراد ہیں۔“ گوپی ناتھ نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ”جس میں سے پچھتر آدمی تو بھارت میں ہتھیار چلانے کی ٹریننگ لے کر بالکل تیار بیٹھے ہیں اور رائل مشین گن ریوالور اور ہینڈ بم وغیرہ کی ڈیووری لینے کے لیے اب تو ہمارے پاس رقم بھی آگئی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ رگھوپتی نے اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ”پورے ایک ہفتے تک نیپال میں مہاراجا کی تاجپوشی کا جشن منایا جائے گا۔ اور تیسرے روز یوراج کی رسم تاجپوشی ادا ہونے والی ہے لیکن اس سے پہلے ہی ہمیں سارا کام کر لینا ہوگا۔ اس رات پورے نیپال میں فوت ہو جانے والے راجا کے بارے میں فلم دکھائی

تیور آدم خور بن گیا ہے۔ ویسے غلطی میری ہی تھی مجھے تم لوگوں کو پہلے ہی آگاہ کر دینا چاہیے تھا۔ اصل میں جب سے ایک شکاری نے گولی مار کر اس کے ایک پاؤں کو زخمی کر دیا تھا تب سے وہ بے چارہ لنگڑا ہو گیا ہے۔ اس لیے ہم لوگوں نے اس کا نام تیور لنگ رکھ دیا ہے۔ لیکن اس بد معاش نے اب میرے ہی دوست پر حملہ کیا ہے۔“

تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی اور تب ہی سریندر موہن کی نظریں کونے میں پڑے ہوئے رقم کے دونوں بکسوں پر پڑ گئیں۔ جس پر بینک کے بڑے بڑے تالے پڑے ہوئے تھے۔ ”ارے تم لوگوں نے ابھی تک انہیں کھولا بھی نہیں ہے؟“ اچانک وہ بولتے بولتے رک گیا پھر کچھ سوچ کر آگے بولا۔ ”ٹھیک ہے تھوڑی دیر تک تو مجھے بھی لگا تھا کہ جنم میں جائیں یہ ستاون لاکھ روپے۔۔۔ رگھوناتھ کی زندگی بچ جائے تو بس۔۔۔“

”رگھوناتھ بچ گیا سریندر۔۔۔ اچانک پورے یقین سے رگھوپتی بولا اور پھر ہتھوڑا اٹھا کر اس نے باری باری دونوں بکسوں کے تالے توڑ دیے۔ لیکن پانی کے اندر رہ کر زنگ کھا جانے والے بکسوں کے ڈسکن کھولنے میں اسے تھوڑی دیر لگی تو سب کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ مگر جب بکس کے ڈسکن کھل گئے تو پلاسٹک کے واٹر پروف تھیلوں میں پیک کیے ہوئے نوٹوں کے بنڈل دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں چمک سی لہا گئی۔ چند لمحوں کے لیے تو وہ سب حیران رہ گئے۔“

”ہمیں بینک والوں کی تعریف کرنا چاہیے۔“ گوپی ناتھ نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”وہ کانڈ کے نوٹوں کو بڑی حفاظت سے رکھتے ہیں۔“

”پہلے تو ہم لوگوں کو نوٹوں کے نمبر چیک کرنے پڑیں گے۔“ رگھوپتی نے نوٹوں کا ایک پیکٹ اٹھا کر اس کی سیل توڑ دی اور بولا۔ ”تمام نوٹ اگر ایک سیریل نمبر میں ہوئے تو ہمیں بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔“

اس کے بعد سب کام میں لگ گئے۔ دس دس ہزار کے چار بنڈل سیریل نمبروں میں نکلے۔ انہیں الگ کر کے رگھوپتی نے انہیں دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور پھر کہا۔ ”ان سترہ لاکھ اور ساٹھ ہزار میں سے ساٹھ ہزار روپے پہلی کاپی میں جائیں گے اور

جائے گی۔ اس لیے ہمارے پاس اب صرف بیس روز ہی رہ گئے ہیں۔ اور اس کے لیے پندرہ یا سترہ دنوں بعد تمہارے سارے لوگ اسلحہ سمیت نیپال میں حاضر ہو جائے چاہئیں۔“

”ہاں اس کے لیے تو ہم نے سب تیاری کر رکھی ہے۔“ رانا نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ”لیکن اب ہمارے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی آگئی ہے۔“ رگھوپتی کی آواز بہت گھمبیر ہو گئی تھی۔ ”تاجپوشی کی رسم میں شرکت کے لیے باہر ملکوں سے بھی سینکڑوں لوگ آئیں گے، جن میں وزیر اور سفیر بھی ہوں گے۔ اس لیے وہاں حفاظتی انتظامات بہت سخت ہوں گے۔ جس کی وجہ سے شہر کے اندر ہتھیار وغیرہ لے جانے میں بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس لیے سوا دو سو آدمیوں میں سے صرف دس پندرہ لوگوں کو ہی ہمارے منصوبے سے آگاہ ہونا چاہیے تاکہ اگر ہمارے کچھ ساتھی فوج کے بہتے چڑھ بھی جائیں تو انہیں وہ ہمارے بارے میں کچھ نہ بتا سکیں۔“

”ہمارا راز‘ راز ہی رہے گا۔“ گوبی ناتھ کی آواز میں یقین کی جھلک نمایاں نظر آ رہی تھی۔ ”ہمارے علاوہ صرف اور پانچ‘ چھ آدمی ہی ہمارے منصوبے سے واقف ہوں گے جن میں ہر ظلم و ستم کو بے جا شہادت کر کے چپ رہنے کی ہمت ہوگی۔“

”بس تو اب کل صبح کی شوٹنگ کا پروگرام بھی سمجھ لو۔“ رگھوپتی نے کہا اور ایک سوٹ کیس کھول کر اس میں سے مختلف چیزیں نکالتا ہوا بولا۔ ”شاید آس پاس کے لوگ سچ قلم کی شوٹنگ سمجھ کر شوٹنگ دیکھنے کے لیے آجائیں، اس لیے احتیاط کی خاطر تم سب کو اپنا حلیہ تبدیل کرنا پڑے گا۔ اس کے لیے یہ نقلی داڑھی مونچھیں اور میک اپ کا سامان وغیرہ ساتھ ہی لے آیا ہوں۔ اس لیے ہمیں زیادہ شور و غل کیے بغیر شوٹنگ کا ڈرامہ اپنے انجام تک پہنچا دینا چاہیے۔ ہیلی کاپٹر پندرہ بیس منٹ بعد ہی روانہ ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ہی میں بھی اڑ جاؤں گا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ہم کل صبح ہی ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے؟“  
گوپی ناتھ ذرا الجھن محسوس کرتے ہوئے بولا۔ ”تب تو صبح تک ہمیں تمام چھوٹی بڑی  
الجھنوں کے بارے میں بحث کر لینی چاہیے۔“

”ہاں لیکن اس کے لیے اور لوگوں کو رات بھر جگانے کی کوئی ضرورت نہیں  
ہے۔“ رگھوپتی نے بات کو مختصر کرنے کے لیے اپنی جیب سے ایک جیولری بکس نکالا  
اور بولا۔ ”میں تم لوگوں کو تحفہ دینے کے لیے رنگ برنگے پتھروں کی نگ والی  
انگوٹھیاں لے کر آیا ہوں۔“ اتنا کہہ کر اس نے جیولری بکس کھول کر سب کو  
انگوٹھیاں دکھائیں۔ اس چھوٹے سے بکس میں تقریباً درجن بھر انگوٹھیاں تھیں جنہیں  
ان سب کی آنکھیں حیرت سے ناگ رہی تھیں۔

رگھوپتی نے ایک سرخ رنگ کے نگ والی انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی اور پھر  
بولا۔ ”اب تم لوگ بھی ایک ایک انگوٹھی پہن لو۔“

اس کی بات سن کر ان لوگوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف  
دیکھا۔ لیکن کچھ پوچھے بغیر انہوں نے ایک ایک انگوٹھی اٹھائی اور اپنی اپنی انگلی میں  
ڈال لی۔ پھر رگھوپتی نے بچی ہوئی انگوٹھیاں گوپی ناتھ کے ہاتھ پر رکھ دیں اور خالی بکس  
بھی اسے تھماتے ہوئے بولا۔ ”اب جو یہ انگوٹھیاں بچ گئی ہیں، انہیں اپنے وفادار  
ساتھیوں میں تقسیم کر دینا۔“

”مجھے تو لگتا ہے کہ کسی سادھو کے پاس سے یہ جادو منتر والی انگوٹھیاں تم لے  
آئے ہو؟“ گوپی ناتھ بولے بغیر نہ رہ سکا۔ ”اگر ایسی بات ہے تب تو یہ بہت اچھا  
بات ہے کیونکہ بار بار آنے والی رکاوٹوں سے تو ہمیں نجات مل جائے گی۔“

اس کی بات سن کر رگھوپتی دھیرے سے ہنس پڑا۔ پھر جواب دینے سے قبل اس  
نے اپنی انگوٹھی کا اوپری ڈھکن کھول کر اس کے اندر رکھی ہوئی ایک کیپسول جیسی  
دکھاتے ہوئے کہا۔ ”ہر انگوٹھی کے اندر کیپسول جیسی چیز موجود ہے اور ہر کیپسول  
میں ایک قاتل زہر موجود ہے۔“

یہ سنتے ہی وہ چاروں بری طرح چونک پڑے۔

”اگر ہمارے منصوبے سے واقف ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی حکومت کے

میں پھنس جائے تو اسے اپنی زبان بند رکھنے کے لیے آخری راستے کے طور پر انگوٹھی  
کے اس کیپسول کو نگل لینا پڑے گا۔“ رگھوپتی کی یہ بات انہوں نے خاموشی سے سن  
لی اور جب کسی نے کوئی سوال نہیں پوچھا تو رگھوپتی آگے بولا۔ ”وہ بے اور جولی نے  
بھی ایسی انگوٹھیاں پہن لی ہیں، ہم میں سے کس کی قسمت میں یہ کیپسول نکلنا لکھا ہے  
یہ تو بھگوان کو ہی معلوم ہے۔“

رگھوپتی نے جب یہ کہا تو اس وقت وہ سب اپنی اپنی انگوٹھیوں کا ڈھکن کھول کر  
اس میں رکھے ہوئے کیپسول کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ سوچ رہے تھے  
کہ کیا ان کی موت اسی کیپسول میں بند ہے؟



اور آخر کار جہاز دہلی کی سرزمین سے اوپر اٹھتا چلا گیا۔ جہاز کے اندر بیٹھی ہوئی  
جولی کی آنکھیں بند تھیں اور ان بند آنکھوں کے اندر وہ بے کی تصویر سامنے ہوئی تھی۔  
جولی سوچ رہی تھی کہ وہ اسے آنکھ کھول کر دیکھ تو نہیں سکتی لیکن وہ ضرور اس وقت  
دہلی ایئر پورٹ کی چھت سے اسے ہاتھ ہلا ہلا کر رخصت کر رہا ہوگا.....

وہ بے کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کی پلکیں نم ہو گئیں اور پھر اچانک اسے  
لگا کہ کوئی ظالم اور بے رحم اس کو وہ بے سے چھین کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کسی دور لے  
جا رہا ہے۔ ”کسی اپنے سے دور ہونا بہت برا لگتا ہے، ہے نا جولی؟“ اس کے برابر والی  
سیٹ پر بیٹھی ہوئی شوبھا نے کہا تو وہ چونک پڑی اور اسے یاد آگیا کہ اس سفر میں وہ  
تھا نہیں ہے بلکہ شوبھا اور رگھوپتی بھی اس کے ساتھ جہاز میں موجود ہیں۔ اس نے  
شوبھا کی طرف دیکھ کر زبردستی مسکرانے کی کوشش کی اور بیٹھی ہوئی آنکھوں کو انگلی  
سے پونچھنے لگی لیکن شوبھا کی بات کا پھر بھی وہ کوئی جواب نہ دے پائی۔

”ہم عورتوں کی بی بی تو ایک خوبی ہے جولی.....“ شوبھا نے ایک سردی آہ بھری  
اور آگے بولی۔ ”ہمیں اگر کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو پہلے ہم اسے پانے کی کوشش  
کرتے ہیں۔ پھر جب اس کی محبت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر اس کی  
ایک لمحے کی جدائی بھی ہم سے برداشت نہیں ہوتی..... لیکن میرے نصیب کی بات

اپنی وہ خواہش تمہیں مجھ سے پوشیدہ نہیں رکھنی چاہیے تھی۔ اور اب میرے دل میں وہ بات جاننے کی خواہش زور کرنے لگی ہے۔“

”میں تم سے کوئی بات کیسے پوشیدہ رکھ سکتا ہوں؟“ وجے نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا تھا۔ ”ارے بھئی تمہارے بغیر تو میری وہ خواہش پوری ہی نہیں ہو سکتی۔ دو دریاؤں کے اس حسین سنگم پر رگھوپتی کی موجودگی میں اگر ہم دونوں شادی کر لیں تو.....؟“

یہ سن کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور وہ ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کی موجودگی کو بھول کر بے اختیار وجے سے لپٹ گئی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا اور وجے سے کہا تھا ”لیکن تم نے تو یہ عہد کیا تھا کہ جب تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو گے، اس وقت تک شادی کا خیال بھی دل میں نہیں لاؤ گے۔ کیا تم اپنا یہ عہد بھی بھول گئے؟“

”نہیں جولی، مجھے اپنا عہد یاد ہے۔“ وجے نے گھمبیر لہجے میں کہا تھا ”لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ وقت نہ آجائے کہ اپنا کام پورا ہونے سے پہلے ہی ہم جدا ہو جائیں۔“

جدائی کے خوف سے ایک لمحے کے لیے خود جولی بھی کانپ گئی مگر پھر فوراً ہی اس نے ہنس کر کہا تھا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، فرض نبھانے کے لیے اگر اس کی ضرورت پڑگئی تو ایسا کرنا پڑے گا۔“

اور اس وقت دہلی کے ایئرپورٹ پر وجے سے رخصت ہوتے وقت اس نے جدائی کی بات کو دوسرے ہی انداز سے کہا تھا۔ ”اب میں سچ سچ تم سے جدا ہو رہی ہوں مگر وقتی طور پر۔ کیونکہ اپنا عہد پورا کرنے کے لیے ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہونا ہی پڑے گا۔“ اتنا کہہ کر اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا تاکہ وجے اس کی آنکھوں میں آئی ہوئی نمی کو نہ دیکھ سکے۔ جہاز اپنی بلندی پر پہنچ کر نیپال کی جانب پرواز کر رہا تھا مگر اندر بیٹھی ہوئی شوبھا کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جولی اپنی سیٹ پر نیٹھی چپ چاپ شوبھا کی طرف دیکھ رہی تھی۔

شوبھا اپنے دل میں سوچ رہی تھی کہ اس نے جولی کے ساتھ نیپال جانے کی

اور ہے۔ مجھے تو ہر روز ایک نئے مرد کو حاصل کرنا پڑتا ہے اور اسے کھو دینا پڑتا ہے..... اور اب تو میں اس کی اس قدر عادی ہو چکی ہوں کہ مجھے نہ ملنے کی خوشی ہوتی ہے اور نہ جدائی کا غم.....“ بولتے بولتے شوبھا کی آواز بھاری ہو گئی اور یوں لگنے لگا جیسے وہ ابھی رو پڑے گی۔

”تم تو آج کسی فلاسفر کی طرح بول رہی ہو شوبھا۔“ ان کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے رگھوپتی نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ ”لیکن یہ حقیقت ہے کہ عورتوں کی طرح مردوں کو بھی پھٹرنے کا غم ہوتا ہے..... بولتے بولتے یکایک اسے روکھی کی جدائی کا خیال آگیا اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ شوبھا نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور گھمبیر لہجے میں بولی۔ ”میں مانتی ہوں اس بات کو لیکن پھر بھی عورت اور مرد کی تڑپ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مرد جدائی کے غم کو چھپانے کے لیے کئی دوسری چیزوں کا سہارا لے سکتا ہے جبکہ عورت ایسا نہیں کر سکتی۔ وہ تو دل ہی دل میں جدائی کی آگ میں سلگتی رہتی ہے۔ رگھوپتی اس کی بات سن کر مسکرا دیا لیکن جولی نے دونوں کی طرف باری باری دیکھا اور جلدی سے بولی۔ ”مرد ہو یا عورت، وہ ایک دوسرے سے مختلف ضرور نظر آتے ہیں لیکن ان کے دل کے جذبات تو ایک ہی ہوتے ہیں۔ ملن اور جدائی کے لمحات کو وہ یکساں ہی محسوس کرتے ہیں۔“

”لیکن ابھی تو وجے سے جدا ہوئے پندرہ منٹ بھی نہیں ہوئے ہیں۔“ رگھوپتی مذاق میں بول گیا۔ ”اور تم ابھی سے اس کی جدائی میں اداس ہو گئیں؟“

رگھوپتی کی بات سن کر جولی چپ رہی۔ وہ کوئی جواب دینا بھی نہیں چاہتی تھی، وہ خاموش رہ کر کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ اسے اپنے اندر اٹھتے ہوئے کئی سوالوں کے جواب ڈھونڈنے تھے۔ اور ایک بات تو ایسی تھی جو بار بار اس کے دماغ پر ہتھوڑے مار رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ الہ آباد سے ہیلی کاپٹر پر جب وہ روانہ ہوئے تھے تو گنگا، جنا کے سنگم پر سے گزرتے وقت وجے نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”یہ کام ختم کرنے کے بعد ایک اور ضروری کام کرنے کی خواہش میرے دل میں زور پکڑ رہی ہے جولی۔“

”تو اپنی یہ خواہش پوری کر لو.....“ اس کی بات سن کر جولی نے کہا تھا۔ ”ویسے

جس سے اپنا بدلہ لینا چاہتی ہو وہ تو دہلی میں.....“

”تم بہت جلدی سمجھ گئیں جولی۔“ شوہا نے فوراً ہی اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میرا وہ دشمن آج کل دہلی سے نیپال ہوا کھانے گیا ہوا ہے۔ اگر تم نے مجھے اپنا کام نہ سونپا ہوتا تو مجھے نیپال میں تو جانا ہی تھا۔ اپنے اس دشمن کو میں کتے کی موت ماروں گی..... بس..... اس کے بعد اس نقاب پوش کا چہرہ بے نقاب کرنے کے بعد مجھے مرنا بھی پڑ جائے تو مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہوگا..... اب تک تو مجھے اپنے اباچ باپ کی فکر لگی ہوئی تھی، اس لیے میں ہمت نہیں کر پا رہی تھی لیکن اب تم لوگوں کے مل جانے کی وجہ سے مجھے یہ فکر بھی نہیں رہی ہے۔“

ان دونوں کی پچھلی سیٹ پر رگھوپتی انجان بنا بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی وہ آتی جاتی ہوئی ایڑہوسٹس پر اچھتی سی نظر ڈال کر کھڑکی کے شیشے سے باہر کی طرف دیکھنے لگتا تھا اور کبھی اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی جانب دیکھنے لگتا تھا۔ سفر لمحہ بہ لمحہ مختصر ہوتا جا رہا تھا۔ اس سے اگلی سیٹ پر شوہا اور جولی بیٹھی تھیں جبکہ بالکل اگلی سیٹ کے کونے میں وہ چینی چیانگ بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس نے اخبار کھول کر اس طرح اپنے چہرے کے سامنے پھیلا رکھا تھا جیسے وہ نہ چاہتا ہو کہ کوئی بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے سکے۔

بہلی کا پڑ اور پھر اب جہاز کے سفر کے درمیان چار دنوں کا وقفہ تھا اور جب ان چار دنوں میں بھی کسی کام میں ذرا سی بھی رکاوٹ پیش نہیں آئی تو رگھوپتی نے اطمینان کا سانس لیا تھا اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ آئندہ بھی سارا کام کسی رکاوٹ کے بغیر آرام سے ہو جائے گا۔ جنگل میں چھتے تیور کے حملے سے زخمی ہو کر بے ہوش ہو جانے والا ان کا ساتھی رگھوناتھ بدھ کی صبح کو ہوش میں آگیا تھا اور تب سریندر موہن نے ڈاکٹر کی موجودگی میں ہی اسے اشارے سے بتا دیا تھا کہ ستاون لاکھ روپے کی رقم ان کے ہاتھ میں آچکی ہے۔ اس وقت رگھوناتھ اپنے زخموں کو بھول کر مسکرانے لگا تھا۔ پھر سریندر کی دی ہوئی انگوٹھی کو اپنی انگلی میں پہن کر اس نے اشارے سے سریندر کو سمجھایا تھا کہ اس کی طرف سے ذرا بھی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ”میرے جائے گا لیکن اپنا راز کسی پر ظاہر نہیں ہونے دے گا۔“

پیشکش قبول کی تھی تو جولی نے اس کی احسان مند ہو کر اس کا شکریہ ادا کیا تھا لیکن بیچاری جولی یہ کہاں جانتی تھی کہ نیپال کی سرزمین ہی شوہا کی آخری خواہش بن کر رہ گئی ہے۔ برسوں سے انتقام کی جو آگ اس کے سینے میں جل رہی ہے، اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کا موقع تو اسے نیپال میں ہی ملے گا..... ”میں کیسے عجیب و غریب کام کے لیے تمہیں نیپال لے جا رہی ہوں؟“ اچانک جولی نے کسی گنگار کی طرح کہا تو شوہا نے اچانک چونک کر اس کی طرف دیکھا مگر جولی سر جھکائے کہہ رہی تھی۔ ”نیپال میں تمہارا اغوا ہو جائے اور وہ درندہ تمہاری عصمت دری کرے تب ہی ہمارا کام پورا ہو سکتا ہے۔ اس بات کو کہنا بھی بڑی بے ہودہ سی بات لگتی ہے۔ اس نقاب پوش درندے کو فلم کے پردے پر دیکھتے ہی میں کپکپا کر رہ گئی تھی۔ اس وقت مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی میرے دل کو مٹھی میں لے کر دیوچ رہا ہو لیکن اس کے باوجود میں تمہیں اس شیطان کے پنجے میں دھکیلنے کے لیے تیار ہو گئی ہوں۔“

جولی کی بات سن کر شوہا چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ بولی۔ ”جولی تم محض جس کے تصور سے ہی کانپ جاتی ہو، اس درندے کو تو میں بہت پہلے ہی اپنے جسم پر برداشت کر چکی ہوں۔ موج اڑانے کے لیے یہ مرد لوگ کیسی کیسی ترکیبیں آزماتے رہتے ہیں..... خیر جانے دو اب باتوں کو، کیونکہ تم سنو گی تو تمہیں الٹیاں آنے لگیں گی لیکن اب مجھے جوش آگیا ہے۔ وہ نقاب پوش درندہ چاہے میرا تھوڑا بہت خون ہی کیوں نہ چوس لے لیکن میں اس کا چہرہ بے نقاب کر کے ہی واپس آؤں گی۔“

”واپس آؤں گی؟“ جولی عجیب اداس لہجے میں بڑبڑائی۔ پھر تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ دھیرے سے بولی۔ ”کیا خود کو بے نقاب کر دینے والے کو وہ زندہ واپس آنے دے گا؟“

”اگر میں زندہ واپس نہ بھی آؤں تو بھی میرے لیے زندہ رہنے کے لیے اب باقی ہی کیا رہ گیا ہے؟“ شوہا نے بڑے اداس لہجے میں سر جھکا کر جواب دیا۔ پھر آگے بولی ”لیکن اس سے پہلے مجھے نیپال میں اپنا ایک آخری کام کرنا بہت ضروری ہے۔“

”آخری کام؟“ جولی نے چونک کر پوچھا۔ ”اور وہ بھی نیپال میں؟ لیکن شوہا تم



”میں پتا نہیں دوں گا لیکن فون نمبر تمہیں دے دیتا ہوں۔“ چیانگ نے ایک کانفڈنٹ فون نمبر لکھ کر اس کے حوالے کر دیا اور بولا۔ ”اس فون نمبر پر فون کر کے پوچھ لینا کہ ڈریگن کے مال کی ڈیلیوری لینے کے لیے کہاں آیا جائے؟ پھر فون پر جو پتا بتایا جائے وہاں جا کر ڈیلیوری لے لو۔“ اتنا کہہ کر چیانگ نے نوٹوں کی گڈی میں سے سو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور بڑے اطمینان سے اس کے دو ٹکڑے کر کے ایک ٹکڑا رکھوپتی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”نوٹ کا یہ آدھا ٹکڑا لے کے جاؤ گے تو تمہیں پرنٹس کی ڈیلیوری مل جائے گی۔“

”اب ہمیں لین دین کی بات سمجھ لینی چاہیے۔“ رکھوپتی نے نوٹ کا آدھا ٹکڑا اور ٹیلی فون نمبر کا کانفڈ اپنی جیب میں سرکاتے ہوئے کہا۔ ”تم سے ساڑھے پندرہ لاکھ پر معاملہ طے ہوا تھا جس میں سے ساڑھے تین لاکھ ابھی تمہیں دیئے گئے ہیں، باقی رہ گئے بارہ لاکھ جس میں سے دو لاکھ تمہیں اس وقت ملیں گے جب تم نیپال میں قلم کے آخری سین کی قلبندی مکمل کر لو گے اور دس لاکھ تمہیں یہاں دہلی میں اس وقت دیئے جائیں گے جب تم آخری قلم کے پرنٹس کی ڈیلیوری دو گے، ٹھیک ہے نا؟“

”ٹھیک ہے۔“ چیانگ نے کہا تھا ”لیکن تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ دس لاکھ روپے یہاں دہلی میں کس کو دینے ہیں؟“

”ہاں یہ میں نے پوچھا نہیں ہے۔“ رکھوپتی نے کہا تھا۔ ”لیکن مجھے اس کا اندازہ ہے۔“ رکھوپتی کی یہ بات سن کر چیانگ چونک پڑا تھا۔ پھر اس نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے پوچھا تھا ”لیکن اگر تمہارا اندازہ غلط ثابت ہوا تو؟“

”تو؟“ رکھوپتی کو اپنا کاسینو کا زمانہ یاد آگیا اور وہ مسکرا کر بولا ”تو ہو گئی پچاس ہزار کی شرط، بولو منظور ہے؟“

”منظور ہے۔“ چیانگ خوش ہو کر بولا۔ ”اگر تمہاری بات غلط نکلی تو تم مجھے پچاس ہزار روپے زیادہ ادا کرو گے اور نہیں تو میری رقم میں سے تم شرط کے پچاس ہزار کاٹ لینا۔ اب بتاؤ کون ہے وہ شخص؟“

”تمہاری لیڈی پارنٹر سلطانہ بیگم.....“ رکھوپتی نے جواب دیا۔

یہ نام سن کر چیانگ ایک جھٹکے سے اس طرح اچھل پڑا کہ اس کی انگلیوں میں دبا

صبح کے سوا دس بجے ہیلی کاپٹر کی گھر گھراہٹ سن کر وہ جلدی جلدی قلم کی شوگر کا بہانہ کر کے مختلف کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ جنگل کے اطراف میں رہنے والے تیس چالیس دیہاتی لوگوں کے سوا وہاں اور کوئی قابل ذکر افسر وغیرہ نہیں تھا جو ان کی اس جھوٹ موٹ کی شوٹنگ کو دیکھ سکتا..... اور پھر جولی اور رکھوپتی اپنے پلان کے مطابق سترہ لاکھ اور ساٹھ ہزار روپے کے تھیلے لے کر ہیلی کاپٹر میں الہ آباد کی جانب روانہ ہو گئے تھے۔ دوسرے روز الہ آباد سے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی واپس پہنچ کر رکھوپتی نے اپنے پلان کے مطابق چیانگ کو پانچ لاکھ روپے دے دیئے تھے۔ اس وقت پانچ لاکھ کی رقم دیکھ کر چیانگ کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرانے لگی تھی اور پھر اس نے رکھوپتی سے کہا تھا۔ ”واقعی اب مجھ میں کام کرنے کی گرمی آگئی ہے۔ اب بتاؤ ہمیں کب نیپال جانا ہوگا؟“

”ڈریگن“ رکھوپتی نے اسے اس کے فرضی نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا..... ”اس پانچ لاکھ میں سے ڈیڑھ لاکھ روپے میں نے تمہیں ییکٹو سے ایک سو پرنٹ نکوانے کے لیے دیئے ہیں۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ تمام پرنٹس کون کہاں اور کب تک تیار کر کے دے گا؟“

”پرنٹس کون کہاں تیار کرنے گا؟ یہ تو میں نہیں بتاؤں گا۔“ چیانگ نے کہا تھا۔ ”کیونکہ یہ کام بڑی رازداری سے ہونے والا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کتنے دنوں میں یہ کام ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہفتے اور اتوار کی دو روز کی چھٹیوں کا ہی یہ کام ہے۔“

”ٹھیک ہے تو تم ان دو دنوں میں ہی یہ کام کر ڈالو.....“

”یہ کام تو ہو جائے گا لیکن.....“ چیانگ بولتے بولتے تھوڑی دیر کے لیے رکا، پھر آگے بولا ”لیکن پرنٹس کی ڈیلیوری تو اس وقت ہوگی جب میرے ییکٹو کی رقم دس لاکھ مجھے مل جائے گی۔“

”دیکھو ڈریگن ہم پیسہ ادا کیے بغیر کوئی کام نہیں کریں گے۔“ رکھوپتی کے لیے میں ذرا سختی آگئی تھی۔ ”اب آئندہ کبھی ایسی بات مت کرنا۔ تمہیں وہ پتا تو بتانا ہی ہوگا کہ پرنٹس کی ڈیلیوری کہاں سے ملے گی اور ڈیلیوری لینے والے کو کہاں جانا ہوگا؟“

ہوا سگریٹ اچھل کر سامنے بیٹھے ہوئے رگھوپتی کی گود میں جا گرا تھا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ پلکیں جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملائے ہوئے مسکرا کر بولا۔ ”تم سچ بڑے چالاک ہو، میرے پچاس ہزار تم جیت گئے۔“

”ہم کاسینو والے لوگ اس طرح جیتنے والوں کو شاباش دیتے ہیں۔“ رگھوپتی چیانگ کا نازک ہاتھ دبا کر پر جوش لہجے میں بولا۔ ”اور ہارنے والے کو ہم بے وقوف نہیں کہتے۔“

”لیکن میں تو خود کو بے وقوف ہی کہوں گا۔“ چیانگ اپنی نازک انگلیاں سہلاتے ہوئے بولا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری نجی پارٹنرشپ کی بات کا تمہیں کیسے پتا چل گیا؟“

”یہ بھی مجھے بتانا ہو گا؟“ رگھوپتی اپنا سر کھجا کر جواب تلاش کرتے ہوئے بولا۔ ”اصل میں تمہاری یہ سلطانہ بیگم بنگلہ دیش کے سفارت خانے میں ایک آفیسر کی حیثیت سے کام کرتی ہے اور بنگلہ دیش اور چین کی دوستی اتنی پوشیدہ بھی تو نہیں ہے۔“

”تم بڑے بد معاش آدمی ہو۔“ چیانگ ہنس کر بولا۔

”چالاک آدمی کو بد معاش نہیں کہتے۔“ رگھوپتی بولا۔

”باتوں میں، میں تم سے نہیں جیت سکتا۔“ چیانگ پھر ہنس پڑا۔

”تو بقیہ ہار جیت ہم نیپال کے کاسینو تک نلتوی رکھتے ہیں۔“ کہہ کر رگھوپتی نے باتوں کا رخ موڑ دیا اور بولا۔ ”اتوار کی صبح کو ہم انڈین ایئر لائن کی فلائٹ سے نیپال جانیں گے لیکن جہاز میں ساتھ سفر کرنے کے باوجود ہم ایک دوسرے سے اجنبی ہوں گے۔“

پھر دہلی کے ایئر پورٹ پر چیانگ کو رخصت کرنے کے لیے اس کی بنگلہ دیشی پارٹنر سلطانہ بیگم بھی آئی تھی۔ وہاں جب جولی اور سلطانہ بیگم کا آمناسامنا ہوا تو پہلے تو وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر چونک پڑیں لیکن دوسرے ہی لمحے دونوں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

”سلطانہ میں پیکنگ گیسٹ کی حیثیت سے تمہارے گھر پر رہتی تھی لیکن جب میں

ہمارا گھر چھوڑ کر جا رہی تھی تو تم نے پوچھا تھا کہ تمہارا بوائے فرینڈ کون ہے؟“ جولی سلطانہ کو مخاطب کرتے ہوئے وجے کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔ ”ان سے ملو، یہ مسرو وجے کمار، میرے ہونے والے شوہر.....“

سلطانہ بیگم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جولی کی پسند کی داد دی اور پھر وجے سے چلا کر بولی۔ ”یو آر ویری کئی جولی، خدا کرے تم دونوں کو کسی کی نظر نہ لگے۔“

جولی تو سلطانہ بیگم کی بات سن کر خوش ہوئی تھی لیکن چیانگ ذرا گھبراہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ ”ذرا خود کو سنبھالو سلطانہ بیگم، تمہیں اس خوبصورت نوجوان سے دس لاکھ روپے وصول کرنے ہیں۔ اگر تم اس پر مرثیوں تو نقصان مجھے ہو گا۔“

”تم فکر مت کرو۔“ سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ ”شاید فائدہ بھی ہو جائے، ایسا بھی تو ملتا ہے کہ میں دس کی بجائے اس سے گیارہ لاکھ وصول کر لوں۔“ ان میں یہ نوک جھونک جاری تھی کہ شوہا وجے کو ایک جانب کھینچ کر لے گئی اور ذرا دور جا کر رہے سے بولی۔ ”مجھے آپ سے ایک درخواست کرنی ہے، امید ہے میری غیر ہجرتی میں آپ میرے اپناج باپ کا خیال رکھیں گے۔ اس درمیان آپ انہیں زیادہ پیسے مت دیجئے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے ساتھ نیپال آنے تک وہ کسی سے لڑ کر نہیں.....“

شوہا کی بات سن کر وجے نے وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے اس کے باپ کی طرف دھمکا۔ ماضی کا یہ مرد مجاہد ان دنوں بیٹی کے خون کی کمانی پر اپنی زندگی کے دن گزار رہا تھا وجے نے آگے بڑھ کر اس کے جھکے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ ”اگر تم کو تو میں انہیں یہاں سے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتا ہوں۔ یہ میرے ساتھ ہی رہیں گے اور میرے ساتھ ہی نیپال آجائیں گے۔“

”نہیں..... نہیں.....“ شوہا نے جلدی سے اس کی پیشکش کو رد کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اپنے ڈیڈی کو ایک انتہائی اہم اور نجی کام سونپ رکھا تھا ہے جو آپ سے بھی پوشیدہ رکھنا ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ ہنس پڑی، پھر آگے بولی۔ ”اگر آپ انہیں اپنے ساتھ رکھیں گے تو یہ دو دنوں میں ہی سب اگل دیں گے۔“

”لیکن مجھ سے پہلے تو تم ہی سب کچھ بک رہی ہو شوہا.....“ اپناج اروند آزاد

سے برداشت نہیں ہوا اور وہ بول پڑا۔ ”خیر نیپال جا کر ہشپتی ناتھ سے یہ دعا مانگ کرنا کہ انگریزوں کی گولیوں سے اپناج بن جانے والے تمہارے باپ کو وہ اتنی طاقت دے دے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔“

”آپ کا وطن آگیا۔“ شوہا نے گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بڑے سے بولی۔ ”آپ کے اس وطن میں تو گرمیوں میں بھی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔ بہت خوبصورت ہے یہ نیپال.....“

”ہاں..... یہ سچ بچ دیوتاؤں کی سرزمین ہے۔“ رگھوپتی نے کہا تو اچانک شوہا کے بڑے پر گہری سنجیدگی طاری ہو گئی اور پھر وہ دانت پیس کر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ”نہیں، یہاں صرف دیوتا ہی نہیں بلکہ دیوتاؤں کے درمیان انسانوں کا لہو نینے والے درندے بھی بستے ہیں اور اس حقیقت کو میں بھولی نہیں ہوں۔“

شوہا کی یہ بات سن کر اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی جولی تھرتھرا کر رہ گئی۔ وہ ان کی وسعتوں میں اڑتے اڑتے زندگی کے حسین سپنے دیکھ رہی تھی لیکن زمین پر رکھتی ہی اسے زندگی کی تلخ حقیقتوں کا احساس ہو گیا۔

رگھوپتی جب جولی اور شوہا کے پیچھے پیچھے جہاز کی میڑھیاں اتر رہا تھا تو اچانک اسے اس لاکٹ کی یاد آگئی جس پر ہشپتی ناتھ کی تصویر بنی ہوئی تھی اور اس نے وہ لاکٹ بھی بڑے پیار سے روکھی کے گلے میں ڈالا تھا۔ وہ لاکٹ اس وقت بھی اس کی بائیں مٹھ میں موجود تھا جسے وہ اس وقت روکھی کی گردن سے اتار لایا تھا جب روکھی کے گلے میں پھندہ ڈال کر خودکشی کر لی تھی۔ روکھی کی یاد آتے ہی اس کا ہاتھ کانپ اٹھا اور جب سے لاکٹ نکالتے وقت بے خیالی میں اس کے ہاتھ سے لاکٹ چھوٹ کر زمین کے نیچے زمین پر جاگرا۔ رگھوپتی کا دل بڑی تیزی سے دھڑکا اور وہ آخری تین بیٹے ایک جست میں ہی پھلانگ کر نیچے آگیا۔ پھر جیسے ہی وہ لاکٹ اٹھانے کے لیے اٹھا تو اس کی نظر کھلے ہوئے لاکٹ کے اندر دبے ہوئے ایک کانڈ پر پڑی۔ لاکٹ اندر لٹ پڑنے کے درمیان دبے ہوئے اس چھوٹے سے کانڈ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں رت سے پھیل گئیں۔ اس لیے اس نے جھپٹ کر لاکٹ کے ساتھ ساتھ اس کانڈ کو اٹھا لیا۔

”کیا ہوا؟“ اس وقت شوہا نے اس کے قریب آکر دھیرے سے پوچھا۔ ”کچھ گر اٹھا کیا؟“

اپنے باپ کی یہ دکھ بھری بات سن کر شوہا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے لیکن وہ کہہ نہ سکی کہ وہ خود ہی اس زندگی سے تنگ آچکی ہے مگر وہ نہیں چاہتی کہ وہ روکھی کی طرح بے موت مر جائے۔ اسی لیے خود ہی آگے بڑھ کر اپنی ہر کو گلے لگانے کے لیے وہ تیار ہوئی ہے۔

پھر جب لاؤنچ کے اندر جانے کا وقت آگیا تو سب ہی ایک دوسرے سے رخصت ہونے میں مصروف ہو گئے۔ اس وقت وجے سے ہاتھ ملاتے ہوئے رگھوپتی نے دم سے کہا تھا۔ ”وجے تم اپنا خیال رکھنا اور ہماری کوئی فکر نہ کرنا۔ بھگوان نے ہمارے سب ٹھیک ہو جائے گا..... اچھا اب چلتا ہوں۔“

اتنا کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا لاؤنچ میں آگیا تھا جبکہ جولی اور شوہا لمحوں کی تاخیر کے بعد لاؤنچ میں داخل ہوئی تھیں۔



”اب تھوڑی ہی دیر میں ہمارا جہاز کھنڈو ایئر پورٹ لینڈ کرنے والا ہے۔“ سے درخواست ہے کہ اپنے سگریٹ بجھا دیں اور حفاظتی بیلٹ باندھ لیں، شکریہ۔“

ایئر ہوسٹس کا یہ اعلان سن کر مسافروں کے چہروں پر خوشی اور بے چینی کی سی کیفیت پھیلنے لگی۔ رگھوپتی تو ایئر ہوسٹس کے اعلان سے پہلے ہی سے کھڑکی سے لگا بیٹھا تھا اپنے وطن کی دھرتی کو گھورنے میں مصروف تھا۔ فضاؤں میں بکھری ہوئی دھند پیچھے کھڑے ہوئے۔ پہاڑ اور سرسبز دھرتی پر چرتے ہوئے مویشی اور لاتعداد دیوتاؤں کے چھوٹے بڑے مندر..... اسے اپنا وطن چھوڑے ہوئے محض دو دن ہوئے لیکن ان دو ہفتوں میں کئی عجیب و غریب واقعات رونما ہو گئے تھے اور آسمان ہفتوں میں تو اور نہ جانے کیا کیا ہونے والا ہے.....؟

جہاز کے پہیوں نے جیسے ہی دھرتی کو چھوا تو رگھوپتی، شوہا، جولی اور چیاگ

نہیں دہلی واپس جانے کی ضرورت نہیں ہے رگھوپتی۔ روکھی کا قاتل اب دہلی سے نکل کر یہاں نیپال پہنچ چکا ہے اور میں اس کا پیچھا کرتی ہوئی تم لوگوں کے ساتھ یہاں آئی ہوں۔“ بولتے بولتے شوہا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پھر وہ دانت پیستے ہوئے آگے بولی۔  
”اس کی موت اب یقینی ہے لیکن وہ تمہارے ہاتھوں سے نہیں بلکہ میرے ہاتھوں سے مرے گا“ میری مرضی کے مطابق۔“

شوہا کے لفظ لفظ میں رگھوپتی کو اعتماد کی جھلک نظر آرہی تھی اور انتقام کی آگ کی تیش محسوس ہو رہی تھی۔ پر شورام کے ٹائم بم، روکھی کا قتل اور اس قتل کو خودکشی ظاہر کرنا، دہلی سے روکھی کے قاتل کا نیپال جانا اور نیپال کی راجا شاہی حکومت کے خلاف وجہ اور اس کے ساتھیوں کی بغاوت کی سازش..... یہ سب باتیں سوچتے سوچتے رگھوپتی کو یوں لگ رہا تھا جیسے قدرت خود جو اکیلے پر تلی ہوئی ہو۔ ”ہم لوگ اسی طرح یہاں کھڑے کھڑے سوچتے رہے تو لوگوں کو شک ہو جائے گا۔“ جولی نے اسے دھیرے سے سمجھایا۔ ”چلو یہاں سے چلیں۔“ رگھوپتی نے ایک نظر جولی کی طرف دیکھا اور پھر گلے میں جھولتے ہوئے روکھی کے لاکٹ کو ہاتھ سے سہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا لیکن چند قدم چلتے ہی اس کی خاموشی ٹوٹ گئی اور وہ شوہا کو مخاطب کر کے بولا۔ ”شوہا اگر تم یہ بات جانتی ہو کہ روکھی کو قتل کیا گیا تھا تو پھر یہ بات پولیس سے پوشیدہ کیسے رہی؟“

”پولیس؟“ شوہا نے نفرت سے منہ بنا کر کہا۔ ”کہا جاتا ہے کہ قانون کے ہاتھ لے ہوتے ہیں لیکن کسی کسی آدمی کے ہاتھ تو قانون سے بھی زیادہ لمبے ہوتے ہیں۔“ شوہا چلتی رہی اور بولتی رہی۔ ”جب روکھی کی لاش کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تو اس کے کپڑوں میں سے ایک چٹھی برآمد ہوئی تھی جس میں صرف اتنا ہی لکھا تھا کہ اپنی زندگی سے تنگ آکر میں خودکشی کر رہی ہوں..... جس طرح یہ چٹھی لکھی جاسکتی ہے، اسی طرح پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی تبدیل کی جاسکتی ہے۔ جس طرح پر شورام کو ٹرک کے نیچے کچل دینے کو حادثہ ظاہر کیا جاسکتا ہے تو روکھی کا گلا دبا کر اسے خودکشی کیوں نہیں ثابت کیا جاسکتا؟“

”ہوں.....“ رگھوپتی نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”تب تو پر شورام کی فائل بھی

لیکن رگھوپتی نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور کانفد کے اس پر لپٹ لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنے لگا۔ کانفد پر لکھا تھا..... ”جس کے پاس بھی وہ فائل ہوئی ہے وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔“

اس ایک سطر کی تحریر کو پڑھ کر رگھوپتی کے بدن میں خوف کی لہر دوڑتی چلی گئی۔ ”یہ کیا ہے؟“ جولی نے بھی اس کے پاس آکر پوچھا تو رگھوپتی نے کانفد کا دوا اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور خلاؤں میں گھورتا ہوا بڑے ہی دردناک لہجے میں بولا۔ ”روکھی نے خودکشی نہیں کی ہے بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے۔“ ”یہ بالکل سچ ہے۔“ نے اس تحریر کو پڑھے بغیر ہی جلدی سے کہہ دیا۔ ”روکھی نے خودکشی نہیں کی بلکہ اسے قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کو لٹکا کر یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ اس نے خودکشی کی ہے۔“

”مگر یہ بات تم اب بتا رہی ہو؟“ رگھوپتی غصے میں اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”اب تک تم نے یہ بات کیوں چھپا رکھی تھی شوہا؟“  
”آہستہ بول رگھوپتی۔“ شوہا کی بجائے جولی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”دھیرے سے کہا۔“ اس وقت ہم لوگ ایئر پورٹ پر ہیں۔ ہم ہوٹل پہنچ کر آرام بات کریں گے۔“

لیکن رگھوپتی کے جوش میں کمی نہیں آئی۔ اس نے اپنے دونوں کندھوں کو دیتے ہوئے کہا۔ ”جولی اب آرام کیا اور ہوٹل تک جانے کی بات بھی کیسی؟“ اس وقت دوسری فلائٹ سے دہلی واپس جا رہا ہوں۔“ اتنا کہہ کر اس نے لاک اپنے گلے میں ڈال لیا اور شوہا کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”تم اب بھی خاموش ہو جاتی کیوں نہیں کہ میری روکھی کا قاتل کون ہے؟ کس نے اسے بے موت مارا ایسی ہی ایک دھمکی آمیز چٹھی وجہ کو دہلی میں ملی تھی لیکن اب پر شورام کی والے درندے کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

شوہا اس کو غصے میں آتا دیکھ کر ایک لمحے کے لیے گھبرا سنی۔ رگھوپتی اسے ایک پھرے ہوئے بھوکے شیر سے بھی زیادہ خطرناک اور خوفناک لگتا۔ آخر تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ ”لیکن اس درندے سے اپنا بدلہ لینے۔“

رگھوپتی اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا یعنی گولی ناٹھ کے بھیجے ہوئے پچیس نوجوانوں کی پہلی کھپ یہاں پہنچ چکی تھی اور یہ نیپالی نوجوان بھی انہیں میں سے ایک

تہمارے پاس اگر تین روپے نہ ہوں تو دو ہی دیدو..... ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ اتنا کہہ کر رگھوپتی نے دھیمی آواز میں پوچھ لیا۔ ”ان مسافروں کے سامان کا کیا ہوا؟“

”سارا سامان صحیح سلامت آگیا ہے۔“ کہہ کر نوجوان نے دو روپے اسے واپس کر دیئے اور سلام کر کے جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ رگھوپتی چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہ گیا، پھر جولی کے پیچھے آگے بڑھ کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔



رگھوپتی نے جب راج پروہت گوری شکر کے گھر کے دروازے پر دستک دی تو اس کے پیچھے کھڑی ہوئی جولی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ نیپال آتے ہی وہ رگھوپتی کی جان کھانے لگی تھی کہ کسی طرح ایک بار مجھے وجہ کا گھر دکھا دو۔ میں کسی طرح وجہ کے باپ کو ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے تم کوئی بھی بہانہ کر دینا..... اور آخر رگھوپتی کو اسے وجہ کے باپ کے گھر لانا ہی پڑا تھا۔

”آگے بڑے بھائی؟“ دستک کی آواز سن کر اندر سے ایک بھاری آواز نے کہا اور پھر دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ رگھوپتی اور جولی اس کمرے سے جھکے ہوئے بوڑھے شخص کو دیکھ کر چونک پڑے۔ یہ اس گھر کا بوڑھا نوکر مان سنگھ تھا جو وجہ کے واپس آجانے کی آس لگائے بیٹھا رہتا تھا۔ اس لیے اس نے دستک کی آواز سنتے ہی دروازہ کھول دیا تھا لیکن جب اس نے اپنے سامنے وجہ کو نہیں پایا تو اس لمحے میں بڑبڑا کر بولا۔ ”آج بھی نہیں آئے.....“

مان سنگھ کی اس اداسی نے جولی کو کپکپا کر رکھ دیا کیونکہ وجہ نے کئی بار اس سے مان سنگھ کا ذکر کیا تھا اور ایک بار تو اس نے یہ بھی کہا تھا۔ ”جولی میں مان سنگھ کی طرف سے بھی فکرمند ہوں۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ میرے آنے کے بعد کہیں وہ بھی گھر چھوڑ کر چلا نہ گیا ہو۔ اس کا تو دنیا میں کوئی بھی نہیں

روکھی کے قبضے سے نکل چکی ہوگی۔“

شوہانے بات کا جواب یا تو ٹال دیا تھا یا پھر کسٹم کا عملہ سامنے نظر آگیا تھا جس کی وجہ سے اسے جواب دینے کا موقع نہیں مل سکا اور رگھوپتی نے بھی اپنا سوال دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ دوسرے تمام مسافروں سے سب سے آخر میں کسٹم کاؤنٹر پر پہنچے تھے لیکن کسٹم عملے کے بہت سے لوگ رگھوپتی سے واقف تھے، اس لیے انہیں وہاں زیادہ دیر نہیں لگی۔ عملے نے ان تینوں کو جلد ہی فارغ کر دیا تھا اور وہ سب سے پہلے ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل آئے۔“

ایئرپورٹ کی عمارت کے باہر ہی شالٹی اورائے ہوٹل کی وین کھڑی تھی لیکن رگھوپتی کو چونکہ شوہانے سے بہت کچھ پوچھنا تھا، اس لیے اس نے وین کی بجائے ٹیکسی میں جانے کا فیصلہ کیا تاکہ اطمینان سے شوہانے سے باتیں کر سکے۔ اپنا اپنا سامان اٹھائے وہ تینوں ٹیکسی کے لیے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک ایک نیپالی نوجوان سامان اٹھانے کے لیے ان کی طرف دوڑا اور بولا۔ ”لایئے صاحب..... سامان.....“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ رگھوپتی نے نیپالی زبان میں جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ نیپالی نوجوان زبردستی اس کے ہاتھ سے جب سوٹ کیس لینے لگا تو رگھوپتی نے غصے میں اس سے کہا۔ ”میں نے تمہیں منع کیا ہے نا؟ تم جبرزدوری کرتے ہو یا زبردستی؟“

”جئے ہشپتی ناٹھ“ نیپالی نوجوان نے دونوں ہاتھ جوڑ کر دھیرے سے کہا تو رگھوپتی کی آنکھوں سے غصے کے تاثرات یکایک ہی غائب ہو گئے۔ ”جئے ہشپتی ناٹھ“ رگھوپتی کو اس کے سلام کا جواب دینا پڑا اور پھر اس نے اپنا سوٹ کیس اس نوجوان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے آگے کہا۔ ”اسے اس سامنے والی ٹیکسی میں رکھ دو۔“

”تھینک یو سر.....“ کہہ کر اس نیپالی نے خوشی خوشی ان کا سارا سامان ٹیکسی میں رکھ دیا۔ رگھوپتی نے اپنی جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لو دو روپے کاٹ کر تین روپے واپس کرو۔“ نیپالی نوجوان نے پانچ کا نوٹ اس کے ہاتھ سے لیا اور تین روپے واپس کرنے کے لیے اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے دھیرے دھیرے بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”کل پچیس مسافر نیپال آچکے ہیں۔“

دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام کر کے بری طرح چونکا دیا۔ اندرانی کو ایک گوری چڑی والی لڑکی سے اس قسم کی توقع نہیں تھی۔ یکایک ایک خیال تیزی سے اس کے ذہن میں ابھرا کہ کہیں رگھوپتی اسے سمجھا بجھا کر تو اس کے پاس نہیں لے آیا؟

”کیوں رگھوپتی..... اسے اپنی بہو بنا کر تو نہیں لے آئے؟“ اندرانی سے برداشت نہیں ہو اور آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔ رگھوپتی اس کی یہ بات سن کر چونک پڑا لیکن نیپالی زبان سمجھنے والی جولی اس کی بات سن کر دل ہی دل میں ہنس پڑی۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ اندرانی سے کہہ دے کہ میں بہو بن کر تو آپ کے گھر میں آنا چاہتی ہوں..... لیکن یہ بات وہ کہہ نہ سکی۔

”ارے ماں جی.....“ رگھوپتی نے جلدی سے کہا۔ ”یہ تو ٹورسٹ ہے، آسٹریلیا سے آئی ہے۔ پندرہ روز بعد یہاں جو جشن تاج پوشی ہوگی، وہ دیکھنے آئی ہے۔“ میں بھی اسی فکر میں ہوں۔“ اندرانی اپنی بے چینی کو نہ روک سکی اور بولی۔ ”کھیل کے بابا کو میں نے کتنا سمجھایا کہ وہ راج محل جانا شروع کر دیں اور تاج پوشی اپنے ہاتھوں سے ادا کریں.....“ بولتے بولتے وہ پھر رک گئی، شاید اسے جولی کی موجودگی گراں گزر رہی تھی۔

”پروہت جی کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ یہ سوال پوچھا تو رگھوپتی نے تھا لیکن جواب سننے کے لیے جولی اس سے زیادہ بے قرار نظر آرہی تھی۔ ”یسی ہی ہے۔“ اندرانی نے منہ بنایا۔ ”سارا دن اپنے کمرے میں چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں۔ کچھ پوچھنے پر صرف ہوں ہاں میں جواب دے دیتے ہیں۔ وجہ تو اپنا کام کر کے چلا گیا اور ہم یہاں اجڑ کر رہ گئے ہیں۔“ رگھوپتی بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اس عورت نے اپنے سگے بیٹے کھیل کو راج پروہت کی گدی پر بیٹھانے کے لیے اپنے سوتیلے بیٹے کو ملک بدر ہو جانے کے لیے کہا تھا لیکن اس کے باوجود بھی جب مقصد حاصل نہیں ہوا تو اب وہ سارا الزام وجہ پر دھر رہی ہے۔ اگر اس وقت جولی یہاں موجود نہ ہوتی تو رگھوپتی اندرانی کو کھری کھری سنا دیتا۔ سوچتے سوچتے اچانک اسے خیال آیا کہ جب راجا کا ہی تخت نہیں رہے گا تو راج پروہت کی گدی کا آسرا کیوں لیا جائے؟

ہے۔“

”وہاں کیوں کھڑی ہو گئیں جولی؟“ صحن میں چند قدم آگے بڑھ جانے والے رگھوپتی نے پلٹ کر دروازے پر کھڑی ہوئی جولی کی طرف مڑ کر کہا۔ ”کس سوچ میں ڈوب گئی ہو؟“

جولی نے کوئی جواب نہیں دیا اور جلدی سے اس کے قریب آگئی۔ اس نے ماں سنگھ کی طرف نظر ڈالی جو منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے ایک کونے میں بیٹھ گیا تھا۔

”کون آیا ہے ماں سنگھ؟“ اچانک ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ رگھوپتی اس آواز کو فوراً ہی پہچان گیا۔ یہ وجے کی سوتیلی ماں اندرانی کی آواز تھی۔ ”یہ میں ہوں..... رگھوپتی.....“ ماں سنگھ کے جواب دینے سے پہلے ہی وہ بول پڑا۔ ”ارے تم.....؟ آؤ آؤ.....“ اندرانی اپنے گیلے ہاتھوں کو پونچھے بغیر جلدی سے باورچی خانے سے نکل کر برآمدے میں آگئی۔ ”تم پردیس سے کب آئے؟“ اندرانی کے اس سوال میں محبت اور خلوص کی بجائے ایک عجیب سے تجسس کی جھلک محسوس ہو رہی تھی لیکن جب اس کی نظر رگھوپتی کے برابر میں کھڑی ہوئی جولی پر پڑی تو اس کے چہرے کے تاثرات ہی بدل گئے۔ اس نے جلدی اپنا منہ پھیر لیا اور آگے بڑھ کر برآمدے کی لائٹ آن کر دی۔

رگھوپتی سمجھ گیا کہ وجے کی سوتیلی ماں یہ جاننے کے لیے بے قرار ہے کہ میں وجے سے مل کر کیا فیصلہ کر آیا ہوں؟ راجا کے باپ کی جو رقم وجے کو ملی ہے، اس میں سے وہ اپنے بھائی کھیل کو حصہ دینے کے لیے رضامند ہو گیا ہے یا نہیں؟ کھیل کو راج پروہت کی گدی پر بیٹھانے کے لیے اس نے اپنے باپ کو خط لکھ دیا ہے یا نہیں؟ ایسے اور بھی کئی سوالات اندرانی کے دماغ میں اٹھتے تھے لیکن اسے ان سارے ہی سوالوں کو اپنے سینے میں دبا دینا پڑا تھا۔

”آؤ بیٹھو نا۔“ کوچ پر بچھی ہوئی چادر کو ٹھیک کرتے ہوئے اندرانی نے کہا۔ پھر جولی کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟“

لیکن اس سے پہلے کہ رگھوپتی جولی کا تعارف کراتا، جولی نے ہندوؤں کی طرح

بھائے تھے..... لیکن.....

”مجھے یقین تھا کہ میرا بچہ ضرور آئے گا۔“ درمی پر پڑے ہوئے جسم میں ذرا سی بھی حرکت نہیں ہوئی تھی مگر تھرتھراتی ہوئی کمزور آواز جولی کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ”بیٹے تم پھر بھول گئے کہ کمرے کا دروازہ تمہارے قد سے چھوٹا ہے، تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟“ ایک باپ کے دل کی تڑپ نے جولی کی پلکوں کو نم کر دیا اور اس کے ہاتھ آپ ہی آپ وجے کے باپو کے پاؤں دبائے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید وجے کے باپو اٹھ کر بیٹھ جائیں گے اور اسے دیکھ کر اپنی ناراضگی کا اظہار کریں..... لیکن ان خیالوں کے باوجود وہ ان کی خدمت سے خود کو نہ روک سکی۔

”میں نے..... تمہیں بڑی بے رحمی سے ماری پیٹ کر گھر سے باہر نکال دیا تھا۔“ کانپتی آواز میں وہ کہہ رہے تھے۔ ”لیکن پھر بھی تم ایک نیک اور اچھے بیٹے کی طرح میری خدمت کرنے پہنچ گئے۔“ جولی کی آنکھ سے ایک آنسو لڑھک کر ان کے پیر پر گرا تو وہ چونک کر بول اٹھے۔ ”تم رو رہے ہو بیٹے؟“

شاید تم یہ سوچ رہے ہو گے کہ اتنے دنوں کے بعد آنے کے بعد بھی میں بستر سے اٹھ کر تمہاری طرف دیکھ کیوں نہیں رہا ہوں؟“ بولتے بولتے پنڈت گوری شکر زور زور سے سانس لینے لگے۔ پھر ہانپتے ہانپتے آگے بولے۔ ”لیکن جب جب تم اس طرح چپکے چپکے آتے ہو اور میں تمہیں دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں..... تب تب تم میری نظروں کے سامنے سے غائب ہو جاتے ہو۔ سب مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ تم اندھیرے میں آکر اور مجھے دیکھ کر پھر غائب ہو جاؤ گے.....“

ٹھیک اسی وقت نیچے سے رگھوپتی کی آواز سنائی دی۔ ”ارے جولی کہاں چلی گئی؟“ لیکن رگھوپتی کی آواز سننے کے بعد بھی جولی نے پنڈت جی کے پیروں پر سے ہاتھ نہیں ہٹائے۔ وہ دھیرے دھیرے ان کے پاؤں دباتی رہی اور پھر اس وقت اسے وجے کی سوتیلی ماں کی آواز سنائی دی جو رگھوپتی سے کہہ رہی تھی۔ ”میں چونکہ اپنے ساتھ تمہیں کمرے میں لے گئی تھی؟ اس لیے لگتا ہے کہ وہ ناراض ہو کر چلی گئی ہے..... یہ

”رگھوپتی بیٹے!“ اندرانی کے لمبے میں یکایک تبدیلی آگئی اور وہ دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔ ”تم ذرا اندر آؤ، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“ رگھوپتی نے ایک بار جولی کی طرف دیکھا اور پھر اندرانی کے پیچھے اندر والے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچ لیا تھا کہ اب تو چند دنوں میں سب کچھ ختم ہونے والا ہے، اس لیے اندرانی کی بات سن لینے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔

دوسری طرف تنہا رہ جانے والی جولی صحن میں ٹہلنے لگی۔ اس کی نظر اچانک زینے پر پڑی اور پھر یکایک ہی اس کے قدم زینے کی جانب بڑھنے لگے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی غیبی قوت اسے اوپر جانے کے لیے مجبور کر رہی ہو۔ جیسے کوئی ان دیکھی قوت اسے زبردستی کھینچ رہی ہو۔ اس نے بالکل خالی الذہن ہو کر زینے پر قدم رکھ دیا اور اوپر چڑھتی چلی گئی۔ اندھیرے میں اسے ہر چیز دھندلی سی نظر آرہی تھی۔ چھوٹے قد کے دروازے پر آتے ہی اس کا سر دروازے کی چوٹ سے ٹکرایا اور اس کے ساتھ ہی اندر کی جانب سے ایک آواز سنائی دی۔ ”کون؟“

کسی گہرے کنویں میں سے آتی ہوئی اس آواز نے اسے ایک لمحے کے لیے کپکپا دیا اور وہ یہ بھی بھول گئی کہ اس کے سر پر چوٹ لگی ہے۔ ابھی وہ واپس لوٹ جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اسی وقت اسے پھر وہی آواز سنائی دی۔ ”وجے بیٹا..... تم آگئے؟“

جوان بیٹے کی جدائی میں بیمار بوڑھے باپ کے ان الفاظ نے جولی کے تن بدن میں ایک سنسناہٹ سی پیدا کر دی اور وہ واپس جانے کا ارادہ ملتوی کر کے سیدھی دروازے کے اندر آکر اپنی اندھیرے کی عادی ہو جانے والی آنکھوں سے اس نے دیکھا کہ سامنے دیوار کے قریب کچھی ہوئی ایک درمی پر گرم شال اوڑھے کوئی سو رہا تھا۔ جولی دبے قدموں آگے بڑھ کر درمی کے قریب پہنچ کر جھکی۔ اس کے ہاتھ اس طرح دھیرے دھیرے وجے کے باپ کے قدموں کو چھونے کے لیے آگے بڑھے جیسے محبت اور عقیدت کے ہاتھوں وہ بے بس ہو گئی ہو۔

اس نے اپنے ہاتھ تورا ج پروہت گوری شکر کے پیروں کو چھونے کے لیے ہی

گوری لڑکیاں واقعی بڑی مغرور ہوتی ہیں۔“

”نہیں ماں جی.....جولی ایسی لڑکی نہیں ہے۔“ رگھوپتی نے جواب دیا اور ٹھیک اسی وقت اس کی نظر جولی کے سینڈل پر پڑی جو زینے کے پاس پڑے تھے۔ ”لگتا ہے وہ اوپر چلی گئی ہے۔“ اتنا کہہ کر رگھوپتی آگے بڑھا لیکن اوپر آنے کے بعد بھی وہ چاروں طرف اندھیرا دیکھ کر گھبرا گیا اور سوچنے لگا، وہ اندھیرے میں یہاں کیا کر رہی ہوگی؟

کمرے میں آکر اس نے روشنی کرنے کے لیے جیسے ہی سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ ویسے ہی کسی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے چونک کر گردن گھمائی تو جولی ناک پر انگلی رکھ کر سامنے کھڑی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ رگھوپتی اس سے کچھ پوچھتا، وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر زینے تک لے گئی۔

”وجہ بیٹا! پھر اسی طرح آتے رہنا.....“ پنڈت جی کی آواز رگھوپتی کی سماعت سے بھی ٹکرائی اور اس نے جولی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا لیکن جولی نے کوئی جواب نہیں دیا اور اسے نیچے چلنے کا اشارہ کیا۔ رگھوپتی کچھ کے بغیر چپ چاپ اس کے ساتھ چلتا ہوا گھر کے باہر نکل گیا۔ ان دونوں کو اوپر سے نیچے آکر اور پھر چپ چاپ باہر جاتے دیکھ کر اندرانی دل ہی دل میں یہ سوچنے لگی کہ اوپر جا کر ان دونوں نے نہ جانے کیا بات کی ہوگی؟

گھر سے تھوڑی دور جاتے ہی رگھوپتی نے بے صبری سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے جولی؟ تم نے مجھے وجہ کے باپو سے ملنے بھی نہیں دیا۔ کیوں مجھے جلدی سے باہر لے آئیں؟“

”اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ان کے وہم کو توڑنا نہیں چاہتی تھی۔“ جولی نے ایک سرد آہ بھری اور آگے کہا۔ ”باپو جی یہ سمجھتے تھے کہ ان کا بیٹا وجہ چھپ چھپا کر ان سے ملنے آیا ہے۔ جب تک میں ان کے پاؤں دباتی رہی، اس وقت تک وجہ سمجھ کر مجھ سے باتیں کرتے رہے.....اولاد کی جدائی کتنی جان لیوا ہوتی ہے، اس کی تڑپ کا اندازہ ہم لوگ نہیں لگا سکتے رگھوپتی۔“

”تب تو لگتا ہے ان کا دماغ.....“

”نہیں.....نہیں.....“ جولی نے جلدی سے رگھوپتی کو ٹوک دیا اور بولی۔ ”یہ



نیپال کے رائل کاسینو میں کافی بھیڑ جمع ہوئی تھی۔ آس پاس کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ مختلف قسم کے کھیل میں لگے ہوئے تھے۔ رگھوپتی ان سب کو دیکھتا ہوا دیرے دیرے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک سامنے سے کاسینو کا بنگالی مینجر اس کے سامنے آگیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”ارے رگھوپتی تم؟ تم بڑے اچھے وقت پر آئے ہو۔ یہاں جشن تاج پوشی کا دن جیسے جیسے نزدیک آتا جا رہا ہے۔ ویسے ویسے کاسینو میں رش بڑھتا جائے گا۔ دس اپریل سے لے کر سترہ اپریل تک تو کاسینو کا دھندہ خوب زوروں پر ہوگا۔ تاج پوشی کی رسم دیکھنے کے لیے دوسرے ملکوں سے بھی سیاحوں کی آمد شروع ہو چکی ہے۔ ایسے میں ہمیں تم جیسے آدمی کی سخت ضرورت محسوس ہوگی۔“

”لیکن بسواس صاحب میں دوبارہ ملازمت کرنے نہیں آیا ہوں۔“ رگھوپتی نے منکراتے ہوئے کہا۔ ”میں تو اب اپنا ذاتی کاروبار کرنے والا ہوں۔“

”یہ تو تم دس پندرہ روز بعد بھی شروع کر سکتے ہو۔“ بنگالی مینجر بسواس بابو نے کہا۔ ”اس وقت کاسینو میں تمہارے جیسے آدمی کی ہی ضرورت ہے۔ بولو اپنی خدمات کے عوض تم کیا چاہتے ہو؟ ہم تمہیں منہ مانگی رقم دینے کے لیے تیار ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“ رگھوپتی اپنا سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میری ایک شرط ہے، اگر وہ مان لیں تو میں تیار ہوں۔ میری شرط یہ ہے کہ میں کاسینو میں ٹھیک وقت پر آجاؤں گا لیکن اگر میرا کوئی کام پڑ گیا تو میں چلا جایا کروں گا۔“

”مجھے منظور ہے۔“ مینجر نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ”تمہارے وقت کی کوئی پابندی نہیں ہوگی، تم جب چاہو آؤ اور جب چاہے چلے جاؤ۔“



مبذول کرانے میں تو کامیاب ہے لیکن ابھی تک راستہ نہیں بھولی ہے۔“

”اور جولی؟“ وجے روزانہ ایک آدھ بار ہوٹل میں فون کر کے جولی سے بات کر لیتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ رگھوپتی سے بھی اس کی خیریت ضرورت معلوم کر لیتا تھا اور کہتا تھا۔ ”رگھوپتی وہ فون پر مجھ سے ٹھیک سے بات نہیں کر پاتی۔ لگتا ہے سخت ٹینشن میں مبتلا ہے۔“

”اسے کوئی ٹینشن نہیں ہے بلکہ وہ فراق میں اداس ہے۔“ رگھوپتی اسے خوش رکھنے کی کوشش میں ادھر ادھر کی باتیں سنا دیتا تھا لیکن چوتھے روز بھی جب شوہا کے ساتھ کوئی حادثہ وغیرہ نہیں ہوا تو رگھوپتی کی بے چینی بڑھ گئی۔ صبح، دوپہر اور رات کو شوہا بالکل الگ الگ جگہوں پر گھومنے کے لیے چلی جاتی تھی اور کوشش کرتی تھی کہ ہر وقت وہ لوگوں کی نظروں میں رہے لیکن اس کے باوجود وہ جن لوگوں کی نظروں میں آنا چاہتی تھی، ان سے ابھی تک دور تھی۔ اکثر رات کو وہ کاسینو میں آکر کھیلنے بھی لگتی تھی۔ ہار جیت کی پروا کیے بغیر وہ کھلے ہاتھ سے کھیلتی رہتی لیکن جب کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی تو اپنی میز بھی بدل لیتی تھی۔ اپنے ہر انداز سے وہ یہی ظاہر کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی کہ وہ امیر گھرانے کی گزری ہوئی لڑکی ہے اور اب تو اس کے بارے میں ہوٹل کی لابی میں بھی سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔ لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے تھے کہ یہ بہمنی کے کسی مالدار گھرانے کی لڑکی ہے جو تاج پوشی کا جشن دیکھنے کے لیے نیپال آئی ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ جہاں بھی جاتی تھی، وہاں سے صبح سلامت واپس آجاتی تھی اور تب رگھوپتی کو لگتا تھا کہ آج کا یہ دن بھی ضائع ہو گیا۔

دوسری طرف جولی بھی سوچتی رہتی تھی کہ کہیں اسی طرح بارہ اپریل کا دن بھی نہ گزر جائے..... اس درمیان اگر شوہا کا اغوا نہیں ہوا اور اس نقاب پوش درندے کے چہرے سے نقاب اتارنے کی فلم نہ بن سکی تو کیا ہوگا؟

شام کے وقت جولی سے ملاقات کے دوران رگھوپتی نے اس سے اپنی بے چینی کا اظہار کیا تو جواب میں جولی نے اس سے کہا۔ ”ہمیں تو یہی سوچ کر آگے بڑھنا ہے کہ تو ہم نے سوچا ہے، وہی ہوگا لیکن اگر یہ ہفتہ بھی خالی ہو گیا اور شوہا کو اغوا کر کے

کوئی تم سے جواب طلب نہیں کرے گا۔ بولو اور کیا چاہیے؟“

”ہاں ایک چیز اور چاہیے۔“ رگھوپتی مینجر کے موٹے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”کبھی کبھی اپنی بنگالی بیوی کے ہاتھ کی بنی ہوئی مچھلی بھی کھلائی ہوگی۔“

”ارے تم میری بیوی کو ہی کھا جاؤ۔“ مینجر زور سے قہقہہ لگا کر بولا۔ ”وہ تو پکا لہو اور کھلانے کے سوا اور کسی کام کی ہی نہیں ہے۔“

یہ سن کر رگھوپتی ہنس پڑا اور پھر وہ اپنی مرضی کے مطابق چند گھنٹوں کے لیے کاسینو میں خدمات انجام دینے پر رضامند ہو گیا۔ یوں بھی اپنے کام کے لیے اسے کاسینو جیسی جگہ کی ضرورت بھی تھی کیونکہ یہ جگہ ایسی تھی کہ اگر کوئی اس سے ملنے کے لیے یہاں آجائے تو کسی کو بھی شک نہیں ہو سکتا تھا اور بہت سارے لوگوں کی موجودگی میں بھی ان کی خفیہ باتیں ہو سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ چینی چیانگ کے ساتھ ملاقات کرنے اور باتیں کرنے کے لیے بھی یہ جوا خانہ بہترین جگہ تھی۔

پچھلے چار دنوں میں گولی ناتھ کے بھیجے ہوئے پورے پچھتر آدمی نیپال میں داخل ہو چکے تھے اور شہر ا ویرائے نگر میں موجود تھا جہاں سے وہ رگھوپتی کو خفیہ اطلاعات اور خبریں بھیجتا رہتا تھا۔ شوہا اور جولی ہوٹل شالٹی اور رائے کے دو الگ الگ کمروں میں ٹھہری ہوئی تھیں۔

نیپال آنے کے بعد پہلی ہی شام کو رگھوپتی شوہا کو کنواری دیوی کے درشن اور ہشہتی دیوی مندر دکھانے کے لیے لے گیا تھا۔ اس وقت جولی بھی ساتھ آگئی تھی لیکن بعد میں انہوں نے یہ طے کیا تھا کہ وہ تینوں ساتھ باہر نہیں نکلیں گے۔ جولی کی ضد سے مجبور ہو کر وہ اسے اسی رات وجے کے گھر لے گیا تھا اور پھر وہاں سے نکل کر وہ دونوں اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف چل پڑے تھے۔ روزانہ رات کو دہلی سے وجے کا فون کاسینو میں آتا تھا۔ رگھوپتی اس سے اشاروں کی زبان میں بات کرتا اور اس طرح وہ دونوں روزانہ ایک دوسرے کو اپنی اپنی خبریں سنا دیتے تھے۔

”شوہا کیسی ہے؟“ جب وجے یہ پوچھتا تو رگھوپتی سمجھ جاتا کہ وجے اصل میں یہ پوچھ رہا ہے کہ شوہا کا اغوا ہوا یا نہیں؟

”خیریت سے ہے۔“ رگھوپتی کو جواب میں کہنا پڑتا۔ ”وہ سب کی توجہ اپنی جانب

اس درندے کے پاس نہ لے جایا گیا تو اسکے بعد ہم سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ مگر رگھوپتی کو دوسری فکر پر شورام والی فائل کے درندے کی بھی تھی۔ شوہا اس کے بارے میں یقیناً کچھ جانتی تھی لیکن وہ زیادہ کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ہر بار اس کا یہی جواب ہوتا تھا۔ ”مقررہ وقت پر میں تمہیں اس کے سامنے لے جاؤں گی اور تمہاری نظروں کے سامنے ہی اس کی زندگی کا خاتمہ کروں گی۔“

”لیکن اگر اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہی تم خود اس درندے کے شکنجے میں پھنس گئیں تو؟“

”تو؟“ شوہا نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کہہ ڈالا تھا۔ ”اس درندے کا پتہ اور اس کو ختم کرنے کا موقع دونوں تمہیں بن مانگے مل جائیں گے..... بس.....؟“

شوہا کے اس جوشیلے اور پر امید جواب سے رگھوپتی کو یقین ہو گیا کہ یہ عورت اپنی دھن کی کچی ہے۔

اس وقت بھی شوہا کاسینو کے ہال میں بار بار جگہ بدل کر جوا کھیلنے میں مصروف تھی۔ رگھوپتی کو آج وہ پچھلے دنوں سے زیادہ خوبصورت اور پرکشش دکھائی دے رہی تھی۔ وہ جس جگہ بھی بیٹھتی، وہاں سے رگھوپتی پر بار بار نظر ڈالتی تھی۔ رگھوپتی اسے اس طرح بے فکری سے کھیلتے دیکھ کر سوچنے لگا تھا کہ اس کے کافی سمجھانے کے باوجود بھی شوہا نے اس سے روپے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اب تک اپنے خرچے پر ہی وہ یہ سب کچھ کر رہی تھی۔ اس نے رگھوپتی کو یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر اس سے روپے لینے کے لیے زبردستی کی گئی تو وہ اپنا یہ مشن چھوڑ کر دہلی واپس چلی جائے گی۔

اچانک رگھوپتی کو خیال آیا کہ تھوڑی دیر قبل فلش کی میز پر چیانگ بیٹھا تاش کھیل رہا تھا لیکن اب اس کی کرسی خالی پڑی ہے۔ آخر وہ کہاں چلا گیا؟



کھیلتے کھیلتے اگر اسے ہاتھ روم وغیرہ جانے کی ضرورت محسوس ہوتی تو بھی اس کی بازی چلتی رہتی تھی۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنے ساتھ کھیلنے والوں سے کہہ جاتا تھا کہ اس کی بازی جاری رکھی جائے اور جب تک وہ واپس نہ آجائے، اس وقت تک بند پڑوں پر چال چلتی رہے۔ ایک بار جب وہ ہاتھ روم سے واپس آیا تھا تو اس کی بند بازی نے اس کے دس ہزار روپے کم کر دیئے تھے لیکن اس وقت تو اس کی کرسی خالی تھی اور اس کی جگہ پر اس کے پتے بھی نہیں باٹھے گئے تھے، ابھی تو صرف رات کے گیارہ ہی بجے تھے جبکہ چیانگ صبح کے چار بجے سے پہلے کبھی میز چھوڑ کر نہیں جاتا تھا۔

رگھوپتی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ کس سے پوچھا جائے، تب ہی کاسینو کے ایک کارکن لڑکے نے آکر اس سے کہا۔ ”چیانگ صاحب ٹیلی فون والے کمرے میں آپ کو بلا رہے ہیں۔“

یہ سنتے ہی رگھوپتی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اسے کچھ ڈر بھی لگا تھا کہ کہیں کوئی گزربڑ نہیں ہو گئی؟ لیکن ٹیلی فون والے کمرے میں جا کر جب اس نے چیانگ کے ہونٹوں پر مکرہٹ دیکھی تو اسے کچھ اطمینان سا محسوس ہوا اور وہ آگے بڑھ کر بولا۔ ”کیا بات ہے ڈرگین؟ تم اپنی بازی چھوڑ کر یہاں کیوں آ گئے ہو؟“

”میری بازی ٹھیک سے جم گئی تھی کہ اچانک ایک فون آ گیا۔“ چیانگ اس کی طرف دیکھ کر دھیرے سے بولا۔ ”اب مجھے فوراً ہی جانا ہو گا۔“

”کہاں؟“ رگھوپتی کی بے چینی بڑھ گئی لیکن تب ہی چیانگ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا لیا اور اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ”شاید ہمارا کام بن گیا ہے۔ بقیہ فلم بندی شاید آج

ہی مکمل ہو جائے گی۔“

یہ سنتے ہی رگھوپتی نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بولا۔ ”لیکن شوہا تو کاسینو میں موجود ہے۔ اگر کوئی دوسری لڑکی اس درندے کے جال میں پھنسی ہوگی تو ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟“

لیکن اس سے پہلے کہ چیانگ کوئی جواب دیتا، کاسینو کا اسٹنٹ مینجر گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ ”رگھوپتی جلدی چلو۔ ہال میں زبردست ہنگامہ ہو گیا ہے۔ وہ شوہا دیوی.....“

”کیا ہوا شوہا کو؟“ کہتا ہوا وہ ہال کی طرف بھاگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یقیناً شوہا کو کوئی زبردستی اٹھا کر لے گیا ہوگا اور لوگ اسے ایسے ہی واقعے کی تفصیل بتائیں گے لیکن اس کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا کیونکہ ہال میز کے پاس تو ایک اور ہی منظر نظر آ رہا تھا۔

”طوائف ہوگی تمہاری ماں۔“ شوہا نے چیخ کر کہا اور گھونسنہ تان کر ایک ادنیٰ شخص کی طرف لپکتی دکھائی دی۔ ”کینے کال گرل ہوگی تیری بہن۔“ کہہ کر اس نے اس شخص کے پیٹ پر گھونسنہ مارا۔

آس پاس کھڑے ہوئے لوگ دم بخود رہ گئے تھے۔ کوئی کچھ بول نہیں رہا تھا لیکن تب ہی رگھوپتی درمیان میں آگیا۔ کاسینو کے باہر اگر کسی نے شوہا کو چھیڑا ہوتا تو رگھوپتی اسے مار مار کر لہو لہان کر دیتا لیکن یہاں تو اسے معاملے کو سنبھالنے کی ضرورت تھی تاکہ کاسینو کی بدنامی نہ ہو۔

”کیا بات ہے؟“ رگھوپتی نے اس شخص کا جوابی حملے کے لیے اٹھا ہوا ہاتھ پکڑنے ہوئے کہا۔ ”ایک شریف عورت کے ساتھ ایسی بدتمیزی نہیں کرنی چاہیے مسٹر۔“

”شریف عورت؟“ اجنبی شخص اپنی چٹلون کو اپنی کمر پر چڑھاتے ہوئے زور سے بولا۔ ”تین سو روپے میں رات بھر ساتھ رہنے والی دہلی کی بازاری عورت ایک شریف زادی کب سے بن گئی؟“

”ارے تیری ایسی کی تھی۔“ شوہا نے غصے میں کہا اور میز پر پڑا ہوا شیشے بھاری ایش ٹرے اس کے ماتھے پر دے مارا۔ اجنبی شخص کی پیشانی سے خون کی لکیر

بہ نکلی۔ پھر اس سے پہلے کہ ہال میں شور شرابہ اور بڑھ جاتا۔ رگھوپتی نے شوہا کا ہاتھ پکڑا اور اسے سمجھاتا ہوا باہر لے گیا۔ ”پلیز ذرا سوچو شوہا، تم نے اس قدر ہنگامہ مچایا کہ تمہاری اصلیت بھی ظاہر ہو گئی۔“

”کینے؟“ شوہا نے چونک کر کہا۔ ”میں تو اس لیے اس سے لڑ پڑی تھی کہ لوگ اس کی بات کو سچ نہ مان لیں۔ اگر میں چپ رہتی تو لوگ اس کی بات پر یقین کر لیتے۔ اس لیے تمہیں تو مجھے شاباش دینی چاہیے تھی لیکن تم ہو کہ مجھے ہی ڈانٹ رہے ہو۔“

”ڈانٹ نہیں رہا ہوں شوہا۔“ رگھوپتی اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”میں تو تمہیں ہوشیار کر رہا ہوں۔ چلو کمرے میں چل کر بات کرتے ہیں۔“

”تھری ون ٹو۔“ شوہا نے مڑ کر کاؤنٹر سے چابی مانگی اور ایک سگریٹ سٹاک کر کش لینے لگی۔ ابھی بھی اس کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اگر تھوڑے دن قبل اسے کسی نے طوائف یا کال گرل کہا ہوتا تو وہ خود بھی اسے چیلنج دے کر کہہ دیتی۔ ”ہاں، ہاں میں سو بار طوائف ہوں۔ تم میں طاقت ہو تو آجاؤ.....“ لیکن آج کالی بار اسے طوائف ہونے کا طعنہ بہت ہی برا لگا تھا۔

”مس شوہا۔“ ہوٹل کے کاؤنٹر مین نے کمرے کی چابی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اسے چونکا دیا۔ ”آپ کی سیلی مس اینڈرسن کے کمرے کی چابی بھی کاؤنٹر پر ہی پڑی ہے۔ دو روز قبل انہوں نے تاکید کی کہ اگر رات گئے تک کسی روز واپس نہ آؤں تو میری چابی روم نمبر تین سو بارہ کی مس شوہا کو دے دی جائے۔“

”یہ اس نے کہا تھا۔“ رگھوپتی چند لمحوں کے لیے اس طرح ساکت ہو گیا جیسے اس کا دل دھڑکنے ہی بھول گیا ہو۔ پھر اچانک اس کے دماغ میں ایک زوردار دھکا ہوا اور وہ جلدی سے بولا۔ ”شوہا تم کمرے میں جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کاسینو کی طرف بھاگ کھڑا ہوا لیکن اسے ذرا دیر ہو چکی تھی کیونکہ چیانگ کاسینو سے روانہ ہو چکا تھا۔ رگھوپتی نے ہانپتے ہانپتے ہوئے سوچا..... اگر شوہا کی بجائے جولی اٹھا لائی ہوگی تو کیا ہوگا؟ میں وجے کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ یکایک اس نے چیانگ کا پیچھا کرنے کے لیے اپنی دور کھڑی ہوئی موٹر سائیکل کی طرف دوڑ لگا دی لیکن آدھے

چہرے کا نقاب نوپنے کا فیصلہ ہوا تھا تو اس وقت سے میں نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ یہ کام میرے ہی ہاتھوں سے ہوگا..... یہ بات میں نے اس وقت اس لیے نہیں کہی تھی کہ میں جانتی تھی کہ میری بات سن کر وجے ناراض ہو جائے گا اور تم کو بھی برا لگے گا۔ ہمیں روکھی کی موت کا بدلہ لینا تھا، اس لیے میں نے چپ چاپ اس کام کے لیے شوہا کا نام تجویز کیا تھا لیکن درحقیقت میں یہ کبھی نہیں چاہتی تھی کہ بیچاری شوہا اس خطرے میں دھکیل دی جائے..... میں جانتی ہوں کہ اپنے مقصد کے لیے دوسروں کی زندگی کو موت کے منہ میں ڈال دینا ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میں جو کام کرنے جا رہی ہوں، اس میں مجھے خود کو بھی ختم کر دینا ہوگا۔ وجے کو اپنا جیون ساتھی بنانے کا جو خواب لے کر میں اپنا وطن چھوڑ کر یہاں آئی تھی، وہ خواب اب ہمیشہ کے لیے ٹوٹنے والا ہے۔ جس جگہ میں جا رہی ہوں، وہاں سے کبھی واپس آنے والی نہیں ہوں اور اگر واپس آ بھی گئی تو بھی وجے کے لائق رہنے والی نہیں ہوں..... لیکن..... تمہیں روکھی کی قسم دے کر تم سے عاجزی کر رہی ہوں کہ جب تک ہمارا کام ختم نہ ہو جائے، اس وقت تک میری اس حرکت کا وجے کو علم نہ ہونے پائے اور کام پورا ہونے سے قبل درمیان میں پڑ کر اس وطن کے غدار کو فرار ہونے کا موقع مت فراہم کرنا..... نہیں تو موت کے بعد بھی میری روح کو سکون نہیں ملے گا۔“

فقط گنگار

جولی

رگھوپتی دم سادھے کاغذ کو تھامے چپ چاپ کھڑا رہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس میں جان ہی نہ رہی ہو۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھوں میں جب آنسو تیرنے لگے تو یکایک اسے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لینا پڑا۔

”یہ تم نے کیا کیا جولی؟ یہ تم نے کیا کیا؟“ اس کی آواز بھرا گئی اور پھر اچانک ایک جھٹکے سے وہ مڑا اور مستحکم لمبے میں بولا۔ ”نہیں، ہرگز نہیں..... میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“ اتنا کہہ کر اس نے جیسے ہی قدم بڑھایا تو شوہا نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی تھام لی۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“

راستے میں آکر اس کے قدم رک گئے اور وہ سوچنے لگا کہ اگر اسے چپانگ کو پکڑنا ہے تو اسے وہیں جانا پڑے گا لیکن یہ کیسے مان لیا جائے کہ جولی وہیں گئی ہوگی؟ رگھوپتی اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوا واپس ہوٹل کی طرف چل پڑا۔ لفٹ کے ذریعے وہ تیسری منزل پر آگیا لیکن شوہا کے کمرے کی جانب قدم بڑھاتے وقت اس کی نظر تین سو پندرہ نمبر کے کمرے کی طرف اٹھی تو وہ چونک کر رہ گیا۔ یہ جولی کا کمرہ تھا جس کا دروازہ اس وقت کھلا ہوا تھا۔ وہ دروازے پر دستک دیئے بغیر ہی اندر گھستا چلا گیا۔ کمرے کے اندر اس نے شوہا کو دیکھا جو جولی کا بیگ ٹٹول رہی تھی۔ ”کیا کر رہی ہو شوہا؟“ وہ ضرورت سے زیادہ زور دے کر بولا لیکن شوہا نے کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور اسی تیزی سے جولی کے بیگ سے اس کے کپڑے نکالنے لگی مگر پھر تھوڑی دیر بعد خود ہی بڑبڑانے لگی۔ ”جولی نے جس طرح ہوٹل کے کاؤنٹر پر اپنے کمرے کی چابی میرے لیے چھوڑی تھی، اسی طرح اس نے اپنے بیگ کی دوسری چابی بھی میرے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے چابیاں کھو دینے کی عادت ہے۔ اس لیے اسے اپنے پاس رکھو شاید کبھی ضرورت پڑ جائے لیکن اس وقت ہمیں کہاں معلوم تھا کہ وہ ہمیں بے وقوف بنا رہی ہے۔“

”لیکن تم کتنا کیا چاہتی ہو؟“ رگھوپتی گھبرائے ہوئے لمبے میں بولا۔ ”اور تم اس کے بیگ میں کیا ڈھونڈ رہی ہو؟“

مگر شوہا کو جواب دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کیونکہ جولی کی تمہ کی ہوئی زین کی پتلون میں سے ایک سفید لفافہ نکل کر فرش پر گر پڑا تھا۔ شوہا نے جھپٹ کر اس لفافے کو اٹھا لیا۔ لفافے کے اوپر ہی موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا۔ ”مجھے تلاش کرنے سے پہلے.....“

رگھوپتی نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے کھول کر جلدی جلدی پڑھنے لگا۔ جولی نے یہ خط اسی کے نام لکھا تھا۔

”رگھوپتی میں جانتی ہوں کہ اس چٹھی کو پڑھتے وقت تمہارے دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟ پھر بھی لکھتے وقت میں سچے دل سے اپنے خدا سے یہی دعا مانگ رہی ہوں کہ میری اس تحریر کو پڑھنے کا موقع جلد آجائے۔ جب ہمارے درمیان اس درندے کے

ہاں۔  
 باہر آدھی رات کا سناٹا طاری ہونے کے باوجود تھوڑی ہی دیر میں کمرے میں داخل ہونے والے انسان نما درندے کے ناپاک قدموں کی چاپ وہ ابھی سے سن رہی تھی۔ گزرتے ہوئے ایک ایک لمحے کے ساتھ اس کے بدن کی تھر تھراہٹ بڑھتی جا رہی تھی..... وجے کے گھر سے نکلنے کے بعد جولی رگھوپتی سے جدا ہو گئی تھی۔ رگھوپتی کاسینو کی طرف چل پڑا تھا اور وہ ہوٹل جانے کے لیے اپنے راستے پر مڑ گئی تھی۔ اس وقت وہ وجے کے راج پروہت بابا کے بارے میں سوچتی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک ایک کار پیچھے سے آکر اس کے برابر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس وقت سوچ میں ڈوبی ہوئی جولی نے یہی سمجھا کہ شاید بے خیالی میں وہ کار کے نیچے آتے آتے پئی ہے۔ اس لیے یہ کار اس کے برابر میں رک گئی ہے۔ اس نے ذرا پیچھے ہٹ کر گردن گھمائی اور ”سوری“ کہنے جا ہی رہی تھی کہ یکایک پیچھے سے کسی مضبوط پنجے نے اس کا منہ بند کر لیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی، اسے لگا تھا کہ وہ زمین سے اوپر اٹھتی جا رہی ہے اور پھر اسے کار کے کھلے ہوئے دروازے میں ڈال دیا گیا۔

پھر کار اشارت ہونے کی آواز اس کی سماعت سے نکلرائی تھی لیکن اس وقت اس کی آنکھوں پر کالی پٹی چڑھا دی گئی تھی۔ اس کے دونوں جانب دو آدمی موجود تھے جن کی تیز تیز سانسوں اور پسینے کی بو سے وہ بری طرح گھبرا رہی تھی مگر وہ تھوڑی دیر تک دم سادھے بیٹھی رہی اور دل ہی دل میں سوچتی رہی کہ آخر وہ گھڑی آہی گئی جس کا اسے انتظار تھا۔ جہاں وہ جانا چاہتی تھی، وہیں یہ لوگ اسے لے جا رہے تھے۔ اس کی بند آنکھوں میں اس نقاب پوش درندے کی پرچھائیں ابھر آئی تھیں اور پھر سوچتے سوچتے ہی اسے لگا کہ جیسے وہ اس کے چہرے کا نقاب اپنی پوری طاقت سے نوج کر اسے بے نقاب کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

”چپ چاپ بیٹھی رہو۔“ اس کے داہنے جانب بیٹھے ہوئے شخص کے پنجے کی گرفت اس کے بازو پر سخت ہو گئی۔ بولنے والے نے انگریزی میں یہ دھمکی دی تھی، اس لیے اسے یقین ہو گیا کہ اس کو اغوا کرنے والوں کو اسکے بارے میں سب کچھ سکھا پڑھا کر بھیجا گیا ہے لیکن وہ یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتی تھی کہ وہ راضی خوشی سے

”مہمان محل میں۔“ کہہ کر اس نے ہاتھ چھڑانے کے لیے جھکا دیا۔ ”اس سے پہلے کہ خون چوسنے والا درندہ جولی پر حملہ کرے، اس سے پہلے ہی جولی کو اس کے پنجے سے رہا کر لاؤں گا۔“

”لیکن جولی نے تو تمہیں روکھی کی قسم دی؟“ شوبھا اس کا راستہ روک کر بولی۔  
 ”اس کے باوجود تم جانا چاہتے ہو؟“

”قسم.....؟“ رگھوپتی بھاری آواز میں بولا۔ ”مردہ روکھی کی قسم سے زیادہ مجھے زندہ جولی کی عزت پیاری ہے۔ اسکی عزت کی حفاظت میرے لیے زیادہ ضروری ہے شوبھا۔“

”تو جانے سے پہلے مجھے ایک بات کا جواب دیتے جاؤ۔“ شوبھا کا چہرہ تنک ہو گیا اور آواز مستحکم ہوتی گئی۔ ”تم لوگ جب مجھے اس درندے کے پنجوں میں دھکیلنے کے لیے یہاں لائے تھے تو اس وقت تمہیں ایسے کسی ظلم کا خیال کیوں نہیں آیا تھا؟ آخر میں بھی تو جولی کی طرح ہی ایک عورت تھی؟“

رگھوپتی سے جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو شوبھا نے اسی لہجے میں آگے کہا۔ ”شاید اس لیے کہ میں ایک کال گرل ہوں اور ہم جیسی لڑکیوں کے پاس عزت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی، ہے نا؟“

”شوبھا۔“ رگھوپتی چیخ پڑا لیکن شوبھا نے رگھوپتی کو آگے بولنے ہی نہیں دیا۔ ”اب تم جا سکتے ہو۔ شاید تمہارے پیچھے تک جو ہونے والا ہے، وہ ہو چکا ہو گا اور تمہارے جانے میں یہاں جو نہیں ہونا چاہیے تھا، وہ ہو چکا ہو گا۔“ شوبھا کے ان الفاظ نے رگھوپتی کے جسم کی ساری طاقت چوس لی..... وہ اپنے قدم آگے نہ بڑھا سکا۔



جولی اپنے ہانپتے ہانپتے سینے کی ہر سانس اور دھڑکتے ہوئے دل کی ہر دھڑکن کو بند ہو جانے کے احساس کے ساتھ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ مہمان محل کے اس بڑے سے کمرے میں بالکل تنہا ہونے کے باوجود وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ دیواروں پر لگی ہوئی مختلف کرداروں کی رنگین تصویروں نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا

ان کے ساتھ جا رہی ہے۔ اس لیے اس نے خود کو چھڑانے کی جھوٹی کوشش شروع کر دی تھی۔

”اگر تم چین سے بیٹھی رہو گی تو سلامت رہو گی۔“ اس بار اس کے بائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص نے دھمکی آمیز لہجے میں اسے سمجھایا تھا۔ زیادہ زور آزماؤ گی تو تمہاری کلائی ٹوٹ جائے گی۔“

یہ سن کر اس نے لاچار اور مجبور ہو جانے کی کوشش کی تھی اور تب ہی ان دونوں نے اس کے ہاتھوں کو چھوڑ دیا تھا۔

اس کے دونوں آزاد ہاتھ جب اپنی آنکھوں کی پٹی کی جانب اٹھے۔ تو ان دونوں نے ایک بار پھر اس کے ہاتھوں کو پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ اس کے ہاتھ کالی پٹی کے نیچے سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ رہے ہیں تو انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

”بے چاری رو رہی ہے۔“ ایک نے نیپالی زبان میں دوسرے سے کہا تھا لیکن اس کے لہجے میں ہمدردی کی بجائے جولی نے طنز کی جھلک محسوس کی تھی۔

”رو لینے دو۔“ دوسرے نے بڑبڑا ہٹ بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ”اس کے بعد تو اسے رونے کا بھی موقع نہیں ملے گا۔“

یہ سن کر جولی نے اپنے ہونٹ بھیجنے لیے اور دل ہی دل میں بولی۔ ”اس وقت تو رونے کی باری میری بجائے کسی اور کی ہوگی لیکن شاید اسے رونے کا بھی موقع نہیں ملے گا۔“

راستے میں جب ایک جگہ کار رک گئی تو اس نے یہ ہی سمجھ لیا کہ ٹھکانہ آگیا ہے لیکن جب اس نے آس پاس سے گزرتی ہوئی دوسری گاڑیوں کی آوازیں سنیں تو اسے اپنا اندازہ بدلنا پڑا۔ لگتا ہے ٹریفک سگنل کی وجہ سے کار کو روکنا پڑا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کار کے تمام شیشوں پر پردے لگے ہوئے ہیں تاکہ اغوا کی اس واردات کا کسی کو علم نہ ہونے پائے۔ گویا پورے انتظام کے ساتھ یہ کام ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد سگنل سے گزرنے کے بعد گاڑی کی رفتار اچانک ہی تیز ہو گئی تھی اور تب جولی نے اندر بیٹھے یہ اندازہ لگا لیا کہ اسے شر سے باہر کہیں لے جایا جا رہا

ہے۔ ”اب راستہ صاف ہے اور گاڑی کو تیزی سے جانے دو۔“ جولی کے بائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص نے شاید ڈرائیور سے کہا تھا۔ ”جلدی جلدی مال ان کے حوالے کر کے ہم اپنے نشے پانی میں ڈوب جائیں گے۔“

یہ سن کر جولی سمجھ گئی کہ ان لوگوں کو نشے کی طلب لگی ہوئی ہے، شاید یہ عادی نشے باز قسم کے لوگ ہیں لیکن یہ کس چیز کا نشہ کرتے ہوں گے، کیا شراب کا؟ افیون کا؟ پھر اس نے دل ہی دل میں سوچ لیا کہ یہ افیون کے نشے کے ہی عادی ہوں گے کیونکہ اس کی طلب شراب کے نشے سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔

آخری موڑ کاٹنے کے بعد جب کار کی رفتار ذرا سست ہو گئی تو اس کی دائیں جانب والے شخص نے اپنے ساتھی سے کہا تھا۔ ”لڑکی سمجھدار نکلی۔ ایک بار منع کرنے کے بعد سے اب تک چپ چاپ ہی بیٹھی ہوئی ہے۔ دہی اور پردہسی میں یہی تو فرق ہوتا ہے۔“ اور تب جولی نے جان بوجھ کر زور آزمائی کر کے کار سے نیچے اتر جانے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے منہ سے ٹیپ فوج کر کہا تھا۔ ”کون ہو تم لوگ اور مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

ان دونوں نے جھپٹ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے تھے لیکن اس بار انہوں نے اس کا منہ بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ان میں سے ایک نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”اب اگر تم چیختے ہوئے مر بھی جاؤ گی تو بھی کوئی سننے والا نہیں ہوگا۔“

”یہاں کی دیواروں کو لڑکیوں کی چیخیں سننے کی عادت پڑ گئی ہے۔“ دوسرے نے اسے کھینچتے ہوئے کہا تھا۔ ”اب اگر آنکھوں سے پٹی کھولنے کی کوشش کی تو.....“

اس نے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی تھی، شاید اسے دھمکی کے لیے کوئی لفظ نہیں مل رہا تھا لیکن یہ بات جولی کی سمجھ میں آگئی تھی کہ اسے اغوا کر کے لانے والے یہ لوگ بڑی احتیاط سے کام لے رہے ہیں کہ کہیں وہ پہچان نہ لیے جائیں۔

کار میں سے اتر کر زمین پر قدم رکھتے ہی جولی کو یاد آگیا کہ اس کے ایک پاؤں کا میٹل تو اس وقت اس کے پاؤں میں سے نکل گیا تھا، جب اسے کار کے اندر زبردستی

کہا۔ اسے وہاں پہلی عجیب بات یہ نظر آئی کہ کمرے میں روشنی کا ایک بھی بلب نظر نہیں آرہا تھا لیکن اس کے باوجود کمرہ روشن تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کسی تہ خانے میں ہے لیکن پھر بھی کمرے میں گھٹن محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کمرے میں ایک بھی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا لیکن اس کے باوجود ہوا کہاں سے آرہی تھی؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

کمرے کی دیواروں پر بڑی بڑی رنگین تصویروں کو دیکھ کر اسے ایک عجیب وحشت سی ہونے لگی تھی۔ مرد اور عورتوں کی ان قابل اعتراض تصویروں کے نیچے عجیب و غریب جملے لکھے ہوئے تھے۔ ان تصویروں کو دیکھتے ہی اسے پہلی بار یہ محسوس ہوا تھا کہ وہ جنم میں آگئی ہے اور یہاں سے باہر نکل کر کسی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہیں رہے گی۔ اچانک دروازے کے ہینڈل کو گھومتا ہوا دیکھ کر وہ دیوار کے سارے فرش پر بیٹھ گئی۔ دروازہ کھل چکا تھا لیکن پھر بھی اس نے گردن گھما کر دروازے کی طرف نہیں دیکھا۔

چند لمحوں بعد اس نے کسی کے نزدیک آنے کی آواز سنی لیکن قدموں کی چاپ سن کر اس نے تو اپنے جسم کو اور بھی سمیٹ لیا تھا اور اسی خوف سے اندر ہی اندر کانپ رہی تھی کہ بس اب کسی وقت بھی کوئی اس کا بازو پکڑ کر اسے کھڑا کر دے گا مگر جب کافی دیر تک آنے والے اجنبی نے کوئی حرکت نہیں کی تو اسے ڈرتے ڈرتے اپنی آنکھوں کو ذرا اوپر اٹھانا پڑا۔

اپنے سامنے کھڑے ہوئے شخص کے پیروں پر اس کی نظر پڑی..... نہیں..... وہ شخص ننگے پاؤں نہیں تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کے موزے پہن رکھے تھے۔ یہ دیکھ کر جولی نے اپنی نگاہیں ذرا اوپر اٹھائیں مگر یہ کیا۔ وہ تو سر سے لے کر پاؤں تک سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اس کا چہرہ اور تمام جسم سیاہ کپڑوں میں ڈھکا ہوا تھا لیکن یہ وہ نقاب پوش درندہ نہیں لگتا تھا..... اس نے نہ تو ایسا سیاہ لبادہ پہن رکھا تھا۔ جیسا برسوں پہلے یورپ کی دہشت گرد تنظیم کے لوگ پہنا کرتے تھے اور پھر اس سیاہ لباس میں ملبوس شخصیت کا جسم بھی کسی مرد کا جسم تو نہیں لگ رہا تھا۔ تو کیا یہ کوئی عورت ہے؟ جولی نے دل ہی دل میں خود سے پوچھا۔ پھر وہ رحم طلب نظروں سے اس کی

دھکیلا گیا تھا۔ اس لیے اس نے دوسرے پاؤں کے سینڈل کو کار میں ہی چھوڑ دیا اور ننگے پاؤں ہی ان دونوں کے ساتھ آگے بڑھ گئی تھی۔

”اب تم کار واپس لے جاؤ اور اپنی ڈیوٹی میں لگ جاؤ۔“ ڈرائیور کو دی جانے والی یہ ہدایت جب جولی کی سماعت سے نکلرائی تو وہ سوچنے لگی کہ اس کار میں رہ جانے والے اس کے سینڈل پر اگر کسی کی نظر پڑ گئی تو اسے نقصان ہوگا یا کوئی فائدہ ہی پہنچے گا۔“

”اب آگے زینے ہیں۔“ اسے پکڑ کر لے جانے والوں میں سے ایک نے کہا تو اس نے زینے چڑھنے کے لیے اپنا ایک پاؤں اوپر اٹھایا لیکن اوپر چڑھنے کی بجائے اسے تو زینے سے نیچے اترنا پڑا تھا اور اس کا مطلب تو یہی تھا کہ اسے کسی تہ خانے میں لے جایا جا رہا ہے۔ وہ ایک ایک زینے کو دل ہی دل میں گنتی ہوئی اتر رہی تھی۔ پورے بارہ زینے گن کر اسے رک جانا پڑا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے دس فٹ نیچے آنا پڑا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا۔ زینے سے اترنے کے بعد اسے صرف چند قدم ہی چلنا پڑا تھا۔ اس کے بعد اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ پھر اسے لے کر آنے والوں نے اسے اسی دروازے کے اندر دھکیل دیا تھا۔

پھر دروازہ بند ہوتے ہی اس نے آنکھوں پر بندھی ہوئی کالی پٹی ہٹا دی تھی۔ چند لمحوں تک تو کمرے کی ہر چیز اسے دھندلی سی نظر آئی تھی لیکن اپنے آس پاس نظر دوڑانے سے قبل اس نے بند کمرے کے دروازے کو زور زور سے تھپتھپایا تھا اور چیخ چیخ کر کہا تھا۔ ”یہ تم لوگوں نے مجھے کیوں بند کر دیا ہے؟ کہاں جا رہے ہو تم لوگ؟ بچاؤ، کوئی مجھے بچاؤ۔“ اداکاری کرتے ہوئے سچ رو پڑی تھی۔ اس کی چیخ و پکار کے جواب میں باہر سے کسی نے کہا تھا۔ ”اس کمرے میں آنے والی لڑکی آج تک بچ کر نہیں گئی ہے۔ آدھی رات کے بعد تمہارا بندوبست بھی ہو جائے گا۔“

یہ سن کر جولی نے بند دروازے کو زور سے ہلانے کی کوشش کی تھی لیکن اس بار دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا مگر جولی نے دور جاتے ہوئے قدموں کی آواز ضرور سنی تھی۔

دروازے کی طرف سے منہ پھیرنے کے بعد جولی نے کمرے کا جائزہ لینا شروع

اس کو اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ جس راز کے ظاہر ہو جانے کا خوف تھا اس سے تو وہ بچ گئی تھی۔ اس نے نہانے کا دکھاوا کرنے کے لیے نلکے کا پانی کھول کر اسے بنے دیا تاکہ پانی گرنے کی آواز باہر جاتی رہے اور نہانے کی بجائے صرف وہ اپنا منہ ہاتھ دھوتی رہی۔ وہ اس درندے کے سامنے جانے سے قبل یہ راز ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتی تھی کہ عزت کی حفاظت کی خاطر اس نے سینے سے لے کر نیچے رانوں تک المونیم کا ایک باریک بکتر پہن رکھا ہے۔ اس نے چینی چپانگ کی دکھائی ہوئی فلم میں دیکھ لیا تھا کہ اس نقاب پوش درندے نے اپنے ہاتھ میں ایسے دستانے چڑھا رکھے تھے۔ جن میں لمبے لمبے ناخن بنے ہوئے تھے جن کی مدد سے وہ اپنے شکار کے جسم کو لوہان کر دیتا تھا اور پھر جسم سے بننے والے خون کو ہونٹوں سے چوستا تھا۔ اسی لیے وہ اپنے بچاؤ کی تیاری کر کے آئی تھی۔ وہ اس درندے کو ایسا کوئی موقع ہی دینا نہیں چاہتی تھی کہ دوسری لڑکیوں کی طرح وہ درندہ اس کا بھی لمو چوس لے اور اس کی عزت کو تار تار کر دے۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ ہاتھ روم سے نکل کر کمرے میں آئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ سیاہ پوش شخصیت میز پر پھلوں کی قیمتی پلیٹیں سجائے اس کے انتظار میں ادب سے کھڑی ہے۔ پھلوں کی طرف دیکھ کر جولی نے دل ہی دل میں کہا۔ ”شاید خالی پیٹ والی لڑکی کے ساتھ زبردستی کرنے میں اس درندے کو مزہ نہیں آتا ہوگا۔ اس لیے یہ پھل وغیرہ کھلائے جائیں گے۔“

سیاہ پوش شخصیت کے دستانوں میں چھپے ہوئے ہاتھوں نے جب پھلوں کی پلیٹ اس کے سامنے بڑھائی تو وہ غصے سے چیخ اٹھی۔ ”یہ سب کیا تماشہ ہے؟ پہلے تو نہانے کے لیے کہا گیا اور اب یہ پھل کھلائے جا رہے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ یہ کون سی جگہ ہے اور یہ کس کا گھر ہے؟“

لیکن اس کے ایک ساتھ پوچھے گئے ان سوالوں میں سے کسی ایک کا بھی جواب نہیں ملا۔ اس کے سامنے کھڑے ہوئے سیاہ پوش نے جب ایک لفظ بھی نہیں کہا تو ایک لمحے کے لیے جولی نے سوچا کہ کیوں نہ وہ اس پر جھپٹ پڑے اور اس کے چہرے کا نقاب نوچ لے لیکن اس نے خود کو قابو میں رکھا۔ اس نے سوچا کہ یہ تو کوئی حکم کا

طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے سیاہ لبادے میں ملبوس شخصیت ابھی بول پڑے گی لیکن منہ سے کچھ کہنے کی بجائے اس پر اسرار اجنبی نے زور سے اپنا ایک پاؤں زمین پر مارا اور پھر ایک دوسرے کمرے کی جانب انگلی اٹھا دی۔ ٹھیک اسی وقت نقاب پوش نے آگے آکر اس دوسرے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ جولی نے جب کمرے کے اندر جھانک کر دیکھا تو وہ فوراً سمجھ گئی کہ یہ ایک خوبصورت اور تمام جدید آسائشوں سے سجا سجایا ہوا ہاتھ روم ہے۔ شاید یہ نقاب پوش شخصیت اسے نہلانے کے لیے یہاں لائی تھی۔

جولی کو یہ بات بڑی عجیب سی لگ رہی تھی کہ مکروہ کام کرنے والے شیطان بھی عورتوں کی عزت کو داغدار کرنے سے پہلے اس کی صفائی اور نفاست پر توجہ دیتے ہیں۔ جولی کچھ دیر چپ چاپ کھڑی دل ہی دل میں سوچتی رہی کہ اسے اس رسم کے لیے خود کو تیار کر لینا چاہیے یا نہیں؟ لیکن ابھی وہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کر پائی تھی کہ اچانک اس کے کندھے سے اس سیاہ پوش کا ہاتھ لکرایا۔ یکایک جولی نے ایک فیصلہ کر لیا اور مزاحمت کا ارادہ ترک کر کے دو قدم آگے بڑھ گئی اور پھر پلٹ کر اس سیاہ پوش سے بولی۔ ”خبردار مجھے ہاتھ لگانے کی کوشش نہ کرنا۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ ذرا اور غضبناک لہجے میں بولی۔ ”مجھے اگر نہانا ہی ہے تو خود ہی نما لوں گی۔“

سیاہ پوش شخصیت جہاں تھی وہیں رک گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے جولی سے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ سیاہ نقاب کے دونوں سوراخوں سے اس کی پتلیاں جولی کو گھورے جا رہی تھیں۔ اس کی اس خاموشی سے جولی نے اندازہ لگا لیا کہ سیاہ لبادے میں ملبوس مرؤ نہیں بلکہ کوئی عورت ہی ہے لیکن پھر بھی اس کا دل اس بات پر یقین نہیں کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اتنے بڑے کام میں کسی عورت کو ساتھ کیسے رکھا جاسکتا ہے؟ ممکن ہے یہ کوئی نازک بدن والا مرد ہو؟

”میں خود ہی نہا لیتی ہوں۔“ یکایک اس نے کہا اور ہاتھ روم کے اندر داخل ہو گئی تھی لیکن جب سیاہ پوش نے کوئی اعتراض نہیں کیا تو اس نے جلدی سے ہاتھ روم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔



ہوا تھا۔

عورت اور مرد کی ان رنگین تصویروں کو دیکھ کر وہ بچے کی جدائی برداشت نہیں کر پا رہی تھی اور اس وقت اس کے اندر کی محبت کے عجیب سے جذبات مچنے لگے تھے۔

لیکن آج بچے سے جدا ہو جانے کے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ اس وقت اپنی کھوئی ہوئی بہن کو تلاش کرنے کے لیے بچے نے سورگباشی مہاراجہ کے گناہوں کا بوجھ اپنے سر لے کر اپنے وطن کی سرزمین سے نکل جانے کا فیصلہ کر رکھا تھا لیکن وہ اسے مطلبی سمجھ بیٹھی تھی مگر آج وہ خود ویسا ہی کرنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ بچے کو جب اس بات کا پتا چلے گا تو وہ بھی اسے مطلبی اور دھوکے باز سمجھے گا اور اسے اپنی زندگی بیکار محسوس ہونے لگے گی۔ شاید اس کا یہ قدم بچے کو بہت ہی ناگوار گزرے گا کہ وہ جان بوجھ کر اسی درندے کی گود میں کیوں جاگری؟

جولی دل ہی دل میں یہ ساری باتیں سوچتی ہوئی دھیرے دھیرے پلنگ کے نزدیک سرکنے لگی اور پھر وہ پلنگ پر بچھی ہوئی ریشمی چادر پر آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ پھیرنے لگی اور سوچنے لگی کہ اسے دہلی سے نیپال آئے ہوئے تین چار روز ہو چکے ہیں اور بچے اس کی جدائی میں شاید ٹھیک سے سو بھی نہیں سکا ہو گا۔ اس کا تو ایک ایک دن بڑی بے چینی سے گزرا ہو گا.....

ایکایک کسی کے قدموں کی آہٹ نے اسے بچے کے حسین تصور سے جگا دیا اور تلخ حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے چونکا کر دیا۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹی اور دروازے پر نگاہیں جماتے ہوئے کانپتی ہوئی دیوار سے چپک کر کھڑی رہ گئی لیکن کمرے کا بند دروازہ نہیں کھلا اور جب چند لمحوں تک دروازہ نہیں کھلا تو اس کی خوفزدہ نظریں دیوار پر لگی ہوئی بڑی بڑی رنگین تصویروں پر جم گئیں جو اس وقت اسے بڑی ہیماںک اور خوفناک نظر آ رہی تھیں۔

اسے ایک بات کی پریشانی تھی کہ تھوڑی دیر بعد اس کے ساتھ جو مکرمہ کھیل اس کمرے میں کھیلا جائے گا، اس کی فلمبندی کے لیے چیاگ پہنچ چکا ہے یا نہیں.....؟ اور فلم بندی کے لیے کمرے کی کسی دیوار میں کوئی سوراخ یا کوئی روشندان وغیرہ کیوں

غلام ہے اور ایسے آدمی پر اسے اپنی طاقت صرف کر کے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اسے تو بڑی ہوشیاری سے کام لینا ہو گا..... اپنی مزاحمت اور احتجاج کا جھوٹا ڈھونگ رہا کر اسے تو اصل سردار تک پہنچنے کی کوشش کرنا ہو گی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ بولی۔ ”مگر تم میرے سوالوں کا جواب نہیں دو گے تو میں کچھ کھانے والی نہیں ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے پلیٹ اپنے سامنے سے ہٹا دی۔

لیکن اس سیاہ پوش کی آنکھیں جب نقاب کے دونوں سوراخوں سے صرف اسے گھورتی ہی رہیں تو وہ تملکا کر پوچھ بیٹھی۔ ”میری تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم مرد ہو یا عورت اور تمہارے منہ میں زبان بھی ہے یا نہیں؟“

یہ سن کر اس سیاہ پوش نے پہلی بار گردن ہلا کر انکار میں جواب دیا اور تب جولی نے دوسرا سوال کر دیا۔ ”تو تمہاری زبان نہیں ہے، کیا کسی نے تمہاری زبان کاٹ لی ہے؟“

یہ سوال سن کر وہ سیاہ پوش شخصیت اس طرح دو قدم پیچھے ہٹ گئی جیسے کسی نے اسے بہت زور سے دھکا مارا ہو۔ جولی کو اس کے کندھے کانپتے ہوئے محسوس ہوئے اور وہ سمجھ گئی کہ اس کے لگائے ہوئے اندازے نے اسے چونکا دیا ہے اور اس کا مطلب تو یہ ہے کہ سچ سچ اس کی زبان کاٹ دی گئی ہے مگر وہ کون ہے؟ اپنے دل میں اٹھے ہوئے اس سوال سے جولی نے اپنے اندر ایک سنسنات سی محسوس کی مگر پھر ہمت کر کے بول پڑی۔ ”ٹھیک ہے اب تم جاؤ..... جب میرا جی چاہے گا، میں کھا لوں گی۔“

اس کا یہ کہنا تھا کہ سیاہ پوش شخصیت کمرے سے باہر نکل گئی تھی لیکن ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہی سیاہ پوش نے دوبارہ کمرے میں داخل ہو کر اسے ایک اور بڑے کمرے میں لا کر چھوڑ دیا تھا لیکن جاتے جاتے اس سیاہ پوش نے ایسی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا جیسے اسے جولی پر رحم آرہا ہو۔

ابھی تو صرف ایک مہینہ پہلے کی بات ہے کہ وہ ”کوٹا کھانا“ کی رسم والے دن صبح کے وقت بچے سے ملنے کے لیے اس کمرے میں آچکی تھی اور تب اس کمرے کی دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر اسے ہمیشہ کے لیے بچے سے بچھڑنے کا دکھ

ملح صفائی سے پیش آؤ گی تو تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا لیکن اگر تم نے میرے ساتھ نادان نہیں کیا تو کانٹوں سے تمہارے جسم کو لہولہان کر دیا جائے گا۔ جولی نے اس ناپ پوش درندے کو صرف ایک ہی بار پردے پر دیکھا تھا لیکن اس وقت وہ اس سے زیادہ قد آور اور خوفناک نظر آ رہا تھا۔

”مجھے..... مجھے..... یہاں کیوں لایا گیا ہے؟“ اپنے خوف کو دور کرنے کے لیے جس طرح آدمی زور سے بولتا ہے، بالکل اسی طرح جولی نے بھی ذرا اونچی آواز میں اس سے سوال کیا۔ اس کے سوال کا نقاب پوش نے کوئی جواب نہیں دیا اور ایک ایک قدم کر کے دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھنے لگا۔

”میں یوراج سے اس کی شکایت کروں گی.....“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ نقاب پوش نے اس طرح زوردار قہقہہ لگایا جیسے اس کی بات سنا ہی نہ چاہتا ہو۔ اس کے قہقہے سے پورا کمرہ گونج رہا تھا اور ٹھیک اسی وقت جولی کی نظر پیٹھ پیچھے کی دیوار پر بنے ہوئے دو گول گول سوراخ پر پڑی۔ پھر اسے ایک گول سوراخ کے پیچھے کیمرے کا ہلکا ہوا لینس بھی دکھائی دے گیا اور دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے دل میں منصوبہ سوچ لیا کہ اس نقاب پوش کا نقاب نوچنے سے پہلے اسے اس کے چہرے کا رخ کیمرے کی جانب موڑنا ہوگا۔ سیاہ نقاب کے دونوں سوراخوں میں سے جھانکتی ہوئی آنکھوں کی ہٹیاں جب آہستہ آہستہ اس کے قریب آنے لگیں تو جولی کو لگا کہ یہ درندہ ایک ہی نکلے میں اسے دیوچ لے گا اور اگر اس نے کوئی مزاحمت نہ کی تو وہ سفید دستانے والے ہاتھ میں سے پہلے تو اسے سہلائے گا اور پھر اس کا خون چونے کے لیے اپنے ہاتھ کا نوکیلا پنجہ اس کے بدن اور گردن پر استعمال کرے گا اور تب شاید اسے بے رنگ بھی ہو جائے کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے اپنے جسم پر المونیم کا بکتر پہن کر پوری طرح سے تیار ہو کر آئی ہے۔

اور پھر جب ان کے درمیان صرف پانچ قدموں کا فاصلہ رہ گیا تو جولی نے یکایک ایک زخمی ناگن جیسا روپ اختیار کر لیا اور دانت پیستی ہوئی اس پر چھلانگ لگانے کا دھمکا کرتی ہوئی بڑی چالاکی سے اس کی داہنی جانب سے نکل کر سامنے کی طرف اگڑے یہ دیکھ کر نقاب پوش نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ اب جولی کی پیٹھ کیمرے

دکھائی نہیں دے رہا ہے؟ جبکہ چپانگ اپنے تو بتایا تھا کہ مووی کیمرے کی مدد سے ہی وہ اس کھیل کے ایک ایک لمحے کی عکس بندی کرے گا لیکن وہ اپنا مووی کیمرو کہاں چھپا کر رکھے گا؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ چپانگ نے جھوٹ بولا ہو اور فلم بندی کا کوئی پروگرام ہی نہ ہو؟

اسی آخری خیال نے اس کے کلیجے پر زبردست ہتھوڑا مارا۔ اس کا مطلب تو یہی ہوگا کہ دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی اس درندے کی ہوس کا نشانہ بن جائے گی اور اس درندے کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ ابھی وہ آنے والے وقت کی سنگینی پر غور کر رہی تھی کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھل گیا..... اور جولی کو اتنی دور سے بھی دروازے کی طرف دیکھنے پر اپنی آنکھوں میں کانٹے سے چھتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ کھلتے ہوئے دروازے کے عین درمیان میں وہ گردن اٹھائے اور سینہ تانے ہوئے کھڑا تھا۔ خون چوسنے والا، خوفناک شیر جس طرح خوف سے تھر تھراتی ہوئی ہرنی کو دیکھتا ہے، بالکل اسی طرح اس کے سیاہ نقاب کے پیچھے چھپی ہوئی اس کی دونوں آنکھوں کی پتلیاں اسے گھور رہی تھیں۔

جولی نے اس کی خونخوار نگاہوں سے خود کو بچانے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیے۔ اس کی یہ کوشش یوں تو اداکاری ہی تھی لیکن اس اداکاری میں حقیقی خوف کا عنصر بھی شامل تھا اور جب نقاب پوش شخص پیچھے مڑا تو اس کی پیٹھ جولی کی طرف تھی۔ دروازہ بند کر دیا تو جولی کا سینہ خوف سے پھٹنے لگا۔ اس کے بائیں کندھے کی ابھرتی ہوئی ہڈی کو دیکھ کر جولی کو پورا یقین ہو گیا کہ نقاب میں چھپا ہوا چہرہ وہی ہے جس کا اس نے پہلے سے اندازہ لگا رکھا تھا..... لیکن پھر بھی اس کے منہ سے ایک ڈری ڈری سی چیخ نکل ہی گئی۔

نقاب پوش نے ایک جھٹکے سے اپنی پیٹھ اس طرح گھمائی جیسے اسے زبردست دھکا لگا ہو۔ پھر اپنے قدم اٹھانے سے پہلے اس نے اپنے دائیں ہاتھ کا وہ پنجہ اٹھایا جس میں اس نے سفید رنگ کا دستانہ پہن رکھا تھا۔ جولی کو اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا لیکن جب نقاب پوش نے اپنا بائیں ہاتھ کا پنجہ جس میں سیاہ کانٹوں والا دستانہ اس نے پہن رکھا تھا، اسے دکھایا تو جولی اس کا اشارہ سمجھ گئی۔ شاید وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اگر

یکایک کسی جنگلی جانور کی طرح آواز نکالتا ہوا وہ نقاب پوش اس پر جھپٹا اور تب جولی اس کے پنجے پر لگے ہوئے نوکیلے کانٹوں سے بچنے کے لیے نیچے کی طرف جھکی مگر اس وقت اس کی ٹی شرٹ اس کے پنجے کے لمبے ناخن میں پھنس کر پھٹ گئی۔ جولی زمین پر گری لیکن جیسے ہی وہ اٹھنے لگی تو اس نقاب پوش کی نظر اس کے المونیم کے بکتر پر پڑ گئی۔ یہ دیکھ کر اس کی لہو کی پیاسی آنکھوں میں غصے کی ایک بھیانک سی آگ جلنے لگی۔ جولی نے اس کے غصے میں اکڑے ہوئے لمبے چوڑے جسم کو دیکھا تو اسے اپنی موت بہت نزدیک نظر آنے لگی۔ اس کی ایک ہی چھلانگ اور کانٹوں والے پنجے کا ایک ہی وار اس کی زندگی کو ختم کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اب اس کے پاس ایک آخری موقع تھا، ایک آخری کوشش کا موقع..... اس نے ایک پل کے لیے ہی اپنی آنکھیں بند کیں اور دل ہی دل میں اپنی زندگی کی دعا مانگنے لگی۔ پھر یکایک اپنے جسم کی پوری طاقت کو اکٹھا کر کے اس نے اس نقاب پوش پر چھلانگ لگا دی۔

جلی کی سی تیزی سے اس کے نزدیک آجانے والی اس غیر ملکی حسینہ نے ایک لمحے کے لیے اس نقاب پوش کو حیرت میں ڈال دیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ سمجھتا، جولی نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں ڈال دیئے اور لٹک گئی۔ نقاب پوش کو یوں لگا جیسے شکار خود اپنے پیروں سے چل کر اس کی گود میں آگرا ہے۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے جولی کی کمر پر اس کی گرفت سخت ہونے لگی اور پھر یکایک ہی وہ اپنے فولادی کانٹوں والے پنجے سے جولی کی پیٹھ ادھیڑنے کی کوشش کرنے لگا لیکن جب المونیم کے بکتر سے اس کے پنجوں کے ناخن ٹکرائے تو اس نے ٹی شرٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر اس کی کھال نوچنے کی کوشش کی مگر یہاں بھی بکتر نے رکاوٹ کھڑی کر رکھی تھی اور تب جھنجھلا کر اس نے اپنی گردن سے لٹکی ہوئی جولی کا چہرہ نوچ لینے کے لیے دوسرا ہاتھ بلند کیا..... اور..... بس جولی کے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے جو ناخن پچھلے دس روز سے بڑھا رکھے تھے، انہیں پوری طاقت سے اس نقاب پوش کے چہرے پر گاڑ دیا۔ نقاب پوش اس اچانک حملے سے بری طرح گڑبڑا گیا اور اپنا چہرہ بچانے کے لیے ایک جھٹکے سے اپنی گردن کو بچنے لے گیا مگر ایسا کرتے وقت اس کا سیاہ نقاب آپ ہی آپ درمیان سے پھٹ گیا۔

کے لینس کی جانب تھی اور اس نقاب پوش کا چہرہ کیمرے کے لینس کی زد میں آچکا تھا۔ جولی کو اس نقاب پوش کا پیچھے چھپا ہوا چہرہ نظر تو نہیں آ رہا تھا لیکن پھر بھی جولی کو اس کی آنکھوں کی ناچتی ہوئی پتلیوں کو دیکھ کر اس کے غصے کا اندازہ ہو رہا تھا۔

دوڑنے کی وجہ سے جولی کے کندھے پر سے اس کی ساری کا پلو سرک گیا تھا اور اس کے ہانپتے ہوئے سینے پر اس نقاب پوش کی نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔ یکایک نقاب پوش نے نوکیلے پنجے والا اپنا بایاں ہاتھ اوپر اٹھایا تو وہ کانپ گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ ساری کے پلو سے اپنا سینہ چھپاتی، وہ نقاب پوش کسی جنگلی بھینسے کی طرح اس کی طرف لپکا۔ جولی نے ایک جھٹکے سے خود کو بائیں طرف ہٹایا۔ اس طرح وہ اس کے نوکیلے پنجے کے وار سے بچ گئی تھی لیکن اس کی ساری کا پلو اس درندے کے ہاتھ میں آگیا تھا اور پھر ایک ہی جھٹکے میں اس نے اس کے جسم سے ساری کھینچ نکالی۔

اپنے سامنے خوف سے تھر تھر کانپتی ہوئی ایک لڑکی کا خوبصورت جسم دیکھ کر نقاب پوش کی آنکھوں کی پتلیوں میں اور زیادہ چمک آگئی۔ یہ تو اچھا تھا کہ جولی نے اندر پہننے ہوئے المونیم کے بکتر کو چھپانے کے لیے کمر تک ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ نقاب پوش کی نظروں نے بریزر کی بجائے ٹی شرٹ کی موجودگی کو محسوس تو ضرور کیا ہوگا مگر شاید یورپی لڑکیوں کا فیشن سمجھ کر اس نے اس تبدیلی کو نظر انداز کر دیا تھا۔

پسینے میں بھیگی ہوئی جولی نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور رحم طلب نظروں سے اس نقاب پوش کی طرف دیکھنے لگی تو اس درندے نے اپنا سفید دستانے والا ہاتھ اٹھا کر اسے قریب آنے کا اشارہ کیا اور تب ہی جولی کو احساس ہوا کہ ایک بار پھر اس درندے کی پیٹھ کیمرے کی طرف ہو گئی ہے۔ اس لیے اس نے قریب جانے کا ہمانہ کیا اور دھیرے دھیرے سرکتے ہوئے اس نے اپنا رخ بدل لیا۔ اس کے رخ بدلتے ہی نقاب پوش کو بھی گھوم جانا پڑا۔ اس کے چہرے کا رخ ایک بار پھر کیمرے کی طرف ہو گیا تھا لیکن اس وقت اسے کچھ ہوش ہی کہاں تھا۔ اس کی شکاری آنکھیں تو اس وقت اپنے شکار پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اسے دبوچ لینے کے لیے بے قرار تھا اور دوسری طرف جولی اس کے چہرے پر تھی ہوئی نقاب کا نشانہ تاک کر تھر تھر کانپتی ہوئی کھڑی تھی۔

کس اس کی گردن ہی نہ دو بوج لیں مگر پھر بھی ہمت کر کے وہ جھکا اور فلم کے ڈبوں میں سے فلم کے یٹکو کو کھینچ کھینچ کر باہر نکال دینے کے بعد اپنی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”لیجے یوراج صاحب..... میں نے شوٹ کیے ہوئے تمام مناظر مٹا دیئے ہیں اب اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔“

لیکن پھرے ہوئے یوراج نے جب ایک لفظ بھی نہیں کہا تو چیاگ نے دونوں ڈبوں کو وہیں پھینک کر دروازے کی طرف دوڑ لگا دی اور جاتے جاتے بولتا گیا..... ”میں جا رہا ہوں، پھر کبھی ضرورت ہو تو بلوا لیجئے گا.....“

یوراج نے فرش پر بکھری ہوئی فلم کی طرف دیکھا اور غصے میں اپنے دانت پیسنے لگا۔

یکایک اپنے نقاب کے پھٹے ہوئے ٹکڑے کو جولی کے منہ پر سے ہٹا کر اس نے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش میں ایک جھٹکے سے اس ٹکڑے کو ہٹا دیا لیکن جولی کی بند آنکھوں کو دیکھ کر وہ جھنجھلا گیا۔ گوری چمڑی کو چیر کر اس میں سے ٹپکتے ہوئے لو کو پینے کی پیاس سے اس کا گلا سوکھ رہا تھا لیکن بے ہوش اور بے سدھ پڑی ہوئی عورت کا خون چوسنے میں اسے کبھی بھی مزا نہیں آیا تھا۔ بے ہوش عورت کے خون میں بھلا وہ گرمی، وہ تازگی اور وہ مٹھاس کہاں تھی..... جس کا وہ عادی تھا۔

جب تک اس کے بچوں میں پھنسی ہوئی لڑکی درد اور تکلیف سے تڑپتی نہ ہو، اس وقت تک خون چوسنے کا مزا ہی کیا؟

اور پھر وہ بڑی بے چینی سے جولی کے ہوش میں آنے کا انتظار کرتا رہا..... اور بیٹھے بیٹھے جولی کے حسین جسم کو گھورتا رہا۔

دروازے کی تھنٹی کافی دیر تک سہمتی رہی لیکن کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب بیٹھا ہوا رگھوپتی ایک ٹک لگائے مسلسل آسمان کو گھورے جا رہا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں اس قدر محو تھا کہ اسے تھنٹی کی آواز سنائی ہی نہیں دی۔ پورے پانچ گھنٹوں سے صرف جولی کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ وہ جولی کی مدد کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس بات کا اسے سخت افسوس ہو رہا تھا۔ اسے اپنی لاچارگی پر بھی سخت غصہ آ رہا تھا اور اس لیے وہ اپنے آپ کو برا بھلا کہتا ہوا دیر تک ادھر سے ادھر ٹھٹھکا رہا تھا۔

پھٹے ہوئے نقاب کے چھتھرے مٹھی میں دبائے جولی پیٹھ کے بل زمین پر جا گری اور پھر بے نقاب ہو جانے والے درندے کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو اسے ایسا لگا کہ یہ یوراج چندر بھوشن نہیں ہو سکتا۔ اس وقت یوراج چندر بھوشن کی کھلی ہوئی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی اور ہونٹوں پر پھسلتی ہوئی زبان سے رال ٹپک رہی تھی۔ اس کے جڑے تنگ ہو رہے تھے اور پیشانی پر ابھری ہوئی نسیں پھڑک رہی تھیں۔ جولی اس کی طرف دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ کیا ایک انسان کا چہرہ اس قدر بھیانک روپ بھی اختیار کر سکتا ہے؟

یکایک جولی نے اس کے پھٹے ہوئے نقاب کے ٹکڑے سے اس طرح اپنا منہ ڈھانپ لیا جیسے اس میں یوراج چندر بھوشن کا اس قدر خوفناک چہرہ دیکھنے کی تاب ہی نہ ہو لیکن دوسرے ہی لمحے یوراج کے بھیانک قبضے سے کمرے کی دیواریں گونجنے لگیں۔

اپنے من پسند شکار کا گوشت کھانے اور اس کا لو چاٹنے کے لیے جس طرح کوئی بھوکا شیر اپنے پاؤں موڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اسی طرح لو کا پیاسا یوراج بھی گھنٹوں کے بل زمین پر بیٹھ کر جولی کے جسم پر جھک گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے جولی کی پھنسی ہوئی ٹی شرٹ اس کے جسم سے نوچ کر پھینک دی اور المونیم کے بکتر کو چیرنے کے لیے اپنے فولادی پنچے کے ناخن سے اسے نوچنے لگا لیکن اس کے فولادی ناخن المونیم کی سطح پر بار بار پھسل جاتے تھے۔ جب اسے اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو اس نے غصے میں بائیں ہاتھ کا وہ نوکیلا دستانہ ہی اتار پھینکا اور اپنے دونوں ہاتھوں کے بچوں میں جولی کی نازک گردن پکڑ لی۔ پھر دیرے دیرے اس کے ہاتھوں کی گرفت سخت ہوتی گئی..... اور تب ہی..... ایک خفیہ دروازہ دھڑم سے کھلا اور گھبرایا ہوا چیاگ بڑی تیزی سے اندر داخل ہو کر بولا۔ ”یوراج صاحب! یہ فلم تو بالکل بیکار گئی۔“ کہہ کر اس نے سولہ ایم ایم کے دو ڈبے یوراج چندر بھوشن کے سامنے رکھ دیئے۔

غصے میں آئے ہوئے یوراج نے دانت پیس کر اپنے سامنے کھڑے چیاگ کی طرف دیکھا۔ چیاگ نے آج سے پہلے کبھی یوراج چندر بھوشن کا ایسا بھیانک روپ نہیں دیکھا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ جولی کی گردن پر ڈھیلے ہوتے ہوئے اس کے پنچے

باہر نکالے اور کہا۔ ”میں اپنا کام کر کے آیا ہوں۔ اب اس فلم کی ڈیوری لے لو اور مجھے رقم ادا کر دو۔“

لیکن رگھوپتی نے نہ تو فلم کے ان ڈیوں کی طرف دیکھا اور نہ ہی چیانگ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی نیند سے بوجھل سرخ سرخ آنکھیں اس طرح چیانگ کو گھور رہی تھیں جیسے وہ اپنے کسی دشمن کو دیکھ رہی ہوں۔

”اس لڑکی نے تو واقعی کمال ہی کر دیا۔“ چیانگ کو ہی بولنا پڑا۔ ”بڑی ہوشیاری سے کام کیا ہے اس نے..... وہ اپنے کپڑوں کے نیچے المونیم کا بکتر پہن کر آئی تھی۔ اس نے اپنے دشمن کو بہت تھکایا اور اس کا نقاب چیرنے کا شارٹ تو اس نے میرے کمرے کو ایسا دیا کہ میں تعریف ہی نہیں کر سکتا۔“

رگھوپتی سانس روکے اس کی بات سن رہا تھا اور چیانگ کتا جا رہا تھا۔ ”یوراج کو مجھ پر شک نہ ہو، اس لیے خراب ہو جانے والی فلم کے دو ڈبے میں اپنے ساتھ لے گیا تھا اور میاں آنے سے قبل میں نے اصل فلم اپنے بیگ میں رکھ کر اس خراب فلم کے ڈیوں کو اس کے سامنے ہی روشنی میں کھول دیا تاکہ اسے یقین ہو جائے کہ اس کے بے نقاب چہرے والی فلم ضائع ہو گئی ہے۔ بس اب یہ دونوں ڈبے جلد سے جلد دہلی پہنچ جائیں تو میرا کام ختم۔“

یکایک رگھوپتی نے اس طرح میز پر ہاتھ مارا جیسے اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہو۔

”ڈرنگن.....“ وہ بڑے ہی کرخت لہجے میں چیانگ سے بولا۔ ”یہ سب باتیں بعد میں ہوں گی، پہلے یہ بتاؤ کہ جولی کا کیا ہوا؟“

”جولی.....؟“ چیانگ کچھ بولتے بولتے رک گیا۔ اتنی دیر بعد اب وہ سمجھ سکا تھا کہ جس کام کے لیے رگھوپتی اتنے دنوں سے پریشان تھا، وہ کام ہو گیا ہے مگر پھر بھی رگھوپتی کو کوئی خوشی کیوں نہیں ہو رہی ہے؟

”جو کچھ ہوا ہے، وہ مجھے صاف صاف بتا دو۔“ چیانگ کو خاموش دیکھ کر رگھوپتی نے کہا۔ ”اور کیا ہوتا تھا؟“ کہ چیانگ پھر رک گیا لیکن چند لمحوں کی تاخیر کے بعد وہ اُگے بولا۔ ”وہ خون کا پیاسا درندہ ایسا بھرا ہوا تھا کہ اسے زندہ نہیں چھوڑتا۔ وہ اس

شوبھا کو اس کے ہوٹل میں چھوڑ کر وہ واپس کاسینو آگیا تھا لیکن اس خیال نے اسے وہاں بھی چین نہیں لینے دیا تھا کہ جولی پر کیا گزر رہی ہوگی؟ پھر دو بجے گھر واپس آکر اس نے سوچا کہ وہ دہلی ٹرنک کال کر کے وجے کو اس نئی صورتحال سے آگاہ کر دے۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ وجے کو صاف صاف بتا دے کہ ان کا بنایا ہوا منصوبہ ناکام ہو گیا ہے۔ ہم تو شوبھا کو اس درندے کے ہاتھوں اغوا کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ وہاں پہنچ کر اس کا اصلی چہرہ کمرے کے سامنے بے نقاب کر دے لیکن چار دنوں کی مسلسل کوشش کے باوجود بھی اس شیطان کے کارندوں کی نظر شوبھا پر نہیں پڑی اور آج شوبھا کی بجائے جولی کو وہ لوگ اٹھا کر لے گئے ہیں۔

رگھوپتی دیر تک کشمکش میں مبتلا رہا اور آخر وہ وجے کو فون کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ شاید اس خیال سے اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا تھا کہ وجے جولی کے اغوا کی بات برداشت نہیں کر سکے گا۔ اسے یقیناً اس خبر سے دکھ پہنچے گا۔ اس کے علاوہ خود جولی نے بھی اپنی لکھی ہوئی چٹھی میں اسے یہ قسم دی تھی کہ وہ وجے کو اس بارے میں کچھ نہیں بتائے گا اور یہی وجہ تھی کہ وہ وجے کو فون نہیں کر سکا تھا۔

اس کے پاس اب سوائے جولی کی سلامتی کی دعا کرنے کے اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ یکایک گھنٹی کی آواز کچھ اور تیز ہو گئی تو رگھوپتی نے چونک کر ٹیلی فون کی طرف دیکھا لیکن ٹیلی فون سیٹ کو خاموش پا کر اسے لگا کہ اسے وہم ہو رہا ہے لیکن اس وقت دروازے کو کسی نے ہاتھ سے تھپتھپایا تو اسے خیال آیا کہ دروازے کی گھنٹی بجی تھی اور تنگ آکر اب کوئی دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ شاید یہ جولی ہی ہوگی..... جولی کا خیال آتے ہی اس کے ساکت جسم میں ہلچل سی مچ گئی۔ اچانک اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی اور وہ چھلانگ لگا کر دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ ”کھولتا ہوں۔“ کہہ کر اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا لیکن جولی کی بجائے اسے ہانپتا ہوا چیانگ اپنے سامنے کھڑا دکھائی دیا۔ وہ زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بہت دور سے بھاگتا ہوا آرہا ہو۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر داخل ہو گیا اور رگھوپتی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”میں تمہیں ڈھونڈنے کے لیے کاسینو میں گیا تھا۔“ کہہ کر اس نے چڑے کے ہینڈ بیگ میں سے سولہ ایم ایم فلم کے دو ٹین

کا سامنا کرنے کے لیے اپنی موٹر سائیکل پر مہمان محل جانے کے لیے نکل پڑا تھا لیکن جب وہ پون گھنٹے بعد ہی اپنے گھر واپس آگیا تو اپنے کھلے ہوئے کمرے میں چیانگ کو اونگھتے ہوئے دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔ اس کے قدموں کی آہٹ سن کر چیانگ بھی چونک کر جاگ پڑا تھا۔ رگھوپتی کی پیشانی سے بہتی ہوئی خون کی لکیر کو دیکھ کر چیانگ نے سوچا کہ اچھا ہی ہوا کہ یہ آدمی راستے سے واپس آگیا۔ نہیں تو کنارے پر آنے والی کشتی ڈوب جاتی۔

”تم نے موٹر سائیکل سے کسی کو کچل تو نہیں دیا؟“ چیانگ نے رگھوپتی سے پوچھا۔  
 ”نہیں۔“ رگھوپتی بولا۔ ”اندھیرے میں مجھے سڑک کا گڑھا نظر نہیں آیا تھا جس کی وجہ سے موٹر سائیکل اچھل پڑی اور میں دور جاگرا۔ میرے سر پر ایک نوکیلا پتھر لگا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ ایک جولی کی زندگی بچانے کے لیے مجھے اپنے دوسرے ساتھیوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈالنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

”دیری گڈ۔“ چیانگ نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور خوش ہو کر بولا۔ ”صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ اچھا ہوا تمہیں جلد ہی احساس ہو گیا۔ اب میری ہتھیلی گرم کر دو تاکہ میں فلم کے آخری سین کے ٹیکٹو لے کر دہلی روانہ ہو جاؤں۔“

اور چیانگ کو دہلی روانہ ہوئے آج پانچواں دن ہو چکا تھا۔ آج دہلی سے آنے والی فلائٹ میں وجے بھی آرہا تھا۔ جسے لانے کے لیے رگھوپتی کو ایئر پورٹ جانا تھا اور اس افراتفری میں شیو بنانا بھول گیا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ ان پانچ دنوں میں انہوں نے اپنے کئی کام خوش اسلوبی سے انجام دے ڈالے تھے۔ اپنے ساتھیوں شہرا اور رانا سے اسے جو خفیہ پیغامات ملے تھے، ان کے مطابق ان کے باغی نوجوان دو سو کی تعداد میں نیپال پہنچ چکے تھے اور اس وقت تک وہ سب بیچتیں بیچتیں کے چھوٹے چھوٹے گروہ میں تقسیم ہو کر تقریباً آٹھ مختلف جگہوں پر اپنا پڑاؤ ڈالے بیٹھے تھے جبکہ راج محل کے اور اہم کام کے لیے ایک آخری دستہ دو روز بعد نیپال پہنچنے والا تھا۔

ان کا بھی بدل کر انہیں راج محل کے اندر داخل کرنے کے منصوبے کو بہت خفیہ رکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ دہلی پہنچ کر چیانگ نے اپنے فلمائے ہوئے آخری سین

کی گردن دبا ہی رہا تھا کہ میں وقت پر وہاں پہنچ گیا۔ اس وقت تو میری وجہ سے وہ چھ گئی تھی اور بے ہوش ہو گئی تھی..... لیکن.....“

”لیکن اب وہ نہیں بچے گی، یہی نا؟“ کہہ کر رگھوپتی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور آگے بولا۔ ”اب میں دیکھوں گا کہ وہ شیطان اس کے ساتھ کیا کرتا ہے؟“

رگھوپتی اتنا کہہ کر مڑا اور کرسی پر سے اپنی چمڑے کی جیکٹ پہن کر اس کی جیب میں اپنا پستول ڈالنے لگا۔ یہ دیکھ کر چیانگ نے گہرائے ہوئے لمبے میں اس سے پوچھا۔ ”آخر تم کیا کرنا چاہتے ہو رگھوپتی؟“

”مجھے پتا نہیں کہ میں کیا کروں گا۔“ کہہ کر رگھوپتی نے قدم بڑھایا اور بولا۔ ”اگر میں دو گھنٹے میں واپس نہ آیا تو فلم کے یہ دو بے تم شوہا کے حوالے کر دیتا۔“ رگھوپتی نے اتنا کہہ کر گھر کی چابیوں کا گچھا اس کی طرف پھینک دیا اور بولا۔ ”یہ گھر کی چابیاں ہیں۔ یہ بھی شوہا کو ہی دے دینا۔“ دوسرے ہی لمحے رگھوپتی تیزی سے مڑا اور گھر سے باہر نکل گیا۔



ہر سوچا ہوا کام جب کسی رکاوٹ کے بغیر مقررہ وقت پر ہونے لگتا ہے تو آدمی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا لیکن کبھی کبھی ایسی خوشیوں کے درمیان میں بھی آدمی کو ایک عجیب سی بے قراری اور افسردگی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہی حال اس وقت رگھوپتی کا بھی تھا۔

جمعرات کی صبح کو چار بجے چیانگ یوراج چندر بھوشن کا چہرہ بے نقاب کرنے کی خوشخبری کے ساتھ اس منظر کی مووی فلم لے کر اس کے پاس آ پہنچا تھا لیکن تب رگھوپتی کو خوشی کی بجائے سخت صدمہ ہوا تھا۔ جولی نے اپنی قربانی دے کر یہ کام کیا تھا۔ اس لیے اسے یہ خوشی ایک سزا محسوس ہو رہی تھی۔ جولی نے اسے روکھی کی قسم دے کر مجبور کر دیا تھا لیکن اب اسے اپنی اس مجبوری پر غصہ آرہا تھا لیکن اب تو جولی نے جو کرنا تھا، وہ کر لیا ہے۔ اب ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کا فائدہ ہی کیا تھا؟ اب تو روکھی کی قسم کو توڑ کر اسے جولی کو بچانا ہی ہوگا۔ یہی سب سوچ کر وہ موت

اچانک دروازے کی گھنٹی بج اٹھی تو اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا کہ کہیں شوہا تو نہیں آگئی؟ لیکن اس نے تو اسے گھر آنے سے منع کر دیا تھا۔ اس نے تو اسے سمجھا دیا تھا کہ ہم الگ الگ ایرپورٹ جائیں گے تو پھر کون ہو سکتا ہے؟ ہاتھ میں ریزر تھامے وہ صابن والے چہرے کے ساتھ ہی دروازے کو دیکھ کر گھبرا گیا..... ”کون؟ آشا؟“ اس کے ہونٹ تھر تھرائے۔ تیز رفتار جھولے پر بیٹھے ہوئے آدمی کو جیسے چکر آجاتا ہے، بالکل اسی طرح آشا کو دیکھتے ہی رگھوپتی چکر اگیا تھا۔ ”گھر آئے ہوئے مہمان کا راستہ روک کر کھڑے ہو جانا یہ کوئی پڑھے لکھے آدمی کا کام نہیں ہے مسٹر رگھوپتی۔“ کہہ کر آشا بے دھڑک اندر داخل ہو گئی اور کمرے میں آکر بولی۔ ”چند روز قبل دہلی میں ہماری اچانک ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے میرا خیال تھا کہ یہاں میرے آنے کا انتظار کیا جا رہا ہوگا لیکن اس کے بجائے یہاں تو مجھے خوش آمدید بھی نہیں کہا جا رہا ہے۔“

”اور اس طرح بغیر اجازت کسی کے گھر میں داخل ہو جانا کسی شریف عورت کا شیوہ نہیں ہے؟“ کہہ کر رگھوپتی اس کے پیچھے کمرے میں آگیا۔ آشا نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر پیچھے آکر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ پھر ہنستی ہوئی بولی۔ ”یہ سچ ہے کہ شریف عورت کا یہ شیوہ نہیں ہے لیکن تم لوگوں کی نگاہوں میں‘ میں شریف عورت ہوں ہی کب؟“

بند ہونے والے کمرے کے دروازے اور آشا کے طنزیہ لہجے نے رگھوپتی کو ایک لمحے کے لیے بوکھلا دیا لیکن آشا بدستور کہہ رہی تھی۔ ”تم اس طرح میری طرف دیکھ رہے ہو جیسے میں تمہاری عزت لوٹنے آئی ہوں۔ اس سے پہلے کہ تمہارے چہرے پر لگا ہوا صابن سوکھ جائے، چہرے پر ریزر پھیر لو۔ ہم اطمینان سے بات کریں گے۔“ اتنا کہہ کر وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

رگھوپتی کو اس کی بات کی کاٹ ریزر میں لگے ہوئے بلیڈ سے بھی زیادہ تیز لگ رہی تھی۔ وہ اپنے چہرے پر پھر سے شیونگ کریم لگاتے ہوئے خود کو آشا کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنے لگا۔ اچانک سامنے لگے ہوئے آئینے میں آج سے پانچ روز پہلے کا منظر لہرائے لگا۔

کے پرنٹ بھی نکال لیے تھے۔ جس کی اطلاع اس نے بذریعہ ٹرنک کال رگھوپتی کو دیتے ہوئے بتایا تھا کہ ”پانچ منٹ کے اس سین میں جب جولی یوراج کے چہرے کا نقاب نوچ لیتی ہے تو پورے ڈیزنہ منٹ تک یوراج کا چہرہ پردے پر دکھائی دیتا ہے۔ وجہ نے ہی میرے ساتھ اس سین کو دیکھا تھا۔ جولی کو اس درندے کا شکار بننے دیکھ کر وجہ کو سخت غصہ آیا تھا لیکن تمہارے کہنے کے مطابق اسے سمجھا دیا اور یہ یقین دلا دیا کہ جولی بالکل صحیح سلامت ہے۔ تب جا کر اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تھا۔ اب آئندہ کل کی فلائٹ میں‘ میں ایک سو ایک پرنٹوں کی چار پٹیاں روانہ کر رہا ہوں۔ جس کو وہاں کے کسٹم سے نکلوانا تمہارا کام ہے۔“

کسٹم سے پٹیاں نکلوانے کا انتظام رگھوپتی نے پہلے سے ہی کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے کھنڈو کے تمام سینما گھروں کو زیادہ کرایہ دے کر چار دنوں کے لیے بک کر لیا تھا۔ اس نے سینما گھروں کے مالکوں کو یہ کہہ کر سمجھا دیا تھا کہ نئے راجا کی تاج پوشی کے موقع پر دوسرے ملکوں سے بھی ہزاروں کی تعداد میں لوگ یہاں آئیں گے۔ اس لیے میں نے ہندی اور کئی انگریزی فلمیں منگوائی ہیں تاکہ اس موقع پر بھی کچھ کمائی کر لوں۔ سینما گھروں کے مالکوں کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟

پچھلی رات جب وہ کاسینو میں اپنی ڈیوٹی پر تھا تو وہاں شوہا نے آکر اس کے کان میں کہا تھا۔ ”وجہ کے ساتھ کل میرے ڈیڑی بھی آرہے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ کیا لانے والے ہیں‘ یہ تمہیں معلوم ہے؟“

”کیا؟“ اس نے دھیرے سے پوچھا تھا۔

”وہ اپنے ساتھ ٹائم بم لے کر آئیں گے۔“ شوہا کا یہ جواب سن کر وہ اس طرح اچھل پڑا تھا جیسے سچ سچ ٹائم بم پھٹ گیا ہو۔ وہ تھوڑی دیر تک شوہا کو دیکھتا ہی رہ گیا اور پھر اس کے منہ سے آپ ہی آپ نکل پڑا۔ ”پر شورام کا ٹائم بم؟“

”جی ہاں۔“ شوہا نے گردن ہلا کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ”اس شیطان کو اپنی گرفت میں لینے کا یہی ہتھیار۔“

اور اس وقت بھی وہ شیوہ بناتے بناتے یہی سوچ رہا تھا کہ پر شورام کی فائل ٹائم بم شوہا کے پاس کہاں سے آگئی؟

ہانے لگے۔ پہلے دیکھ تو اسے کتنی چوٹ لگی ہے؟“

کار کے اندر بیٹھی ہوئی کسی عورت نے یہ بات ڈرائیور سے کہی تھی جسے سن کر رگھوپتی کا ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ہی رہ گیا اور وہ سوچنے لگا۔ یہ آواز تو جولی کی ہی لگتی ہے۔ یکایک اس نے نزدیک آتے ہوئے قدموں کی آواز سنی تو وہ پھر سے بے حس و حرکت ہو کر پڑا رہ گیا۔

”بھائی تمہیں بہت زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟“ جولی جیسی آواز ایک بار پھر اس کی ہامت سے نکرائی اور اس کے ساتھ ہی کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ رگھوپتی نے یکایک اپنی گردن موڑ کر اپنے پر جھکی ہوئی عورت کی طرف چور نظروں سے دیکھا تو اس کے ہنسنے والے اندر رکا ہوا سانس ایک ساتھ ہی باہر نکل آیا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود اس نے خود پر جھکی ہوئی جولی کو ایک نظر میں ہی پہچان لیا تھا۔ خود جولی بھی اسے دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ ”اوہ گاڈ..... یہ تم ہو.....؟“

جولی کے ہونٹوں سے کانپتی ہوئی آواز نکلی تھی لیکن تب ہی کار میں سے ایک دوسری آواز سنائی دی جو شاید جولی کو مخاطب کر کے پوچھ رہی تھی۔ ”اگر یہ بے ہوش ہو گیا تو اسے کار میں ڈال کر لے چلتے ہیں۔“ کسی عورت کی اس آواز اور اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز بھی سنائی دی تو جولی نے جلدی سے آنکھ دبا کر بڑے ہی رازدارانہ لہجے میں دھیرے سے رگھوپتی سے کہا۔ ”سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ تم اس وقت اجنبی ہی بنے رہنا.....“

رگھوپتی نے فوراً ہی اس کا اشارہ سمجھ لیا اور دوسرے ہی لمحے وہ اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اپنی پیشانی سے بتے ہوئے خون پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ پھر ذرا اونچی آواز میں اس طرح بولا کہ اس کی بات ہر کوئی آسانی سے سن لے۔ ”معاف کیجئے گا“ کار کی لائٹ کی وجہ سے آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ اس لیے میں اپنا توازن کھو بیٹھا تھا لیکن آپ کے ڈرائیور نے بروقت بریک لگا دیا جس کی وجہ سے میری جان بچ گئی۔“ یہ کہہ کر اس نے کار کی جانب سے نظریں ہٹائیں اور اپنی موٹرسائیکل کے قریب جا کر آگے بولا۔ ”لیکن اصل میں غلطی میری ہی تھی.....“

وہ اپنی موٹرسائیکل پر بڑی تیز رفتاری سے مہمان محل کی جانب اڑا جا رہا تھا۔ اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس کی موٹرسائیکل کی رفتار لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس وقت وہ صرف یہی سوچ رہا تھا کہ اگر جولی کو بچانے میں وہ ناکام ہوا تو اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکے گا اور اسی لیے وہ آندھی طوفان کی طرح اڑا جا رہا تھا کہ اسے جولی تک پہنچنے میں دیر نہ ہو جائے لیکن ٹھیک اسی وقت سامنے سے آتی ہوئی کسی کار کی ہیڈ لائٹ نے اس کی آنکھوں کو چندھیا دیا۔ اس نے زبردستی آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا تو اسے کار کے اگلے حصے میں شاہی دربار کا چھوٹا سا جھنڈا لہراتا دکھائی دیا تھا اور ڈرائیور کی پچھلی سیٹ پر دو تین عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ پھر جب کار کے ڈرائیور نے راستہ دینے کے لیے ہارن بجایا تو اچانک اسے خیال آیا کہ شاید اس کار میں جولی کو لے جایا جا رہا ہے۔ اسی لئے کسی بھی قیمت پر کار کو روک کر اندر دیکھ لینا چاہیے۔ پھر اس سے پہلے کہ اس کی موٹرسائیکل اور کار کا ٹکراؤ ہو جاتا، رگھوپتی اسی طرح موٹرسائیکل سے اچھل کر دور جا گرا جیسے وہ موٹرسائیکل پر سے اپنا توازن کھو چکا ہو۔ اس نے بڑی زبردست اداکاری کی تھی جس کے نتیجے میں بالکل آخری لمحے میں ڈرائیور کو بریک لگا کر کار روک دینی پڑی تھی لیکن موٹرسائیکل سے پتھروں کے ڈھیر پر گرے ہوئے رگھوپتی کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ کار کے بریک کی چیخ کے ساتھ اس نے کار کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ اسی لیے فوراً ہی بے ہوش ہو جانے کی اداکاری کر کے وہ چپ چاپ وہیں پڑا رہا۔

اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ کار کا ڈرائیور کار سے نیچے اتر کر راستے میں پڑی ہوئی اس کی موٹرسائیکل کو کار کے سامنے سے ہٹانے لگا تو اندھیرے میں پڑے ہوئے رگھوپتی نے اپنا پستول نکالنے کے لیے دھیرے سے اپنے چمڑے کی جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈالا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ ڈرائیور ذرا دور بٹے تو وہ چھلانگ لگا کر کار کے کھلے ہوئے دروازے میں گھس کر اس کی سیٹ پر قبضہ کر لے گا اور کار کو بھگا کر لے جائے گا لیکن تب ہی ایک سریلی آواز اس کی سماعت سے نکرائی۔ ”ارے موٹرسائیکل والا بیچارہ زمین پر گرا ہوا ہے اور تم اسے دیکھنے کے بجائے موٹرسائیکل



پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دھیرے دھیرے مسکرانے لگی اور پھر تھوڑی دیر بعد بڑے ہی طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”تمہارے ماتھے کا زخم تو بھر گیا ہے لیکن اس کا نشان تو ابھی بھی صاف نظر آرہا ہے رگھوپتی۔“

یہ سن کر رگھوپتی اس کی طرف مانتا ہی رہ گیا اور تب آشنا نے پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں نیند میں تو موثر سائیکل چلانے کی عادت نہیں ہے نا؟ آدمی اگر نیند میں موثر سائیکل پر سے اچھل کر گر پڑے تو بھی دوسرے دن یاد نہیں رہتا جبکہ اس بات کو تو پانچ روز ہو چکے ہیں۔“

یہ سن کر رگھوپتی کو لگا کہ اب بات کو ٹالنا بے کار ہے۔ اس لیے اسے صاف طور پر کہنا پڑا۔ ”نہیں..... مجھے نیند میں چلنے کی یا کسی پرانی عورت کے شہنچے میں پھنسنے کی کوئی عادت نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ آشنا نے کہا۔ ”لیکن پرانی عورت کو کسی کے شہنچے میں سے بچانے کی عادت تو ہے ہی، حالانکہ جولی کو اب پرانی عورت ہی کیسے کہا جاسکتا ہے؟“

”تو کیا واقعی جولی کسی کے شہنچے میں پھنس گئی تھی؟“ یہ پوچھ کر رگھوپتی کو آگے کہنا پڑا۔ ”تب تو اس کے بچانے کا سرا تمہارے سر جانا چاہیے آشنا۔“

”اچھا.....“ رگھوپتی کو پہلی بار اس کے ہونٹوں پر ایک مختلف سی مسکراہٹ دکھائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”تو کیا تمہیں یہ لگ رہا ہے کہ میں کسی کو بچانے کا کام بھی کر سکتی ہوں؟“

”پیسے ملنے کی امید میں شاید تم یہ بھی کر سکتی ہو؟“ رگھوپتی نے ہمت سے کہا۔

”ہاں اب تم بالکل ٹھیک سمجھو۔“ آشنا نے گردن اٹھا کر کہا۔ ”آشنا کوئی بھی کام بغیر معاوضے کے نہیں کرتی۔“

”تو اس کام کے بدلے میں تمہیں کیا چاہیے آشنا؟“ رگھوپتی نے پوچھا۔

”قیمت جاننے سے پہلے کیا تم یہ جانتا نہیں چاہو گے کہ میں اس کے بارے میں کیا کیا جانتی ہوں؟“ آشنا نے جھپتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا تو یہ سن کر رگھوپتی اندر ہی اندر تھرتھرا گیا۔ آشنا کا لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ بہت کچھ جان چکی ہے اور اب کیا پتا کہ وہ کیا قیمت مانگے؟ ایک لمحے کے لیے تو اس کا جی چاہا کہ وہ

پھر وہ سر جھکا کر کسی مجرم کی طرح اپنی موثر سائیکل پر سوار ہو گیا۔ یہاں تک تو غنیمت تھا اور کوئی بات خلاف توقع نہیں ہوئی تھی لیکن جیسے ہی ڈرائیور نے کار کی لائٹ کو آن کر کے کار اس کے قریب سے نکال کر آگے نکل جانے کی کوشش کی، ویسے ہی ایک لمحے کے لیے ہیڈ لائٹ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ گئی تھی اور اس لمحے کار کے اندر جولی کے برابر بیٹھی ہوئی آشنا نے اسے پہچان لیا تھا اور خود اس کی نظریں بھی آشنا کے چہرے پر جم گئی تھیں اور وہ بری طرح چونک پڑا تھا۔ یہ یہاں کہاں سے آگئی؟ کیا یہ بھی یوراج چندر بھوشن کے.....

اس کے آگے وہ کچھ نہیں سوچ سکا اور تیزی سے موثر سائیکل دوڑا دی۔ پھر اس نے اس طرح اپنے یہ پانچ روز گزار دیئے تھے جیسے آشنا نے اسے دیکھا ہی نہ تھا لیکن آج اچانک وہ اس کے گھر میں آکر اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔

شیو بناتے وقت آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے چونکہ گوبی ناتھ کے ساتھی رانا کو اس کا شکار بننے سے بچا لیا تھا، اس لیے وہ اس سے اس کا بدلہ لینے آئی ہوگی یا شاید اسے راج شاہی کے خلاف ہماری بغاوت کا علم ہو گیا ہوگا اور وہ ہمیں بلیک میل کرنے کی نیت سے یہاں آئی ہو؟ اندر آتے ہی اس نے کمرے کا دروازہ کیوں بند کر دیا؟ سوچتے سوچتے رگھوپتی کو اس طرح گھٹن سی محسوس ہونے لگی جیسے اس کی گردن دشمن کے شہنچے میں پھنس گئی ہو اور پھر تھوڑی دیر بعد اس نے اپنا شیو مکمل کر لیا۔

”اب بولیے آشنا دیوی، اس طرح اچانک کیسے آنا ہوا؟“ ذہنی طور پر وہ آشنا کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کر کے اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ”لگتا ہے ہماری جو ملاقات دہلی میں ہوئی تھی، اس ملاقات کی یاد ہی آپ کو یہاں لائی ہوگی؟“

”دہلی والی ملاقات تو پرانی ہو گئی۔“ آشنا نے ہونٹوں پر ایک طنز بھری مسکراہٹ بکھرا دی اور آگے بولی۔ ”میں تو اس تازہ ملاقات کے سلسلے میں آئی ہوں جو آج سے پانچ روز پہلے ہوئی تھی۔“

”تازہ ملاقات؟“ رگھوپتی نے جان بوجھ کر انجان بننے کی اداکاری کی تو آشنا اپنی

کہہ رہی تھی۔ ”تقریباً ایک ڈیڑھ بجے جب ہم لوگ پارٹی سے واپس آرہے تھے تو ایک کار میں بیٹھی بیٹا دیوی کے پاؤں سے جولی کا سینڈل نکلایا۔ اپنی کار میں وہ ایک بی سینڈل دیکھ کر سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے ڈرائیور سے پوچھ گچھ کی تو ڈرائیور گول دل جواب دینے لگا۔ جس پر بیٹا دیوی کا شک کچھ اور گہرا ہو گیا اور اس نے بڑے تلخ لہجے میں ڈرائیور سے کہا۔ ”سچ بچا دو کہ کار میں کون عورت بیٹھی تھی اور آج محل میں آنے سے پہلے تم کہاں گئے تھے؟“

ڈرائیور بیٹا دیوی کے لہجے سے ڈر گیا اور گھبرا کر بولا۔ ”میں مہمان محل میں ایک ایسی لڑکی کو چھوڑنے گیا تھا۔“

”کیا وہ نشے میں تھی؟ اس کا ایک سینڈل کار میں کیسے رہ گیا؟ وہ لڑکی اکیلی تھی یا اس کے ساتھ کار میں کوئی اور بھی تھا؟ بیٹا دیوی کے سوالات بڑھتے گئے اور ڈرائیور لہرا کر گول مول جواب دیتا گیا۔ ڈرائیور کی گھبراہٹ دیکھ کر بیٹا دیوی کا شک یقین میں دل گیا اور انہوں نے کار کو مہمان محل کی جانب لے جانے کا حکم دیا۔ یہ حکم سن کر ڈرائیور کانپ گیا تھا مگر حکم کی تعمیل تو اسے کرنی ہی تھی۔ اس طرح برسوں بعد بیٹا دیوی پہلی بار ایک بڑے ہی عجیب وقت پر مہمان محل پہنچ گئیں۔ انہیں دیکھ کر محل کے خدمت گاروں اور پہرے داروں کے ہوش اڑ گئے۔ وہ مہمان محل کے ہر کمرے میں گھوم آئیں لیکن انہیں وہاں کوئی مہمان دکھائی نہیں دیا اور جب خدمت گاروں سے پوچھنے کے باوجود انہیں کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملا تو میرا خیال تھا کہ اب واپس لوٹ جائیں گی لیکن عورت کے دل میں جب کوئی شک جاگتا ہے تو اس کے دل کی آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں اور وہ ایسا سب کچھ دیکھ لیتی ہے جو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں..... تھوڑی دیر بعد انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”آشائتمہیں نہیں معلوم مگر ہمارا ایک تہ خانہ بھی ہے۔ آؤ تمہیں دکھاتی ہوں۔“ لیکن اصل میں وہ اس بہانے پر تہ خانے کی بھی تلاشی لینا چاہتی تھیں۔ پھر جیسے ہی ہم تہ خانے کے زینے پر پہنچے تو ہمیں دیکھ کر سامنے سے آتی ہوئی گوگلی ملازمہ تھر تھر کانپنے لگی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر بیٹا دیوی کی رگوں میں دوڑنے والا راجپوتی خون اور جوش مارنے لگا اور انہوں نے آگے بڑھ کر تہ خانے کا دروازہ دھیرے سے کھول دیا۔ اندر جھانک کر

اچھل کر اس کی گردن دبا دے تاکہ اس کی بولتی ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے لیکن ایسا کرنے سے پہلے اس کے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ آشائے اس سلسلے میں کتنا کچھ جاننی ہے؟ یہی سوچ کر اس نے آشائے سے کہا۔

”اب بتا دو کہ آشائے کیا جانتی ہو؟ مجھے ذرا جلدی ہے۔“

”میں جانتی ہوں کہ تمہیں ساری بات جان لینے کی جلدی ہے۔“ کہہ کر آشائے ایک گہرا سانس لیا اور دھیرے سے بولی۔ ”اصل میں جولی کو تو اس کے ایک سینڈل نے ہی بچایا۔“

”سینڈل؟“ رگھوپتی بری طرح چونک پڑا۔

”ہاں۔“ آشائے نے کہا۔ ”جس کار میں جولی کو اغوا کیا گیا تھا وہ پردے والی کار بیٹا دیوی کی تھی۔“

”بیٹا دیوی؟ یہ کون ہے؟“ رگھوپتی نے حیرت سے پوچھا۔

”یوراج چندر بھوشن کی بیوی بیٹا دیوی۔“ آشائے بولی۔ ”اور اب وہ نیپال کی ہونے والی مہارانی ہے۔“

رگھوپتی نے اس کی بات غور سے سنی اور دل ہی دل میں بولا۔ ”لیکن وہ مہارانی نہیں بن سکے گی۔“ سوچتے سوچتے وہ فوراً ہی سنبھل گیا کیونکہ آشائے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے آگے کہہ رہی تھی۔ ”اغوا کرنے والے کارندے جولی کو کار میں ڈال کر لے گئے اور جب انہوں نے اس کو مہمان محل کے اندر کار سے باہر نکالا تو جولی کا ایک سینڈل کار کے اندر ہی رہ گیا تھا۔ جولی کو اتارنے کے بعد وہ کار واپس راج محل آگئی کیونکہ اس وقت بیٹا دیوی کے ساتھ مجھے بھی چینی سفارت خانے میں عورتوں کی ایک پارٹی میں جانا تھا۔ چونکہ جشن تاج پوشی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس لیے بیٹا دیوی کو کمپنی دینے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے۔ میرے شوہر پرشاد جی کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ نئے راجا کی تاج پوشی کے بعد مہاراجہ چندر بھوشن اور مہارانی بیٹا دیوی ہماری خدمات کا اچھا بدلہ دیں گے۔“

رگھوپتی کا جی چاہا کہ وہ کہے ”کہ تم دونوں میاں بیوی سچ بچ بڑے لالچی ہو..... مگر ایک بار پھر اسے اپنی اس خواہش کا گلا گھونٹ کر آشائے کی بات پر پوری توجہ دینا پڑی۔

دیکھا تو انہیں سہمی سہمی ہوئی جولی دکھائی دی۔ موت کے شعلے میں گھری ہوئی کوئی بے بس عورت جس طرح کسی تیسرے آدمی کو دیکھ کر مدد کے لیے اس کی جانب لپکتی ہے، بالکل اسی طرح جولی بھی دوڑ کر بیٹا دیوی سے لپٹ گئی۔ اسے ہچکیاں لے لے کر روئے دیکھا تو بیٹا دیوی کی آنکھوں میں غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔ پھر تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد جب جولی کی ہچکیاں بند ہو گئیں تو بیٹا دیوی نے اس سے پوچھا کہ مجھے بتاؤ کہ تمہیں کون یہاں لایا تھا؟ کس نے تم پر کیا کیا ستم ڈھایا ہے؟ بیٹا دیوی کے پوچھنے پر جولی نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔

”سب کچھ؟“ رگھوپتی چونک کر پوچھ بیٹھا تو آشا کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”ہاں۔ جو کچھ بھی بتانے کے لائق تھا، وہ سب جولی نے بتا دیا۔“ کہہ کر آشانے ٹٹولنے کے انداز میں تھوڑی دیر رک کر رگھوپتی کو گھورا، پھر آگے بولی۔ ”بیٹاری جولی کو تو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اسے کون اٹھا کر لے گیا تھا کیونکہ اغوا کرنے والوں نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی جبکہ گوگلی نوکرانی نے بھی اپنے چہرے کو نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ اس لیے وہ اسے بھی پہچان نہیں سکتی تھی اور اس کی عزت پر حملہ کرنے والے درندے نے بھی اپنا چہرہ سیاہ نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بیٹاری جولی نہ تو کسی کو دیکھ سکی اور نہ ہی وہ کسی کا نام جان سکی تھی۔“

یہ سن کر رگھوپتی نے اطمینان کا سانس لیا، پھر بولا۔ ”پھر کیا ہوا آشا؟“

”پھر وہیں سے ہی راج محل فون کر کے بیٹا دیوی نے یوراج چندر بھوشن سے رابطہ قائم کھننے کی کوشش کی تاکہ انہیں وہ اس بات سے آگاہ کر سکیں۔“ آشانے بتاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن چندر بھوشن جی سر میں درد ہونے کی وجہ سے سو گئے تھے۔ اس لیے بیٹا دیوی جولی کو آسرا دینے کی خاطر اسے اپنے ساتھ راج محل لے جانے لگیں اور جس وقت ہم کار میں بیٹھ کر راج محل کی طرف جا رہے تھے تو تمہاری موٹر سائیکل نے ہمارا راستہ روک لیا تھا۔“

آشا کی بات ختم ہوئی تو رگھوپتی یہ سوچنے لگا کہ اب وہ آشا سے کیا پوچھے؟ ویسے جولی نے یوراج چندر بھوشن کا نام بیٹا دیوی کو نہ بتا کر بڑی سمجھداری کا ثبوت دیا تھا

لیکن اس کے باوجود آشا کی باتوں اور اس کے لہجے سے یہ اظہار کیوں ہو رہا ہے کہ وہ اور بھی بہت کچھ جانتی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اس طرح کی اداکاری کر کے خود اس کے منہ سے اگلوانا چاہتی ہو؟

”پھر کیا ان اغوا کرنے والوں کا پتا چلا؟“ اس نے انجان بنے رہنے کا دکھاوا کرتے ہوئے پوچھا۔ ”یوراج چندر بھوشن صاحب نے تو انہیں سخت سزا دی ہوگی؟“

”اغوا کرنے والوں کا پتا تو نہیں چلا ہے لیکن شری یوراج چندر بھوشن نے شاہی مہمان محل کے تمام ملازموں کو قید خانے میں ڈال دیا ہے۔ دیر سویر ان میں سے کوئی ذرا بے جرم کا اقرار کرے گا ہی۔“ بولتے بولتے آشا ایک پل کے لیے رکی، پھر آگے بولی۔ ”جب تک تاج پوشی کی رسم ادا نہیں ہو جاتی، اس وقت تک اس بات کو خفیہ رکھا ہی بہتر ہے کیونکہ بہت سے پردہ سی مہمان بھی اس موقع پر یہاں آ رہے ہیں اور اگر ایسی بات پھیل گئی تو یہ پورے ملک کے لیے بدنامی کا باعث بھی بن سکتی ہے۔“

”بالکل۔“ رگھوپتی اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”شاید اس بات کو خفیہ رکھنے کے لیے یوراج صاحب اس کی زیادہ تفتیش ہی نہیں کرائیں گے۔ ممکن ہے تاج پوشی کی خوشی میں وہ دوسرے قیدیوں کے ساتھ جولی کو اغوا کرنے والے مجرموں کو بھی معاف کر دیں۔“

”مجرموں کو یوراج تو معاف کر دیں گے۔“ آشانے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”لیکن کیا اوپر والا سب سے بڑا راجا انہیں ان کے جرم کی سزا نہیں دے گا؟“

”آشانے ایک گہرا سانس لے کر یہ بات کچھ اس طرح سے کہی کہ وہ اس بات پر بھروسہ نہ لگا کہ کیا یہ بھی آشا کی اداکاری ہی ہے؟ اس کے دل میں اگر اوپر والے کا کوئی خوف ہوتا تو یہ آج تک پرانے مردوں کو کیوں اپنے ہوس کے جال میں پھانسی دیتی؟ ایسی بے حیا اور بے شرم عورت کے منہ پر اوپر والے کے خوف کی بات اچھی نہیں لگتی۔ یہ ساری باتیں سوچنے کے باوجود رگھوپتی کو یہ ضرور محسوس رہا تھا کہ اس وقت آشا کی باتوں میں اسے بناوٹ کی جھلک نظر نہیں آرہی ہے۔

”یہ بہت اچھا ہوا آشا کہ تم جولی کی خیر خیریت بتانے کے لیے میرے پاس آئی اور“ تھوڑی دیر بعد رگھوپتی نے کہا۔ ”اس کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں اور

اب مجھے یہ بتاؤ کہ اس کے بدلے میں تمہیں کیا چاہیے؟  
 ”میں جو مانگوں گی، وہ دو گے؟“ آشا نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔  
 ”اگر میرے ہاتھ کی بات ہوگی تو ضرور دوں گا۔“ رگھوپتی نے کہا۔

”یہ تمہارے ہاتھ کی بات ہے۔“ آشا کی یہ بات سن کر رگھوپتی اس طرح بوکھلا گیا جیسے کسی نے اس پر زندہ سانپ پھینک دیا ہو۔ وہ آشا کو دیکھ ہی رہا تھا کہ آشا کی آواز پھر اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”مجھے تمہاری یہ انگوٹھی چاہیے۔“

”یہ انگوٹھی۔“ رگھوپتی نے اس طرح پوچھا جیسے اسے یقین ہی نہ آرہا ہو۔ وہ چند لمحوں تک تو حیرت بھری نظروں سے آشا کو دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ”آشا میرا خیال ہے تم سے کوئی بھول سرزد ہو رہی ہے۔ لگتا ہے اس انگوٹھی کے چمکتے ہوئے پتھر کو دیکھ کر تم نے اسے بہت قیمتی سمجھ لیا ہے لیکن صرف سو روپے میں ایسی درجن بھر انگوٹھیاں بازار میں ملتی ہیں۔“

”اگر یہ اتنی ہی سستی سی چیز ہے تو اتار دو نا۔“ آشا نے بڑے ہی سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”میں اس انگوٹھی کے نگ کے اندر چھپی ہوئی گولی کی قیمت خوب اچھی طرح جانتی ہوں۔“

رگھوپتی کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور باوجود کوشش کے وہ اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپا نہیں سکا۔ اس نے سوچا کہ آشا کی اس بات کا مطلب تو یہی نکلتا ہے کہ اس نے جولی سے انگوٹھی کا راز بھی جان لیا ہے لیکن پھر بھی جان بوجھ کر وہ اس کے پاس سے یہ موت کی انگوٹھی کیوں مانگ رہی ہے؟ رگھوپتی کو اس کی چال سمجھ میں نہیں آرہی تھی، اس لیے وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ شاید راج شاہی کے خلاف ہونے والی بغاوت کا راز بھی اب آشا کی مٹھی میں آچکا ہے اور اگر اس مکار عورت نے اپنی مٹھی کھول دی تو ان کے سارے منصوبے پر پانی پھر جائے گا۔

”میں نے اتنی معمولی سی چیز مانگ کر شاید تمہیں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔“ آشا کے لہجے میں حد درجہ مٹھاس آگئی تھی اور وہ بڑی ہی گھمبیر لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہی تھی۔ ”یقین کرو مجھے جولی نے کچھ بھی نہیں بتایا ہے لیکن میں اتنا ضرور جان گئی

ہوں کہ اس نے جو انگوٹھی پہن رکھی ہے، اس کے اندر موت کی گولی ہے۔ میں نے تو اس سے صرف اتنا ہی پوچھا تھا کہ جولی اگر تمہاری عزت لٹ جاتی تو تم کیا کرتیں؟ میرا یہ سوال سن کر وہ جوش میں آگئی اور اپنی انگوٹھی کا ڈسکن کھول کر بولی تو میں یہ گولی کھا کر خودکشی کر لیتی۔“

”تو پھر تمہیں اس گولی کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔“ رگھوپتی نے پوچھا۔  
 ”اتنے سمجھدار ہونے کے باوجود بھی تم یہ بات نہیں سمجھتے؟“ کہہ کر آشا نے اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا اور بولی۔ ”لو اپنے ہاتھوں سے میرے بلاؤز کی زیپ کھول دو پھر ساری بات تم سمجھ جاؤ گے۔“

یہ سنتے ہی رگھوپتی کی پیٹھ اس طرح صوفے کی پشت سے لگ گئی جیسے کسی نے اسے زوردار دھکا دیا ہو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بند کمرے کے اندر آشا اس کے ہاتھ سے اپنے بلاؤز کی زیپ کھلوا کر کیا کھیل کھیلنا چاہتی ہے؟ یکایک اس نے سوچا کہ اسے اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھول کر اس ناپاک عورت کو باہر نکال دینا چاہیے۔ ابھی اس نے اٹھنے کا فیصلہ ہی کیا تھا کہ اچانک آشا نے اپنے بلاؤز کی زیپ خود ہی کھول کر اپنی تنگی پیٹھ اس کے سامنے کر دی اور بولی۔

”لو دیکھ لو..... تمہیں کچھ نظر آرہا ہے؟“ اتنا کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ پیٹھ کے پیچھے رکھا اور پیٹھ کے قریب پڑے ہوئے دو گڑھوں پر اپنی انگلی رکھ دی اور آگے بولی۔ ”یہ نشان اس درندے کے فولادی پنجوں کے ہیں۔ اس کا پہلا شکار میں ہی بنی تھی۔ اس وقت اس نے چہرے پر نقاب نہیں چڑھا رکھا تھا۔ پہلے اس نے میرا لہو چاٹا اور پھر میری عزت لوٹی اور اس کے بعد میرے لیے اس نے ایک شوہر بھی تلاش کر دیا۔“

”آشا۔“ رگھوپتی چیخ مار کر اٹھا اور اس کے سامنے آکر بولا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ آشا کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ ابھی تک رگھوپتی کو جو ایک بدکردار اور آوارہ عورت نظر آرہی تھی، اس کے آنسوؤں کو دیکھ کر رگھوپتی کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ جاگ پڑا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ آشا کی بھیگی ہوئی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ پھر اپنا انگوٹھی والا ہاتھ اس کی جانب بڑھا کر دھیرے سے بولا۔

”رگھوپتی نے چونک کر گردن گھمائی تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ جس شخص کو اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لینا چاہیے تھا، اسے پہچاننے میں اسے دشواری سی محسوس ہوئی تھی۔ وجہ اس کے سامنے کھڑا تھا لیکن اس کا حلیہ کافی بدلا ہوا تھا۔ میرون رنگ کا لمبا سا چونچ، گلے میں موٹی موٹی مالاٹیں اور سر پر سادھو سوامی بابا جیسی میرون رنگ پگڑی۔ بڑھی ہوئی داڑھی اور مونچھیں اگر اس کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ نہ ہو تو وجہ بالکل سادھو سوامی بابا کی نقل لگ سکتا تھا۔

وجہ کو پہچان لینے کے بعد رگھوپتی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی دوڑ گئی۔ اس نے اس سے ہاتھ ملانے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک اسے خیال آگیا کہ آس پاس بہت سارے لوگ موجود ہیں اور وجہ ایک سادھو کے روپ میں اس کے سامنے کھڑا ہے۔ اس لیے اسے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور ادب سے وجہ کے آگے جھک کر بولا۔ ”جئے ہشمتی ناتھ۔“

”جئے ہشمتی ناتھ۔“ جواب میں وجہ نے بھاری آواز میں کہا اور سوامی بابا کی طرح اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس نے آشرवाद دیا اور کہا۔ ”بچہ ہمارے ٹھہرنے کا انتظام کہاں رکھا ہے؟“

”تشریف لے چلے مہاراج۔“ کہہ کر رگھوپتی اسے ٹیکسی کی جانب لے جانے لگا لیکن تب ہی شوہا اپنے باپ اروند آزاد کے ساتھ وہاں آپہنچی۔ اس نے قریب آتے ہی وجہ کو مخاطب کر کے کہا۔ ”مہاراج میرے پتاجی نے مجھے بتایا ہے کہ آپ ہمالیہ سے تشریف لائے ہیں۔“ اتنا کہہ کر وہ وجہ کو پرنام کرنے کے لیے ذرا آگے جھکی تو وجہ نے سادھو سوامی بابا کے انداز میں اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر دھیرے سے کہا۔ ”ہمالیہ تو یہاں بھی ہے، من کی آنکھیں کھول کر دیکھ لے۔“

رگھوپتی ٹیکسی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ وجہ نے ایک نظر شوہا پر ڈالی اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ ٹیکسی کے اندر داخل ہو گیا۔ رگھوپتی نے دروازہ بند کیا اور گھوم کر دوسری جانب کے دروازے میں داخل ہو کر بیٹھ گیا لیکن اس سے پہلے کہ ٹیکسی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھتی، شوہا ایک بار پھر ان کے قریب آگئی اور ٹیکسی کی کھڑکی کے

”آشا..... تم اپنے ہاتھوں سے ہی یہ انگوٹھی اتار لو۔ تمہارے آنسوؤں میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ آج تک میں تمہیں ایک بدچلن اور آوارہ عورت سمجھ رہا تھا مگر.....“ بولتے بولتے رگھوپتی کی آواز بھرا گئی۔

”لیکن اب مجھے اچھا سمجھنے کی بھول نہیں کرنا۔“ کہہ کر اس نے رگھوپتی کی انگلی سے انگوٹھی اتار کر اپنی انگلی میں ڈال لی اور بڑی بھاری آواز میں بولی۔ ”اپنا بدلہ لینے کے لیے نکلنے والی عورت بڑی بے رحم بن جاتی ہے۔ پھر چاہے اس کے انتقام کا نشانہ اس کا شوہر ہو یا کوئی راجہ ہو۔“

اس کے آخری الفاظ سن کر رگھوپتی کا سارا شک دور ہو گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ آشا ان کی بغاوت والی سازش سے واقف نہیں ہے بلکہ یوراج چندر بھوشن سے اپنا انتقام لینے کے لیے تڑپ رہی ہے۔

آشا کمرے سے باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی تو رگھوپتی کا ہاتھ آپ ہی آپ اس کی جانب بڑھ گیا اور وہ اسے روک کر بولا۔ ”آشا جولی کا خیال رکھنا اور ایسا کوئی موقع نہ آئے دینا کہ اسے یہ گولی کھانا پڑ جائے۔“

یہ سنتے ہی آشا نے جھٹ اپنے آنسو پونچھ لیے۔ پھر اپنے ہاتھوں کی پانچوں انگلیاں اٹھا کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”دیکھو میری انگلیوں میں اب دو انگوٹھیاں ہیں۔ ایک شادی کی انگوٹھی ہے اور دوسری موت کی لیکن شادی کی اس انگوٹھی کو پہنتے ہی میں مر چکی تھی۔ اس لیے جو مر چکا ہو، اسے اب موت کا خوف کیوں ہوگا؟“ اتنا کہہ کر آشا باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد دیر تک رگھوپتی کے کانوں میں اس کے کہے ہوئے الفاظ گونجتے رہے۔



کچھ تاخیر سے ایئر پورٹ پہنچنے والا رگھوپتی جب ٹیکسی رکوا کر نیچے اترا تو وجہ کسٹم سے فارغ ہو کر باہر آچکا تھا۔ رگھوپتی نے اسے تلاش کرنے کے لیے جب کسٹم میں جھانکا تو بہت ہی قریب سے ایک آواز اس کی سماعت سے نکرائی۔ ”جئے ہشمتی ناتھ۔“

سامنے جھک کر بولی۔ ”یہ مہاراج میں آپ کی خدمت میں ایک حقیر سا نذرانہ پیش کر رہی ہوں۔ اسے قبول کر لیجئے۔“ اتنا کہہ کر اس نے ان دونوں کے ہاتھوں میں ایک ایک پیکٹ پکڑا دیا۔ ٹیکسی اشارت ہوئی تو اس نے دھیرے سے رگھوپتی سے کہا۔ ”اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر ہی اسے کھولنا۔“

وجہ اور رگھوپتی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہی رہے۔ وہ کچھ پوچھنے اور کچھ کہنے کے لیے کافی بے چین دکھائی دے رہے تھے لیکن ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی کی وجہ سے انہیں صبر کرنا پڑ رہا تھا لیکن پھر بھی بے خیالی میں رگھوپتی نے ایک بار اپنی گود میں پڑے ہوئے پیکٹ کو کھولنے کی کوشش کی تھی مگر تب ہی وجہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ ”بچہ ذرا صبر سے کام لے۔“

وجہ نے رگھوپتی کو پیکٹ کھولنے سے روک دیا تھا لیکن اندر ہی اندر وہ خود بھی پیکٹ کھول کر دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا کہ آخر شوہا نے ایسی کیا چیز ان پیکٹوں میں پیک کر کے انہیں دی ہے؟

گھر پہنچ کر رگھوپتی نے اپنے دروازے کا تالا اس طرح کھولا جیسے یہ تاخیر بھی اس سے برداشت نہیں ہو رہی ہو۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے وجہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑی بے صبری سے بولا۔ ”وجہ ہم ایسا کرتے ہیں کہ دونوں ایک ساتھ ہی اپنے اپنے پیکٹ کھولتے ہیں۔ ریڈی، ون، ٹو تھری.....“

پیکٹ پر لپٹے ہوئے کلفزات ان دونوں نے ایک ساتھ ہی اتار پھینکے۔ پھر اندر سے نکلنے والی چیز پر ان کی نظریں کسی مقناطیسی لوہے کی طرح چپک گئیں۔ پھر دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ ”ارے یہ تو ٹائم بم ہے۔ قوم کے سب سے بڑے مگر سب سے بھیانک لیڈر کی جیون کمانی۔“

دونوں کے ہاتھوں میں تقریباً دو صفحات کی ایک ایک کتاب تھی جس کے ٹائٹل پر سرخ رنگ سے لکھا تھا ”ٹائم بم۔“ اور واقعی یہ کتاب انہیں اس وقت ٹائم بم کی طرح ہی خطرناک محسوس ہو رہی تھی۔

”شوہا نے پرشورام کے مسودے کی کتاب بھی چھپوائی؟“ تھوڑی دیر بعد وجہ نے کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔ ”لیکن پرشورام کے مسودے کی

فائل اس کے ہاتھ میں کیسے آگئی؟“

”ارے کتاب کو کھول کر ذرا پانچویں صفحے پر تو دیکھو۔“ رگھوپتی نے کہا اور خود ہی پڑھ کر سنائے لگا۔ ”خونی درندے کی بھیٹ چڑھ جانے والی ایک معصوم لڑکی رکنی دیوی عرف روکھی کے نام.....“

یہ جملہ پڑھتے ہی دونوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ آنسو روکھی کی موت پر بھی بہہ رہے تھے اور شوہا کی ہمت پر بھی۔ تھوڑی دیر تک دونوں دھندلائی ہوئی آنکھوں سے کتاب کو گھورتے رہے۔ پھر وجہ اس طرح دھیرے دھیرے بڑبڑانے لگا جیسے خود سے بات کر رہا ہو۔ ”اب سمجھ میں آرہا ہے کہ شوہا نے لاکھ روپے واپس کیوں کر دیئے تھے؟ درندے سے بدلہ لینے کے لیے اس کے ہاتھ میں ٹائم بم آگیا ہوگا کیونکہ اس نے کہا تھا کہ اب مجھے لاکھ روپے کی ضرورت نہیں ہے۔ بدلہ لینے کے لئے مجھے ایک سستا مگر بے حد موثر ہتھیار مل گیا ہے اور وہ ہتھیار یہی ٹائم بم ہے۔“

”لیکن پرشورام کے مسودے کی فائل شوہا کو کیسے اور کہاں سے مل گئی؟“ رگھوپتی نے وجہ کی بڑبڑاہٹ سننے کے بعد کہا۔ ”آخری بار تو اس مسودے کی فائل سندھی رام چندر رڈی والے کے پاس تھی جس سے روکھی وہ فائل لے گئی تھی اور اس کے دوسرے روز ہی اس کا قتل ہو گیا تھا.....“ ابھی رگھوپتی نے اتنا ہی کہا تھا کہ کمرے میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کی کھنٹی بج اٹھی۔

”شاید شوہا کا ہی ہوگا۔“ کہہ کر رگھوپتی فون کی جانب بڑھا اور پھر کان پر ریسیور لگاتے ہی اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ دوسری طرف شوہا ہی تھی جو پوچھ رہی تھی۔ ”کتاب دیکھی؟“

”ہاں شوہا..... اور ابھی ہم اس کے اثر سے باہر بھی نہیں نکل پائے تھے کہ تمہارا فون آگیا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ.....“

”کہ فائل میرے قبضے میں کیسے آگئی؟“ شوہا نے دوسری طرف سے اس کی بات کاٹ دی اور اس کی ادھوری بات مکمل کر کے آگے بولی۔ ”میں فون پر زیادہ تفصیل نہیں بتاؤں گی۔ بس اتنا بتا دیتی ہوں کہ روکھی رڈی والے سندھی سیٹھ سے فائل لے کر اسے اپنے گھر لے ہی نہیں گئی تھی بلکہ اس نے وہ فائل بیٹنی پارلر میں ہی ایک

اس وقت اسے یہ بات کہاں معلوم تھی کہ انہی بیٹیوں میں وہ طاقت چھپی ہوئی ہوگی جو آزادی وطن کی جدوجہد کے لیے ان کے کام آئے گی اور پھر دہلی جاتے وقت الہ آباد ایکسپریس میں جب پرشورام نے اپنے مسودے کی فائل اس کے سپرد کی تھی تو اس وقت اس کے تصور میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اپنی جس بہن کو تلاش کرنے کے لیے وہ اپنے وطن سے باہر نکلا ہے، وہی بہن روکھی آج ایک کتاب کے روپ میں اس کے ہاتھ میں ہوگی۔

وجے اور رگھوپتی ہر بات کو بھول کر جلد سے جلد اس کتاب کو پڑھ ڈالنا چاہتے تھے۔ دو سو صفحات پر مشتمل کتاب ٹائم بم کے ختم ہونے تک وہ دونوں ایک دوسرے کی موجودگی کو بھی فراموش کر چکے تھے۔ پھر کتاب کا آخری صفحہ ختم کر کے انہوں نے اس کا آخری پیرا گراف تقریباً ایک ساتھ ہی پڑھا۔ ”لوگ اسے دانا“ درویش دھگیر، داور اور دیوتا جیسے القابات سے یاد کرتے ہیں۔ اسے اپنا رہبر اور ایک رحم دل انسان سمجھتے ہیں، اسے اپنا اور اپنی قوم کا نجات دہندہ مانتے ہیں۔ لوگوں کی نظروں میں وہ انتہائی ہوشیار اور ہونمار لیڈر ہے۔ قوم اسے انہی القاب سے یاد کرتی ہے لیکن اس ناپاک انسان کا اصل نام تو ان القاب کے پہلے لفظ کو ملا کر پڑھا جائے۔

مثلاً دیوتا کا پہلا لفظ ”د“ رہبر کا پہلا لفظ ”ر“ نجات دہندہ کا پہلا لفظ ”ن“ دھگیر کا پہلا لفظ ”د“ اور ہونمار کا پہلا لفظ ”ہ“ کو اگر ملا کر پڑھا جائے تو وہ ”درندہ“ بن جاتا ہے اور یہی اس کی اصلیت ہے۔

اس آخری پیرا گراف کو پڑھ کر ان دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن دوسرے ہی لمحے انہیں خیال آگیا کہ چونکہ شوبھا خود اس بھیڑیے کا شکار بن چکی ہے، اس لیے وہ اس کی اصلیت سے بھی واقف تھی۔ جب ہی اس نے اس کے تمام القاب سے ایک ایک لفظ نکال کر اسے ”درندہ“ کا نام دیا ہے۔ انہیں یاد آگیا کہ شوبھانے انہیں بتایا تھا کہ بھارت سرکار کا ایک بے محکمہ وزیر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بڑے بڑے سیاست دانوں اور بڑے بڑے لیڈروں کے بستروں پر چھوڑ آتا تھا۔ پرشورام نے یہ صاف صاف لکھا تھا کہ آزادی کی جنگ لڑنے والے سپاہی اروند آزاد کی بیٹی شوبھا کو ایک بڑے وزیر نے ہتھ پکڑ لیا تھا کہ ہم نے ایک بے محکمہ وزیر

جگہ چھپا کر رکھ دی تھی۔“

انتی دیر میں وجے نے آگے بڑھ کر رگھوپتی کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا اور شوبھا سے بولا۔ ”لیکن شوبھا تم نے ٹائم بم کا دھماکہ وقت سے پہلے کر دیا ہے۔ ابھی ہمارا اہم کام تو.....“

”نہیں وجے۔“ شوبھانے پھر بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ٹائم بم کو بالکل فٹ کر کے ہی رکھا ہے۔ بھارت میں اس کا دھماکا اس وقت ہوگا جب ہم یہاں سے اس کا سوچ دیا نہیں گے۔“

یہ سن کر وجے چپ رہ گیا۔ ٹھیک اسی وقت رگھوپتی نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا اور شوبھا سے بولا۔ ”شوبھا اب یہ بتاؤ کہ تم مجھے اس درندے کے پاس کب لے جاؤ گی؟“ رگھوپتی شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ پہلے کی طرح اس بار بھی شوبھا اس کے سوال کو درمیان میں ہی کاٹ کر ٹال دے گی لیکن اس بار اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا کیونکہ شوبھا کہہ رہی تھی۔ ”آئندہ پیر کے روز شام کے ٹھیک سات بجے۔“ اتنا کہہ کر اس نے ریسیور رکھ کر سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

ایک ایک لمحہ بڑی بے چینی میں گزر رہا تھا۔ منگل کے دن وجے نے جب کھٹنڈو میں قدم رکھا تو کھٹنڈو ایئرپورٹ پر ہی پرشورام کی کتاب ٹائم بم اس کے ہاتھوں میں آگئی تھی اور تب اس نے محسوس کیا تھا کہ ایک سنسنی خیز کھیل کا پہلا حصہ اب ختم ہو گیا ہے۔

مہاراجہ کے گناہوں کا بوجھ اپنے سر لے کر جب اس نے اپنا وطن چھوڑا تھا تو یہ بات اس کے تصور میں بھی نہیں تھی کہ کوئی غیبی قوت اسے کسی انجانے راستے پر لے جا رہی ہے۔ دو ایسے واقعات جن کا آپس میں ایک دوسرے سے کوئی ربط ہی نہ ہو، وہ دونوں واقعات اگر اچانک ایک دوسرے میں گڈنڈ ہو جائیں تو آدمی حیران سا رہ جاتا ہے۔ بینک سے لوٹی ہوئی رقم سے بھری ہوئی دو بیٹیوں کو اس نے سورگباشی مہاراجہ کے گناہوں سے بھری ہوئی بیٹیاں سمجھ کر ایک کنویں میں پھینک دیا تھا۔ تو

اور یہاں کے چھوٹے بڑے راجاؤں پر رانا ہی حاوی تھے لیکن پھر راجاؤں نے بغاوت کی اور راناؤں کی حکومت کا خاتمہ کر کے اپنی راجاشاہی حکومت قائم کر دی اور اب عوام ان کے خلاف بغاوت کر کے اپنی عوامی حکومت قائم کرے گی، اس لیے میرے خیال میں آزادی کی جنگ لڑنے والے سپاہی کو پہلے سے کوئی نتیجہ نہیں سوچنا چاہیے۔“

رگھوپتی کی یہ دلیل سن کر وجے کو خاموش ہو جانا پڑا۔ دہلی سے رگھوپتی کے چلے جانے کے بعد وجے دن رات اسی بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس نے کارل مارکس، پلائو، قائد اعظم محمد علی جناح اور مہاتما گاندھی تک کے خیالات پڑھ ڈالے لیکن وہ اپنی ایک آزاد ریاست اور آزاد قوم کا کوئی نقشہ نہیں بنا سکا اور تب اس نے یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لی تھی کہ آزادی حاصل کر لینے کے بعد ہر قوم اپنی زندگی کا راستہ خود ڈھونڈ لیتی ہے۔

اور اس وقت بھی اسے اپنے دل کو یہی تسلی دے کر خود کو کام میں مصروف کر لینا پڑا تھا۔ بغاوت کی سازش کو کامیاب بنانے کا سارا پلان اس نے رگھوپتی سے سمجھ لیا تھا اور ایک اہم ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ سادھو سوامی بابا کے بھیس میں رہ کر ہی اسے فلموں کے پرنٹ پروجیکشن کے لیے پہنچانے تھے۔ ان ساری باتوں کے بعد رگھوپتی نے اس سے کہا تھا۔ میں ہر جگہ چیک کر کے خود ہی دیکھ لوں گا کہ وہاں کیسی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس کے بعد میں پیر کی شام کو شوہا کے ساتھ جا کر پرشورام کے درندے کا خاتمہ کر دوں گا۔“ رگھوپتی کی یہ بات سن کر وجے اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن تب ہی ٹیلی فون کی کھنٹی بجنے لگی تھی۔



اس لیے رکھا ہوا ہے کہ وہ تم جیسی خوبصورت لڑکیوں کے پاس با آسانی پہنچ جایا کرے۔

”تم کس سوچ میں ڈوب گئے ہو وجے؟“ رگھوپتی نے کتاب بند کر دی اور اسے اپنے بستر کے نیچے چھپا کر بولا۔ ”لگتا ہے میری طرح تم بھی یہی سوچ رہے ہو کہ ابھی اور اسی وقت چل کر اس درندے کو گولی مار دوں، ہے نا؟“

”اس کا وقت تو شوہا نے مقرر کر رکھا ہے۔ میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔“ وجے کتاب کے سرورق کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”عوامی حکومت قائم کرنے کے لیے ہم نے راجاشاہی حکومت کو ختم کرنے کا فیصلہ تو کر لیا ہے لیکن ہمارے پاس اس کی کیا ضمانت ہے کہ عوامی حکومت کے اندر بھی کوئی ایسا درندہ پیدا نہیں ہوگا؟“

”تو کیا تم.....“

”نہیں۔“ وجے نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی اور کہا۔ ”راجاشاہی حکومت کے خلاف ہونے والی ہماری بغاوت کو روکنا اب مشکل ہے کیونکہ راجاشاہی حکومت کی جگہ عوامی حکومت قائم کرنے کے سوا اب کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔“

”یہ سب تم جانو۔“ رگھوپتی نے آکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں نے تو صرف روکھی کا بدلہ لینے کا عہد کر رکھا ہے۔ چاہے دشمن کا تعلق راجاشاہی سے ہو یا عوامی نمائندے سے ہو، جو بھی ہو دیکھا جائے گا۔“

”ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے والوں کو اگر یہ بات معلوم ہوتی کہ ان کی قربانی کے نتیجے میں ہندوستان کو ایسی آزادی نصیب ہوگی تو وہ کبھی آزادی کے لیے نہ لڑتے۔“ کہہ کر وجے نے آگے کہا۔ ”یہی بات مجھ سے شوہا کے باپ نے پوچھی تھی۔“

”تو پھر تم نے اس کا کیا جواب دیا تھا؟“ رگھوپتی نے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ میرا جواب صحیح تھا یا غلط لیکن میں نے کہا تھا کہ اگر ایک جنگ سے کوئی بہتر نتیجہ نہ نکلے تو دوسری جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔“ وجے بولا۔ ”بس تو پھر تم راجاشاہی اور عوامی حکومت کا موازنہ کیوں کرتے ہو؟“ رگھوپتی اس طرح بولا جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو۔ ”شروع شروع میں یہاں نیپال پر راناؤں کی حکومت تھی



”محل میں اور میرے آنے کی ترکیب؟“ وجے نے ایک جھٹکا سا محسوس کیا، پھر سنبھل کر بولا۔ ”مگر مجھے صبح سویرے ہی باہر نکل جانا ہے۔“ ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ دوسری طرف سے جولی کی بجائے اسے آشا کی آواز سنائی دی۔ ”سنئے گرو دیو جی..... آپ کی داسی جو آپ سے کہتے ہوئے شرمنا رہی ہے، وہ بات میں آپ کو بتاتی ہوں۔ اصل میں آپ کی داسی جولی یہ نہیں چاہتی کہ جس نے اسے ایک نئی زندگی دی ہے، اس ہونے والی مہارانی بیٹا دیوی کی قسمت کا ستارہ طلوع ہونے سے پہلے ہی نہ ڈوب جائے۔ کیا آپ مہارانی کو اس اداسی سے نکال کر انہیں خوش قسمتی کا آشیرواد دے سکتے ہیں؟“

آشا کی یہ بات سن کر وجے کانپ اٹھا۔ جولی نے آشا کے ذریعے جو بات کہلوائی تھی، اس کا مطلب تو یہ تھا کہ یوراج چندر بھوشن جیسے ناپاک درندے کو معاف کر دیا جائے۔ چونکہ بیٹا دیوی نے عین وقت پر پہنچ کر جولی کی عزت اور اس کی جان بچائی تھی۔ اس کے بدلے میں جولی بیٹا دیوی کے ساگ کو زندگی دینا چاہتی ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو پھر معصوم روکھی اور دوسری بہت سی لڑکیوں کی قربانی کا بدلہ کس طرح لیا جاسکے گا؟

”آپ نے خاموشی کیوں اختیار کر لی؟“ دوسری طرف سے جواب نہ پا کر شوہانے پوچھا اور آگے کہا۔ ”آئندہ منگل کے روز جشن کی تقریب کا دعوت نامہ آپ کو مل جائے گا اور آپ کی جولی کی خواہش ہے کہ مجرم کی جان بخشی کا مطلب قید خانہ بھی ہو سکتا ہے۔“ آشانے یہ آخری الفاظ بہت جلدی میں کہہ کر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا لیکن پھر وجے ریسپور ہاتھ میں لیے دیر تک کھڑا رہا۔ یہ دیکھ کر رگھوپتی نے بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر پر تجسس لہجے میں بولا۔ ”کیا ہو گیا وجے؟“

”بہت برا۔“ کہہ کر وجے نے ریسپور رکھ دیا۔ پھر اس نے اس بات کی ساری تفصیل رگھوپتی کو بتا دی جو ابھی ابھی جولی نے آشا کے ذریعہ اس سے کہلوائی تھی۔

”ایسی بات پر تو سوچنا بھی نہیں چاہیے۔“ رگھوپتی غصے میں پھٹکارتا ہوا بولا۔ ”ارے اگر بیٹا دیوی کے سامنے اس کے نامدار شوہر کا اصل روپ ظاہر ہوگا تو بیوی ہونے کے باوجود اس کے دل میں ایسے شیطان صفت آدمی کے لیے ہمدردی کا جذبہ

”شوہا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔“ کہہ کر رگھوپتی نے ریسپور اٹھا لیا تھا لیکن دوسری طرف سے آنے والی آواز عورت کی ہونے کے باوجود شوہا نہیں تھی، کون آشا؟ کون ہیں آپ؟“ اس نے پوچھا۔

”میں آشا ہی ہوں۔“ دوسری طرف سے آشانے کہا۔ ”میں اس وقت بیٹا دیوی کے پرائیویٹ فون پر سے بات کر رہی ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارے یہاں کوئی گرو جی آئے ہیں؟“

”ہاں۔“ رگھوپتی نے وجے کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ ”ایک گرو دیو جی تشریف تو لائے ہیں لیکن تمہیں ان سے کیا کام پڑ گیا؟“

”ان سے مجھے کام نہیں پڑا ہے بلکہ یہاں ان کی ایک بھگت بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ ان سے بات کرنا چاہتی ہے۔“ کہہ کر آشانے ریسپور شاید جولی کو دیا تھا کیونکہ رگھوپتی کو یہی لگا تھا کہ وہ جولی اور وجے کی بات کرنا چاہتی ہے، لہذا رگھوپتی نے بھی اپنا ریسپور وجے کی طرف بدھاتے ہوئے کہا۔ ”لیجئے گرو دیو مہاراج، آپ کی کوئی داسی آپ کی آواز سننے کے لیے بے چین ہے۔“

وجے جلدی سے اٹھ کر فون کے پاس پہنچ گیا۔ جب وہ وہلی میں تھا تو اس وقت بھی آشانے ایک بار اس سے جولی کی بات کرائی تھی۔

”سب خیریت تو ہے ناں؟“ وجے نے ریسپور کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ ”آشا اور بیٹا دیوی تمہارا خیال تو رکھتی ہیں ناں؟“

”ہاں لیکن آپ کے درشن کے لیے دل تڑپ رہا ہے۔“ جولی کی آواز گھمبیر لگ رہی تھی۔ ”آشانے آپ کے محل میں آنے کی ترکیب سوچ لی ہے۔“

میں فون کر کے شوہا کے بارے میں پوچھا تو اسے کاؤنٹر پر سے یہی جواب ملا کہ ان کے کمرے کی چابی ہمارے پاس ہی موجود ہے۔

آخر وہ کہاں گئی ہوگی؟ رگھوپتی اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے یہ شک بھی ہونے لگا تھا کہ کہیں کسی نئے گاہک کو کمپنی دینے کے لیے تو نہیں چلی گئی ہوگی؟ آج سے پندرہ روز قبل تک تو شوہا کے بارے میں ایسی باتیں سوچی جاسکتی تھیں لیکن اس وقت رگھوپتی کو یہ ایک بڑی واہیات سی بات معلوم ہو رہی تھی کیونکہ بدکردار عورتوں کا بھی کوئی کردار تو ہوتا ہی ہے۔ کسی ایک مرد کے ساتھ وفادار رہنے کی بات کو نہ تسلیم کرنے والی عورت اپنا فرض بھانا جانتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ کسی کو بتائے بغیر پر شورام کا لکھا ہوا مسودہ حاصل کر کے اس کی کتاب بھی چھپوا لی تھی اور کسی مدد کے بغیر اس نے تن تنہا یوراج چندر بھوشن جیسے طاقتور درندے سے انتقام لینے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا اور روزانہ صبح و شام وہ باقاعدگی سے ہنستہی ناتھ کے مندر میں جانے لگی تھی۔ ایک بار اسے مندر جاتے دیکھ کر رگھوپتی نے اس سے پوچھا تھا۔ ”روزانہ مندر جا کر تم بھگوان سے اپنے لیے کیا مانگتی ہو شوہا؟“

تب رگھوپتی کے اس مذاق کا جواب شوہا نے بڑی سنجیدگی سے دیتے ہوئے کہا تھا۔ ”اب میری زندگی میں رکھا ہی کیا ہے جس کے لیے بھگوان سے کچھ مانگوں؟ اپنے ماتھے پر لگے ہوئے کلک کو تو اب میں دھو ہی نہیں سکتی لیکن پھر بھی میں داغ کو مٹانے کی تھوڑی کوشش تو کر سکتی ہوں۔“

ایسی اچھی بات کہنے والی شوہا کے بارے میں اس وقت رگھوپتی جیسی باتیں سوچ رہا تھا، وہ خود اسے بہت ناگوار محسوس ہو رہی تھیں جس کے لیے وہ اپنے آپ کو دل ہی دل میں کوس رہا تھا۔ یکایک کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ بری طرح سے چونک پڑا۔ ”ارے بالکے میاں تم؟ کافی دنوں بعد نظر آئے؟ کب آئے ہو یہاں؟“

”کاسینو کے اندر تو کافی دیر سے موجود ہوں۔“ بالکے میاں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”لیکن تمہاری نظروں میں اب آیا ہوں۔“ اتنا کہہ کر اس نے چٹکی بجا کر سگریٹ کی

نہیں پیدا ہوگا اور اگر تم جولی کی خواہش کے آگے مجبور ہو جانا چاہتے ہو تو برائے مہربانی منگل کی شام کو یوراج کی تاج پوشی کے وقت محل میں مت داخل ہونا۔ مجھے تو اس درندے کو اس وقت تک تڑپا تڑپا کر مارنا ہے جب تک کنواری لڑکیوں کے خون کا ایک ایک قطرہ تک اس کے جسم میں موجود ہے۔“ رگھوپتی کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وجے کو اس کی آنکھوں میں خون اترتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک تو رگھوپتی کی طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ”دوست اس پاپی کی موت ہی ہمارا عہد ہے اور اس کی موت میرے ہی ہاتھوں ہوگی۔“ اتنا کہہ کر وجے چپ ہو گیا لیکن دل ہی دل میں اس نے اپنے آپ سے یہ ضرور کہا تھا۔ پھر چاہے میری موت اس کے ہاتھوں ہی کیوں نہ ہو۔



اتوار کی رات کو رگھوپتی کاسینو میں بظاہر اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں مسلسل داخلی دروازے پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ وہ ہر تھوڑی تھوڑی دیر بعد دروازے کی جانب دیکھتا اور پھر ناامید ہو کر وہ منہ پھیر لیتا۔ آج دوپہر ہی سے شوہا کی کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ اس کا کچھ بھی پتا نہیں چل رہا تھا۔ رگھوپتی نے دوبار اس کے ہوٹل میں فون کر کے اس کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن دونوں ہی بار شوہا کے باپ نے اسے ایک ہی جواب دیا تھا کہ ابھی وہ آئی نہیں ہے۔

رات کو کاسینو آنے سے قبل وہ خود ہوٹل میں گیا تھا لیکن اس وقت بھی شوہا ہوٹل میں واپس نہیں آئی تھی اور تب شوہا کے پتاجی نے اسے بتایا تھا کہ جانے ہوئے وہ صرف اتنا ہی کہہ کر گئی تھی کہ ایک کام انجام دینے جا رہی ہوں۔ اگر مجھے دیر سویر ہو جائے تو فکر مت کرنا۔

رگھوپتی نے محسوس کیا تھا کہ شوہا کے اس طرح جانے کے بعد اس کے پتاجی بھی اندر ہی اندر پریشان ہیں، اس لیے وہ ان کا جی بھلانے کے لیے انہیں اپنے ساتھ کاسینو لے آیا تھا۔ پھر رات نو بجے سے لے کر ساڑھے گیارہ بجے تک اس نے ہوٹل

راکھ جھاڑی پھر آگے بولا۔ ”لگتا ہے آج تمہاری چوکنٹا نگاہیں کسی اور کے انتظار میں بیٹھ رہی ہیں؟“

انیون، چرس اور ہیروئن کے اسمگلر بانگے میاں نے رگھوپتی کی آنکھوں کی چوری پکڑ لی تھی اور رگھوپتی اس کا جواب سوچ رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے پاتا، بانگے میاں خود ہی بول پڑا۔ ”ارے تمہارا ایک دوست مجھ سے الہ آباد کی جیل میں نکل گیا تھا۔ کیا تھا اس کا نام؟“ وہ نام یاد کرنے کی کوشش میں اپنا سر کھجاتے ہوئے کچھ سوچتا رہا۔ پھر چنگی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر جلدی سے بولا۔ ”ہاں یاد آگیا..... وہ نیپال کے سورگباشی مہاراجہ کا باپ اٹھانے والا وجے تھا۔ بیچارہ اپنی گمشدہ بہن کی تلاش میں نکلا تھا۔ پھر کیا ہوا اس کا؟“

یہ سن کر رگھوپتی کو الہ آباد کے حوالات کی وہ کہانی یاد آگئی جو وجے نے اسے سنائی تھی۔ تو یہی وہ بانگے میاں تھا جس سے وجے کی حوالات میں ملاقات ہوئی تھی۔ ”ہاں یا.....“ رگھوپتی نے بڑی ہمدردی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”اس نے اپنے خط میں تمہارا ذکر کیا تھا اور بڑے اچھے لفظوں میں اس نے تمہیں یاد کیا تھا۔“

”وہ چونکہ خود ہی بہت اچھا آدمی تھا“ اس لیے دوسروں کو بھی اچھے لفظوں میں یاد کرتا ہے۔“ کہہ کر بانگے میاں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ ”لیکن اس کا کیا ہوا؟ کیا اس کی بہن اسے مل گئی؟“

”نہیں..... نہیں مل سکی۔“ ایک سردی آہ بھر کر رگھوپتی نے آگے کچھ کہنا چاہا ہی تھا کہ کاسینو کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے پولیس انسپکٹر پر اس کی نظر پڑ گئی اور وہ چونک کر بول پڑا۔ ”ارے یہ تو کشم انسپکٹر ہے۔“ اتنا کہہ کر رگھوپتی نے ایک لمحے کے لیے دروازے کی جانب گردن گھمائی۔ رگھوپتی نے گھوم گھوم کر چاروں طرف دیکھا لیکن بانگے میاں کا کوئی پتا نہیں تھا اور تب ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ کشم پولیس کا انسپکٹر بانگے میاں کی تلاش میں ہی یہاں آیا ہو گا جسے دیکھ کر بانگے میاں رونچہ پکڑ ہو گیا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں بھگوان سے دعا مانگی کہ بیچارہ بھاگ سکے تو اچھا ہے.....

لیکن اس سے پہلے کہ اس کی دعا بھگوان تلخ پہنچتی، بانگے میاں پولیس کے شکنجے میں پھنس گیا۔ ”بچے بانگے میاں تم بہت دنوں سے ہماری نظروں میں تھے اور آج تم ہمارے ہاتھوں میں ہو۔“ کشم انسپکٹر کے الفاظ رگھوپتی کی سماعت سے ٹکرا رہے تھے۔ ”تمہارے کمرے سے سوا دو لاکھ کا مال برآمد ہوا ہے اور ہم نے تمہارے ایک ساتھی کو بھی گرفتار کر لیا ہے۔ چلو آگے.....“

یہ سن کر رگھوپتی کو لگا کہ بانگے میاں اب بالکل ہی ٹوٹ کر بکھر پڑے گا لیکن بانگے میاں نے تو مسکرا کر رگھوپتی کی طرف دیکھا۔ پھر اسے تسلی دیتا ہوا بولا۔ ”اس میں افسوس کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔“ اتنا کہنے کے بعد وہ ذرا دھیمی آواز میں آگے بولا۔ ”آج کل ہمارا باس سیر سپاٹے کے لیے یہاں آیا ہوا ہے۔ میں تو اسے نہیں پہچانتا لیکن وہ تو مجھے پہچانتا ہی ہو گا ناں..... بس دو چار دنوں میں ہی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے میں رہا ہو جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی عادت کے مطابق زوردار چنگی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور ہنستا ہوا انسپکٹر کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ بانگے میاں کے جانے کے بعد رگھوپتی کو خیال آیا کہ شوہا اس کے سامنے ہی کھڑی تھی وہ اچانک شوہا کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا اور چونکتے ہوئے بولا۔ ”ارے شوہا.....؟ میں تو بے حد فکرمند ہو رہا تھا کہ.....“

”اچھا.....“ شوہا نے ہنستے ہوئے درمیان میں ہی کہہ دیا۔ ”اچھا ہوا۔ آج مجھے پتا تو چلا کہ میری فکر کرنے والا بھی کوئی ہے تو سہی۔“

”لیکن مجھ سے زیادہ تمہارے پتا جی تمہاری فکر میں تھے۔“ رگھوپتی نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”اب یہ بتاؤ تم گئی کہاں تھیں؟“

”خبر لینے۔“

”کس کی؟“

”ابھی جس شخص کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے، اس کے باس کی۔“ شوہا نے جواب دیا۔

”کیا؟“ رگھوپتی چونک پڑا۔ ”کون ہے اس کا باس؟“

”اس کا باس وہی ہے جو ہمارا دشمن ہے۔“ شوہا نے کہا۔

شوبھا کے انتظار میں کھڑا رہا بار بار اپنی گردن سے جھولتے ہوئے ہشتمی ناتھ کے لاکٹ پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر شوبھا نے اس درندے کو ختم کرنے کے لیے کون سی ترکیب سوچی ہوگی؟

”کسی آدمی کو مارنے کے تو بہت سے طریقے ہوتے ہیں۔“ شوبھا نے ایک بار رگھوپتی اور وجے کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ ”سامنے اگر کوئی مرد ہو تو اس کو مارنے کے لیے ہتھیار اٹھانا پڑتا ہے لیکن ہمیں جس بزدل شیطان کو مارنا ہے، اس کے لیے تو کانڈ کا ٹائم بم ہی کافی ثابت ہوگا۔“

”تم کوئی بھی ترکیب آزما لو شوبھا۔“ تب وجے نے اس کے جواب میں کہا تھا۔ ”لیکن یہ بات ضرور یاد رکھنا کہ چوبیس گھنٹے بعد ہمیں بہت ہی طاقتور دشمن کو ختم کرنا ہے اور تم ایسا کوئی کام نہ کر بیٹھنا کہ ہمیں اس کام کو انجام دینے میں کوئی تاخیر ہو جائے۔“

”یہ سب میں نے سوچ لیا ہے۔“ شوبھا نے اپنی عادت کے مطابق اپنے پراسرار لہجے میں اتنا ہی کہا تھا۔ ”کل صبح تک تو صرف اس کی موت کی خبر سنی جائے گی مگر پرسوں سارے بھارت کے لوگ اس کی زندگی پر تھوکیں گے۔“ اتنا کہہ کر وہ اس وقت ان دونوں کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔

اچانک اسپتال کی عمارت سے چار پانچ نرسوں کو نکلتے دیکھ کر رگھوپتی لیپ پوسٹ کی روشنی سے ذرا دور ہٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دوسری سات آٹھ نرسیں اس کے قریب سے گزر گئیں۔ اس وقت اس کی گھڑی میں سات بج کر پانچ منٹ ہو چکے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ ان نرسوں کی آمد و رفت کے درمیان شوبھا نہ آجائے لیکن ٹھیک اسی وقت اسپتال کے مین گیٹ کے سامنے ایک ٹیکسی آکر رکی۔ ٹیکسی اسپتال کے کپاؤنڈ میں داخل ہونے کی بجائے چونکہ مین گیٹ پر رک گئی تھی، اس لیے رگھوپتی کو تھوڑا اور اندھیرے میں سرک جانا پڑا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی آنے جانے والے کی نظر اس پر پڑے۔ ٹیکسی سے ایک نرس نے اتر کر ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا۔ پھر ٹیکسی کے روانہ ہوتے ہی وہ نرس رگھوپتی کی جانب بڑھی اور پیچھے سے آواز دیتی ہوئی بولی۔ ”اے مسٹر ہمیں اسپتال کے اندر جانا ہے، باہر نہیں۔“

رگھوپتی کو اس وقت شوبھا بڑی پراسرار لگ رہی تھی۔ اس کا جواب سن کر وہ کچھ دیر تک اسے گھورتا ہی رہا۔ جب وہ کوئی اور سوال نہ کر پایا تو شوبھا نے ہی کہا۔ ”آئندہ کل شام کے وقت جس کو اس دنیا سے رخصت ہونا ہے، اسے آج اچانک دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔“

”ہارٹ اٹیک؟“ رگھوپتی حیرت سے بولا۔ ”اور تم اس کی خیریت پوچھنے گئی تھیں؟“

”خیریت پوچھنے نہیں بلکہ خبر معلوم کرنے گئی تھی۔“ کہہ کر شوبھا نے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ”ہمارے انتظار میں وہ ابھی اور چوبیس گھنٹے کھینچ لے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی موت مر جائے، ہمیں اسے مار ڈالنا چاہیے۔“

یہ سن کر رگھوپتی سناٹے میں رہ گیا۔ آج تک جو عورت مردوں کو کھلونے جیسی لگتی تھی، وہی عورت اس وقت اسے مردوں کی موت جیسی خوفناک نظر آرہی تھی۔



دو منزلہ اسپتال کی عمارت کے مین گیٹ کے لیپ پوسٹ کے نیچے کھڑے ہوئے رگھوپتی نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا تو شام کے سات بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔ شوبھا نے اس سے کہا تھا کہ وہ سات بج کر پانچ منٹ تک وہاں پہنچے گی لیکن رگھوپتی تو پندرہ منٹ پہلے ہی وہاں آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے کندھے سے چڑے کا ایک سفری بیگ جھول رہا تھا جس میں ایک کیمرو اور فلش گن کے علاوہ کوئی اور وزنی چیز نہیں تھی لیکن اس کے باوجود بھی رگھوپتی کو یہ بیگ اس وقت بڑا وزنی محسوس ہو رہا تھا۔ کوئی اسلحہ وغیرہ ساتھ لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات شوبھا نے اسے سمجھا دی تھی مگر پھر بھی اپنے جیکٹ کے اندر اس نے اپنا پستول رکھ ہی لیا تھا۔ شوبھا کی عادت تھی کہ وہ ہر کام کو آخری وقت تک خفیہ رکھتی تھی اور شوبھا کی اسی عجیب سی خاصیت نے رگھوپتی کو اس وقت بھی ابھمن میں ڈال رکھا تھا لیکن اس کے باوجود شوبھا کے اٹل اور مضبوط ارادوں کا دل ہی دل میں قائل ہوتا جا رہا تھا۔

”اوہ..... سمجھ گیا۔“ پرشاد اس طرح ہنس پڑا جیسے اسے بہت خوشی ہوئی ہو۔  
 ”اس کا مطلب ہے آج کل محبت کا جوا کھیل رہے ہو تم۔“  
 یہ سن کر رگھوپتی نے شرما جانے کی اداکاری کی اور گردن جھکا کر دھیرے سے  
 بولا۔ ”اب میں جاؤں؟ وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔“ اس کے ساتھ ہی وہ پرشاد کے  
 جواب کی پروا کیے بغیر جلدی جلدی زینے چڑھتا چلا گیا۔

اوپر آکر اس نے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر نیچے کپاؤنڈ میں جھانکا تو پرشاد  
 اپنی کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ رہا تھا۔ پھر جب پرشاد کی کار مین گیٹ سے باہر نکل  
 گئی تو اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور گلے میں پڑے ہوئے ہشپتی ناتھ کے  
 لاکٹ کو اپنے ماتھے سے لگا کر آگے بڑھ گیا۔

سات نمبر کا کمرہ بالکل آخر میں تھا اور اس کے دروازے پر ایک تختی لٹک رہی  
 تھی جس پر لکھا تھا۔ ”مہمانوں کا داخلہ ممنوع ہے۔“

رگھوپتی نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کے شیشے پر تین بار دستک دی تو اندر سے فوراً  
 ہی جواب مل گیا۔ ”لیس کم ان۔“

رگھوپتی نے دھیرے سے دھکا دے کر دروازہ کھولا تو سامنے ہی شوہا کھڑی تھی۔  
 اس نے رگھوپتی کو دیکھتے ہی کہا۔ ”اپنے چہرے پر نقاب ڈال لو۔ مریض ابھی گہری نیند  
 میں ہے۔“

رگھوپتی نے جھٹ اپنے کندھے سے لٹکتے ہوئے بیگ میں ہاتھ ڈال کر اپنا سیاہ  
 نقاب نکالا اور اسے چہرے پر چڑھا لیا اور اس وقت تک شوہا اسے اپنی اوٹ میں  
 چھپائے کھڑی رہی، پھر آگے بڑھ کر اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

”کون آیا ہے نرس؟“ شوہا کی پشت سے جب مریض کی آواز نکرائی تو رگھوپتی  
 نے جلدی سے اپنا کیمرو سنبھال لیا لیکن اس پر فلش گن فٹ کرتے وقت اسے اپنا منہ  
 دوسری طرف کر لیتا پڑا تھا۔

”سر کوئی فوٹو گرافر آپ کی تصویر لینے آیا ہے۔“ شوہا نے ترچھا چہرہ رکھ کر  
 جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”کہتا ہے کہ دہلی کے اخبار ”دی ڈیلی نیوز“ کی طرف سے آیا  
 ہے۔“

نرس کے لباس میں شوہا کو تو نہ پہچان سکا تھا لیکن اس کی آواز کو وہ فوراً ہی  
 پہچان گیا۔ ”ارے شوہا؟ بھلا مجھے کیا معلوم تھا کہ تم نرس.....“ وہ اتنا ہی کہہ کر  
 رک گیا۔

”میں رات والی نرس کی جگہ آئی ہوں۔“ کہہ کر شوہا نے آگے قدم بڑھایا اور  
 بولی۔ ”رات کی ڈیوٹی والی نرس کو میں نے دوسرے کام پر بھیج دیا ہے۔ اس وقت وہ  
 ہمارے پیار دشمن کے سیکرٹری کا دل کسی ہوٹل میں بہلا رہی ہوگی۔“

”تمہارا دماغ کافی تیز ہے۔“ رگھوپتی دھیرے سے بڑبڑایا اور آہستہ آہستہ اس کے  
 ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا لیکن اوپر جانے کے زینوں تک پہنچ کر وہ اچانک رک گئی  
 اور پھر دھیمی آواز میں بولی۔ ”میں آگے جا رہی ہوں، تم ٹھیک پانچ منٹ بعد فرسٹ  
 فلور کے کمرہ نمبر 7 میں آکر دروازے پر دستک دینا اور اس وقت تک لوگوں پر یہی  
 ظاہر ہونے دینا کہ تم کسی مریض کو دیکھنے کے لیے آئے ہو۔“

یہ کہہ کر شوہا کسی سنجیدہ نرس کی طرح زینے چڑھتی ہوئی اس کی نظروں سے  
 اوجھل ہو گئی اور رگھوپتی اپنی جگہ پر کھڑا یہ سوچتا رہا کہ اگر اس لڑکی کو اس درندے  
 نے برباد نہ کیا ہوتا تو آج کہاں سے کہاں پہنچی ہوئی ہوتی اور اپنی عقل اور ہوشیاری  
 کی وجہ سے کتنا نام کما چکی ہوتی؟

”ارے رگھوپتی تم یہاں کہاں؟“ رگھوپتی کی سماعت سے ایک آواز نکرائی تو اس  
 کے پورے بدن میں ایک سنسنات سی دوڑ گئی۔ پھر اس نے گردن گھما کر پکارنے  
 والے کو قریب سے دیکھا تو اس کے دل کی دھڑکن جیسے بند ہو کر رہ گئی۔

”کون پرشاد جی؟“ بڑی مشکل سے وہ تھوک نگل کر بولا۔  
 ”ارے تم تو اس طرح گھبرا گئے جیسے کوئی غلط کام کرتے ہوئے پکڑے گئے ہو۔“

پرشاد کا یہ طنزیہ لہجہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا لیکن دوسرے ہی لمحے  
 اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور مسکراتے ہوئے خود اعتمادی سے بولا۔ ”کوئی غلط  
 کام تو نہیں ہے پرشاد جی۔ البتہ ذرا خفیہ سا کام تھا۔“ اتنا کہہ کر اس نے اپنی ایک  
 آنکھ دبائی اور پھر دھیمی آواز میں آگے بولا۔ ”آج کل ایک نرس سے ذرا

یہ سن کر مریض کے چہرے پر بے چینی اور جھنجھلاہٹ کے تاثرات ابھر آئے اور وہ تھر تھراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”دہلی سے میری تصویر لینے آیا ہے؟“ بولتے بولتے اس کی آواز یکایک اس طرح تیز ہوتی گئی جیسے اسے بولتے وقت کافی تکلیف محسوس ہو رہی ہو۔ ”کس نے اسے اندر آنے کی اجازت دی؟ کہاں مرگیا میرا سیکرٹری؟“ یہ کہہ کر اس نے پلنگ پر اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی اور پھر سرہانے پر لگے ہوئے بیل کے بٹن کو دبانے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

لیکن ٹھیک اسی وقت شوبھا اس کی جانب لپکی اور اسے روکتے ہوئے بولی۔ ”ارے سر یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ ڈاکٹر نے آپ کو بستر پر لیٹے رہنے کے لیے کہا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے مریض کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی کلائی پکڑ لی۔ ”تم اس فونوگرافر کو کمرے سے باہر نکال دو نرس۔“ ہانپتے ہانپتے مریض نے کہا۔ ”اپنے ہارٹ اٹیک کی بات کو میں خفیہ رکھنا چاہتا ہوں اور میرے مخالف لوگ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر میری تصویر اخبار میں شائع کرا کے میری خرابی صحت کا ڈھنڈورہ پیٹ کر مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ بولتے بولتے اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ پھر یکایک اس نے شوبھا کے ہاتھ کی گرفت سے اپنی کلائی چھڑانے کے لیے زور لگایا لیکن تب ہی شوبھا نے دانت پیس کر اس کا ہاتھ مروڑ دیا اور دانت پر دانت جما کر غصے میں بولی۔ ”پپ چاپ بستر پر پڑے رہو بے محکمہ وزیر..... کیونکہ اگر تمہارے ناک سے آکسیجن کی نکل نکل گئی تو تمہارے دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی۔“

زبردستی مڑے ہوئے ہاتھ کی تکلیف اور غصے میں بولے گئے الفاظ کی سختی نے مریض کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ چند لمحوں تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے شوبھا کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر یکایک اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں ناچنے لگیں۔ ”کون؟ کون..... شوبھا؟“ کسی گہرے کنویں سے آئی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا۔ ”تم..... تم نرس بن کر.....؟“

”جی ہاں، مجھے آپ کی خدمت کرنے کے لیے ہی یہ بھیجیں بدلنا پڑا ہے۔“ شوبھا نے دانت پیستے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اور اس فونوگرافر کو بھی میں ہی لے کر آئی

ہوں۔“

یہ سننا تھا کہ مریض کی گردن ایک جھٹکے سے اس طرف مڑ گئی، جدھر رگھوپتی کیمرو ہاتھ میں لیے تیار کھڑا تھا۔ ”مگر کیوں شوبھا؟ یہ سب کس لیے؟“ اچانک وہ ڈری ڈری سی آواز میں بولا۔ ”میری تصویر کھینچ کر تم کیا کرنا چاہتی ہو؟“

”آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔ غریبوں کے داتا، ہمدرد، دیوتا اور راہنما صاحب۔“

شوبھا ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہتی جا رہی تھی۔ ”اخباروں میں تصویر شائع ہو، بھلا یہ بات کسی وزیر کو پسند نہیں ہوگی؟“

شوبھا بول رہی تھی کہ اچانک اسی وقت مریض نے زور لگا کر ایک جھٹکا دیا اور شوبھا کو دور دھکیل کر گھنٹی بجانے کے لیے سوئچ کی جانب جھپٹا لیکن اس کا ہاتھ تو سوئچ سے صرف چند انچ ہی دور رہ گیا کیونکہ ٹھیک اسی وقت اس کی ناک میں سے آکسیجن کی نکل نکل چکی تھی اور شوبھا نے اسے دھکا مار کر بستر پر چت لیٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”تم نے مجھے اور مجھ جیسی بے شمار مجبور لڑکیوں کو تڑپایا ہے۔“ کہہ کر شوبھا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے سینے کو دبا دیا اور انتہائی غضبناک لہجے میں آگے بولی۔

”تم نے اپنے راز کو راز رکھنے کے لیے بیچارے پر شورام کو ٹرک کے نیچے کپکپا کر ہلاک کر دیا اور معصوم روکھی کی گردن میں پھندا ڈال کر اسے پھانسی دے دی۔ کیا تمہیں اس وقت خیال نہیں آیا تھا کہ درندوں کا شکار کرنے والا کوئی تو شکاری ہوگا؟“

اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھی اور میز پر رکھے ہوئے اپنے پرس کو کھول کر اس نے ”ٹائم بم“ نامی کتاب نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے رکھ دی اور چیخ کر بولی۔ ”لو پڑھو..... اپنے گناہوں کی رام کہانی۔“

مریض کی حیرت زدہ نگاہیں کتاب کے سرورق پر گھوم رہی تھیں۔ اس کے اپنے چہرے کے بنے ہوئے اسکیج کے نیچے لکھی ہوئی تحریر پر اس کی نگاہیں جم گئیں۔ ”قوم کے ایک شیطان صفت راہنما کی جیون کہانی۔“ اس مختصر سی تحریر کو پڑھتے ہی وہ اس طرح کانپ گیا جیسے ایک ساتھ ہزاروں بچھوؤں نے اسے اکٹھے ڈنک مار دیا ہو۔ یکایک اس نے گردن اٹھا کر رحم طلب نظروں سے شوبھا کی طرف دیکھا اور اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک تو شوبھا نے اس کی کمر تک دھکی

مردن ایک جھٹکے سے ایک جانب ڈھلک گئی۔

رگھوپتی نے جلدی سے اپنا نقاب اتار لیا اور شوبھا کی جانب ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”ایسی موت میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔“  
پاک شوبھا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شوبھا کے یہ آنسو پچھتاوے کے آنسو نہیں ہو سکتے۔ یہ تو برسوں سے دل میں دبا ہوا درد تھا جو اب آنسو بن کر آنکھوں میں آگیا تھا۔ شوبھا کے یہ آنسو بزدلی کے نہیں بلکہ بہادری کے آنسو تھے۔

ایک شوبھا نے اپنے بستے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا اور پھر اپنا ہاتھ بڑھا کر اس شیطان کے مردہ جسم کے پیٹ پر سے ٹائم بم کی کتاب اٹھالی اور اسے اپنے پرس کے اندر رکھتے ہوئے بولی۔ ”اب ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ کہہ کر وہ اس طرح اس مردے کے کپڑے اور بستر کو ٹھیک ٹھاک کرنے لگی جیسے کوئی خاص بات ہی نہ ہوئی ہو۔ چند ہی لمحوں میں اس نے سب ٹھیک کر لیا اور لاش پر چادر ڈال دینے کے بعد رگھوپتی سے بولی۔ ”اب تم نیچے جاؤ“ میں آ رہی ہوں۔“

رگھوپتی دروازے کی جانب مڑ گیا تو شوبھا جلدی جلدی لاش کی ناک میں آکسیجن کی ٹنگی لگانے لگی۔

تھوڑی دیر بعد شوبھا سات نمبر کمرے کے دروازے سے اس طرح تن کر باہر نکلی جیسے کوئی بڑا سرجن کوئی کامیاب آپریشن کر کے آپریشن تھیٹر سے باہر آ رہا ہو۔ کمرے سے نکل کر وہ زینے کی طرف بڑھی اور تیزی سے نیچے اترتی چلی گئی۔ اس وقت اس کی گھڑی میں سات بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے یعنی صرف بیس منٹ میں ہی اس نے ایک بہت بھیانک مگر کامیاب آپریشن کر ڈالا تھا۔ نیچے رگھوپتی اس کا منتظر تھا۔ دونوں ایک ساتھ چلتے ہوئے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔



شوبھا نے اپنی زندگی برباد کرنے والے اپنے دشمن کو اپنے ہاتھوں سے موت کی نیند سلا کر اپنا بدلہ لے لیا تھا۔ رگھوپتی شوبھا کو اس کے ہوٹل چھوڑ کر اپنے گھر کی

ہوئی سفید چادر کو کھینچ کر دور پھینک دیا تھا اور چیخ کر بولی۔ ”میں ساری دنیا کو دکھانا چاہتی ہوں کہ اس کتاب میں لکھا ہوا ایک ایک واقعہ بالکل سچا ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھی اور اس کی کمر سے لپٹی ہوئی اس کی دھوتی کو بھی کھینچ کر اس کے جسم سے الگ پھینک دیا۔

شوبھا کا جنون اور اس شیطان مریض کی بے بسی کو دیکھ کر کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے رگھوپتی کے ہاتھ بھی اس کے کمرے پر کانپنے لگے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پچاس باون سال کا یہ بزرگ چرے والا آدمی اندر سے اتنا بڑا شیطان بھی ہو سکتا ہے؟ چند لمحوں کے لیے تو اسے یقین ہی نہیں آیا لیکن دھوتی کے بغیر اس کی کھلی ہوئی رانوں کو دیکھ کر اسے یقین آگیا کہ یہی وہ پاپی ہے جس نے اس کی روکھی کو بے موت مار دیا ہے۔

ایکایک اس نے اس ننگے شیطان کی تصویر لینے کے لیے اپنے کمرے کا بٹن دبا دیا۔  
فلش گن کی لائٹ نے اس شیطان کو اس طرح کپکپا دیا کہ جیسے کسی نے بندوق کی گولی اسے ماری ہو۔

”سن لو شیطان۔“ ٹائم بم نامی کتاب کو اس کے کھلے ہوئے پیٹ پر رکھ کر شوبھا چلائی۔ ”کل تک یہ کتاب بھارت کے پارلیمنٹ کے ایک ایک ممبر کے ہاتھ میں پہنچ چکی ہوگی۔ اس کے علاوہ میں نے ملک بھر کے تمام اخباروں کو بھی اس کی کاپیاں بھیج دی ہیں۔ یہ تمہارے گناہ کی سزا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ رگھوپتی کی جانب مڑی اور کہا۔ ”کھینچ لو اس کی اور بھی تصویریں۔ اس کی جیون کمائی کے ساتھ اس کی یہ تصویریں بھی ملک کے تمام اخباروں میں نمایاں طور پر شائع ہوں گی تاکہ بھارت کے ایک ایک آدمی کو یہ معلوم ہو جائے کہ جسے وہ دیوتا کی طرح پوجتے چلے آ رہے ہیں، اس لیڈر کا اصل روپ کتنا کمزور ہے۔“

رگھوپتی بغیر رکے کمرے کا بٹن دبا تا گیا اور فلش گن سے نکلنے والی روشنی کا ہر جھماکا اس شیطان پر بجلی گراتا گیا۔ اس کے پسینے سے بستر بھیگ چکا تھا اور آنسوؤں سے چہرہ ترتر ہو رہا تھا۔ اس کے منہ سے سفید سفید جھاگ نکل رہا تھا اور شوبھا اس کی اس حالت پر قہقہے لگا رہی تھی اور پھر تین منٹ تک تڑپتے رہنے کے بعد اس کی

طرف روانہ ہو گیا۔

تھی۔

نئے راجا یوراج چندر بھوشن کی تاج پوشی کے موقع پر دنیا بھر سے مہمانوں کی نیپال آمد ”اخباروں میں اس قسم کی سرخیاں پڑھنے کے لیے جو پچھلے کئی دنوں سے بے چین تھے۔ وہی لوگ آج ایسی سرخی پڑھ کر کسی خوفزدہ چوہے کی طرح ڈرے ہوئے اور سسے ہوئے بیٹھے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بدیلی مہمانوں کی نیپال آمد کی سرخی کے برابر میں ہی ایک اور خبر چھپی ہوئی تھی اور وہ خبر یہ تھی۔

”نیپال ایئر لائن کے جہاز کو اغوا کر کے بینک کی رقم لوٹنے والے گروہ کا سرغنہ گرفتار۔“ تاج پوشی والی خبر کی بقیہ تفصیل کچھ یوں تھی کہ سترہ اپریل کی صبح کو تاج پوشی کی جو رسم ادا ہونے والی ہے، اس میں شریک ہونے کے لیے اب تک دنیا بھر کے پچھتر ملکوں کے وفد نیپال پہنچ چکے ہیں۔ جن میں پڑوسی ملک چین اور بھارت کے وزیر خارجہ امریکہ اور برطانیہ کے دہلی کے سفارتکار، سری لنکا کے صدر، براؤنڈو نیشیا اور ملائیشیا کے خاص نمائندے۔ یورپ اور افریقہ کے تقریباً بارہ ریاستوں کے وفد اور وزراء اس کے علاوہ نزدیک اور دور کے ملکوں کے بے شمار کاروباری لوگ نیپال پہنچ چکے ہیں۔ توقع ہے کہ منگل اور بدھ کے دو دنوں کے درمیان جو اور مہمان آئیں گے،

ان کی فرست بہت طویل ہے جن میں بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کے صدر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نیپال کے لیے تاج پوشی کے یہ چار دن بے حد خوشی کے دن ثابت ہوں گے۔ شاہی اور سرکاری مہمانوں کی تفریح کے لیے بہت سارے پروگرام ترتیب دیے گئے ہیں جو مسلسل تین روز تک جاری رہیں گے جن میں نیپال کے لوک گیت اور لوک رقص کے علاوہ نئے راجا سری یوراج چندر بھوشن کی تاج پوشی کی فلم بھی براہ راست ملک بھر میں دکھانے کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ ملک کے کونے کونے کے لوگ راج محل میں ہونے والی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال خود دیکھ سکیں جس کے لیے تقریباً ایک سو پرو جیکٹر کو شہر میں جگہ جگہ نصب کیا گیا ہے۔ نیپال کی تاریخ میں پہلی بار کسی شاہی تقریب کو اس طرح نشر کیا جا رہا ہے۔

اس تفصیلی خبر کے برابر میں اگر گوپی ناتھ کی گرفتاری کی خبر شائع نہ ہوئی ہوتی تو اس وقت یہ گم سم سے ہو جانے والے لوگ اپنے ہاتھ میں آزادی کی مشعل لیے

”شوہنے اپنے دشمن کو ختم کر دیا۔“ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنے انتظار میں بیٹھے ہوئے وجے کو یہ خوشخبری سنائی لیکن وجے کے سنجیدہ چہرے پر اس خوشخبری کا کوئی اثر نہیں ہوا تو وہ وجے کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ ”کیا بات ہے وجے؟“ وہ ذرا آگے جھک کر دھیرے سے بولا۔

”ابھی تھوڑی دیر قبل ہی ٹیلی فون پر یہ خبر ملی ہے کہ.....“ بولتے بولتے اس طرح اچانک رک گیا جیسے آگے کی بات بتانے میں اسے سخت تکلیف محسوس ہو رہی ہو مگر پھر وہ اپنا گلا صاف کر کے بولا۔ ”گوپی ناتھ گرفتار ہو گیا ہے۔“

”کیا؟“ رگھوپتی ایک جھٹکے سے صوفے پر گر پڑا۔ اسے کرا گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ انہوں نے آزادی کے لیے جو منصوبہ بنایا تھا، وہ گوپی ناتھ کی گرفتاری کے ساتھ ہی چکناچور ہو گیا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ خود وجے بھی کمرے کی چھت کو گھورے جا رہا تھا۔



موسم بہت ہی خوشگوار تھا اور صبح بھی بے حد حسین تھی لیکن اس کے باوجود بھی ان سب کے چہروں پر اداسی کے گہرے سائے منڈلا رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سوچتے سوچتے تھک گئے ہوں۔ ان کے دماغ میں امنڈے ہوئے خیالات جیسے ایک جگہ جم کر رہ گئے ہوں اور دل کے سارے جذبات دل کے اندر ہی کہیں دفن ہو گئے ہوں۔ کمرے میں پانچ لوگوں کی موجودگی کے باوجود وہاں موت کا سا ساٹا طاری تھا۔ وہ اس طرح گم سم بیٹھے تھے جیسے ان کی زبانوں میں اتنی طاقت ہی نہ ہو کہ وہ کوئی آواز نکال کر اس گہری خاموشی کا پردہ چاک کر سکیں۔

”میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ کافی دیر بعد اپنی تمام طاقت اکٹھی کر کے شوہنے بھٹکل کما اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن پھر بھی باقی کے چار لوگوں میں سے کوئی اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں تھا۔ ان سب کی نگاہیں سنٹرل ٹیبل پر پڑے ہوئے اخبار پر جمی ہوئی تھیں۔ اخبار ”راشٹر سماچار“ کے پہلے صفحے پر ایک سرخی چمک رہی



ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ گوبی ناتھ کی گرفتاری کا ان پانچوں کو سخت صدمہ تھا۔ یہ صدمہ بھی وہ برداشت کر سکتے تھے لیکن اس خبر نے تو ان سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا کہ گوبی ناتھ نے سلطانی گواہ بن کر پولیس کو اپنے تمام ساتھیوں کے نام بتا دینے پر اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا ہے۔ خبریں یہ صاف لکھا ہوا تھا کہ غیر ملکی اسلحہ کے ساتھ گرفتار کیا جانے والا نیپال ایئر لائن کا جہاز اغوا کرنے والا گوبی ناتھ ہے جس نے اپنی گرفتاری کے بعد راجا شاہی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کا اعتراف کیا ہے اور اپنے پیچھا توڑے کا اظہار کیا ہے۔ اس نے پولیس کو یہ بھی بتایا ہے کہ اس سازش میں اسے ملکی اور کئی غیر ملکی لوگوں کا تعاون حاصل رہا ہے۔ یہ ساری باتیں اس نے تحریری طور پر لکھ کر دی ہیں۔ اس طرح راجا شاہی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں شریک اس کے تمام ساتھیوں کی جلد گرفتاری متوقع ہے کیونکہ پولیس کے پاس ان کے نام اور ان کے خلاف ثبوت موجود ہیں۔ صرف چند گھنٹوں میں ہی پولیس نے ان سب کی گرفتاری کا عندیہ دے دیا ہے۔

چائے کی ٹرے کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہونے والی شوہا کے قدموں کی آہٹ اگرچہ بڑی دھیمی تھی لیکن اس کے باوجود وہ چاروں ایک جھٹکے سے گردن اٹھا کر اس طرح چونک پڑے جیسے سچ پوچھ پولیس ان کو گرفتار کرنے کے لیے آگئی ہے۔ پچھلی شام کو وجے نے جب گوبی ناتھ کی گرفتاری کی خبر رگھوپتی کو سنائی تھی تو اس وقت وہ سچ سچ ہی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد ان دونوں نے اپنے ہوش و حواس کو یکجا کر کے اس مسئلے پر کافی غور کیا تھا۔ ٹوٹی ہوئی مالا کے بکھرے ہوئے دانوں کو جمع کر کے جس طرح پھر ایک دھاگے میں پرویا جاتا ہے، بالکل اسی طرح ان دونوں نے بھی اپنی ٹوٹی ہوئی ہمت کو اکٹھا کر لیا تھا۔

ان کا خیال تھا کہ گوبی ناتھ کی گرفتاری کی خبر اگر دو چار ساتھیوں کے علاوہ چوبیس گھنٹوں تک اور کسی کو معلوم نہ ہو تو ان کے منصوبے میں کیس سے بھی کوئی رکاوٹ نہیں پڑ سکتی تھی۔ ممکن ہے جشن تاج پوشی کے موقع پر خود سرکار ہی اس خبر کو دبا کر رکھے کیونکہ غیر ملکی مہمانوں کی اتنی بڑی تعداد یہاں موجود ہے اور ان سب کی موجودگی میں جہاز کے اغوا اور ہجڑوں کی گرفتاری کی خبر کی وجہ سے شاہی جشن کی

خبریں ماند پڑ سکتی تھیں اور یہ کوئی اچھا شگون نہیں ہوگا۔

جس طرح ڈوبتا ہوا آدمی تنکے کے سہارے کو بھی ہمت غنیمت سمجھ لیتا ہے۔ بالکل اسی طرح وہ دونوں بھی الٹے سیدھے اندازے لگا کر خود کو تسلی دینے کی کوشش کرتے رہتے تھے لیکن صبح کے سوا چھ بجے جب رانا نے انہیں ”راشٹر سماچار“ میں شائع ہونے والی گوبی ناتھ کی گرفتاری کی خبر سنائی تو وجے اور رگھوپتی نے اس طرح اپنی اپنی گردنیں جھکا دیں جیسے وہ اپنی بازی ہار چکے ہوں۔

شیرا اور رانا اخبار لے کر صبح ہی صبح رگھوپتی کے گھر پہنچ گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد شوہا بھی ہانپتی کانپتی اپنے ہوٹل سے یہاں آگئی تھی۔

اور اب وہ پانچوں ایک دوسرے کو بڑی حسرت بھری نظروں سے بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ ان سب کی آنکھوں میں ایک ہی سوال چل رہا تھا، اب کیا ہوگا؟ ہمارا کیا ہوگا؟ ”سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا واقعی گوبی ناتھ اتنی جلدی اقرار جرم کے لیے تیار ہو سکتا ہے؟“ آخر کار رگھوپتی کو ہی پسل کرنا پڑی تھی۔

”شاید پولیس نے اس پر کافی سختی کی ہو۔“ رانا نے گوبی ناتھ کا بچاؤ کرتے ہوئے آگے کہا۔ ”ورنہ گوبی ایک لفظ بھی بتانے والا آدمی نہیں ہے۔“ لیکن سختی کرنے اور اذیت دینے جتنا وقت ہی کہاں گزرا ہے؟“ وجے نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”ہماری اطلاع کے مطابق گوبی ناتھ کل دوپہر کے وقت گرفتار ہوا تھا اور شام کو ہی اسے کھنڈو لایا گیا اور اگر اخبار والوں کو رات کے بارہ بجے بھی خبر ملی ہوگی تو بھی پانچ چھ گھنٹوں کا ہی وقت پولیس کو ملا ہے اور اتنی سی دیر میں گوبی ناتھ اقرار کرنے کے لیے تیار ہو سکتا ہے؟“

وجے کی یہ دلیل سن کر وہ سب لوگ تھوڑی دیر تک چپ بیٹھے رہے مگر پھر شوہا نے اس خاموشی کو توڑا۔ وہ رگھوپتی کی طرف دیکھ کر کہہ رہی تھی۔ ”رگھوپتی کیا وہ دوسری اہم خبر اخبار میں چھپی ہے؟“

یہ سن کر رگھوپتی چونک پڑا تھا۔ اس نے جلدی سے اخبار اٹھایا اور پھر اس کے چاروں صفحات کو غور سے دیکھنے لگا لیکن اسے وزیر بے محکمہ کی موت کی خبر کیس بھی دکھائی نہیں دی تو وہ سوچنے لگا کہ کیس وہ شیطان زندہ تو نہیں رہ گیا تھا؟

لیکن شوبھا نے ہی اس کے شک کو دور کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”اس کینے شیطان کی موت کی خبر کو خفیہ رکھا گیا ہے اور اس کی لاش کو آج صبح چھ بجے ایک چارٹرڈ طیارے کے ذریعہ دہلی بھیج دیا گیا ہے۔ مجھے یہ خبر یہاں آنے سے تھوڑی دیر پہلے ملی تھی۔“ شہرا اور رانا کو شوبھا کی بات سمجھ نہیں آئی، اس لیے وہ حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے جبکہ رگھوپتی اور وجے کو شوبھا کی یہ بات پسند نہیں آئی کہ اس نے خواستواہ ہی اس بات کو درمیان میں چھیڑ دیا تھا لیکن شوبھا کے پاس کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور رہی تھی اور اسی لیے وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”ایک اہم خبر کو دبا کر رکھا جائے اور دوسری خبر جس کو دبانا زیادہ ضروری ہو“ اس کو فوراً ہی پولیس میں بھیج دیا جائے..... اس کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ضرور ہی ہوگا۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔“ رگھوپتی جذباتی لہجے میں بولا۔ ”اگر واقعی پولیس کو ہمارے بارے میں کچھ معلوم ہو گیا ہو تو وہ بذریعہ اخبار اس کا اعلان کیوں کرے گی؟ اس خبر سے تو گوبلی ناتھ کے ساتھیوں کو ہوشیار ہونے کا موقع مل جاتا ہے اور ایسا کرنا تو سراسر بے وقوفی ہے۔“

”ممکن ہے پولیس نے اخبار والوں کو یہ سب باتیں نہ بتائی ہوں لیکن اخبار والوں نے خود ہی خبر کو اور زیادہ سنسنی خیز بنانے کے لیے یہ سب چھاپ دیا ہو؟“ شہرا نے پہلی بار کچھ نہ کچھ بولنے کی کوشش میں کہا لیکن وجے نے اس کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا۔ ”راجا شاہی دور میں کوئی اخبار اتنی ہمت کہاں کر سکتا ہے؟ ہمارے یہاں کی سرکار کی مہربانی تو یہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا اخبار حکومت کی مرضی کے بغیر کچھ چھاپ بھی نہیں سکتا۔“

یہ بحث جاری رہی لیکن وہ پانچوں گھوم پھر کر اسی ایک بات پر آکر اٹک جاتے تھے کہ اب ہمیں کرنا کیا چاہیے؟ دوپہر تک تو پورے نیپال میں گوبلی ناتھ کی گرفتاری کی خبر پھیل جائے گی اور شام کو فلم شو کی تیاری میں بیٹھے ہوئے تمام ساتھی پولیس کی نظروں سے بچنے کے لیے اپنا کام چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ اپنے اپنے ہتھیار چھپا کر وہ ادھر ادھر بکھر جائیں گے یا پھر سرحد پار کر جائیں گے۔

”کچھ بھی ہو لیکن اب ہمیں پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔“ چائے کا گھونٹ حلق سے اتار کر رگھوپتی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”پیچھے ہٹنے کے لیے بھی اب ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔“ وجے نے مستحکم لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں بے ہشمتی ناتھ کا نعرہ لگا کر اپنا کام کرنا ہی ہوگا۔“ ”ہمارے پاس ابھی پورے بارہ گھنٹے ہیں۔“ رانا نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”ہمیں یہ سب ہشمتی ناتھ پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وقت کی دوڑ میں ہم اول آتے ہیں یا پولیس۔“

”تب پھر اپنی ہر خاص خاص جگہوں پر جئے ہشمتی ناتھ کا پیغام روانہ کر دو۔“ وجے نے شہرا اور رانا کو مخاطب کر کے کہا۔ ”آزادی کی جنگ لڑنے والے مجاہدوں کے لیے موت کوئی حثیت نہیں رکھتی۔ بعد میں جیل کے اندر ایڑیاں رگڑنے سے تو بہتر یہی ہے کہ حق کی راہ پر لڑتے ہوئے اپنی جان دے دیں۔“ یہ سن کر رگھوپتی نے مسکرا کر شوبھا کی طرف دیکھا اور پھر ہنستے ہوئے کہا۔ ”شوبھا یہ تم نے آخر چائے میں ایسی کیا چیز ملا دی ہے جسے پی کر ایک ساتھ ہی سب کو جوش آگیا ہے؟“

لیکن اس سے پہلے کہ شوبھا کوئی جواب دیتی، دروازے پر لگی ہوئی کال بیل زور سے بج اٹھی۔ بیل کی آواز سنتے ہی وہ پانچوں چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ سب کی آنکھوں میں ایک ہی سوال تھا۔ ”کون ہو سکتا ہے؟“ رگھوپتی اٹھنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ تب ہی دروازہ کسی نے زور زور سے تھپتھپایا اور تب ان پانچوں کو یقین ہو گیا کہ پولیس آچکی ہے۔

اس خیال کے آتے ہی سوائے شوبھا کے ان چاروں کے ہاتھ اپنے اپنے پستولوں کو ٹٹولنے لگے۔ رگھوپتی نے ان تینوں کو گھر کے اندر محفوظ جگہ پر چھپ جانے کا اشارہ کیا اور شوبھا کو اندر چلے جانے کا کہہ کر خود اپنا پستول والا ہاتھ اپنی پیٹھ کے پیچھے رکھ کر دروازے کی جانب لپکا۔ ابھی وہ دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ کسی نے بڑی بے صبری سے پھر بیل کے بجن پر انگلی رکھ دی تھی۔ اچانک رگھوپتی نے داہنے ہاتھ سے دروازے کی کنڈی کھول دی اور بڑی تیزی سے داہنی جانب سرک کر کھڑا ہو گیا تاکہ اندر داخل ہونے والے پر پیچھے سے قابو پایا جاسکے۔ دوسرے ہی لمحے ایک زوردار

ان کے لیے چائے لاتی ہوں۔“

چند لمحوں تک بانکے میاں صوفے پر بیٹھا گھرے گھرے سانس لیتا رہا۔ اتنے میں شوہا چائے کی پیالی لے کر آگئی۔ بانکے میاں نے گرم گرم چائے کا گھونٹ حلق سے اتارا تو وہ سب اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ رانا کو بانکے میاں کا اس طرح اچانک آجانا بڑا پراسرار لگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیسے اسے پولیس نے ہی تو مخبری کے لیے نہیں بھیجا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ گھر کے باہر پولیس کھڑی ہو؟

”کیا پیغام لائے ہو..... اب بتاؤ نا جلدی سے۔“ رگھوپتی نے بے صبری سے کہا تو بانکے میاں نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی اور اپنا ایک ہاتھ اپنی جیب میں ڈال کر کچھ ٹٹولنے لگا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے بند مٹھی باہر نکالی اور پھر یکایک اپنی بند مٹھی کو ان سب کے سامنے کھول دیا۔

بانکے میاں کی ہتھیلی پر چمکتی ہوئی ایک انگوٹھی پر سب کی نگاہیں جم گئیں۔ رگھوپتی نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے انگوٹھی لے لی اور اس کے نگ والا ڈھکن کھول کر دیکھا تو اس کے اندر وہ زہرلا کیپول موجود نہیں تھا۔

اندر سے اس قاتل کیپول کو غائب پا کر ان پانچوں کے سینے چھوٹ گئے اور وہ سب ہی اپنی اپنی جگہ یہ سوچ رہے تھے کہ گوپی ناتھ نے یہ کیا کر ڈالا؟

”آپ سب لوگ اس طرح گھبرا کیوں گئے ہیں؟“ بانکے میاں ان سب کے چروں کو گھورتا ہوا بولا۔ ”گوپی ناتھ نے مجھے یہ انگوٹھی دینے سے پہلے اس کا ڈھکن کھول کر اس کے اندر سے کوئی چیز نکال کر اپنی مٹھی میں چھپا لیا تھا۔“

”لیکن اس نے کیا پیغام دیا ہے؟“ وجے نے رک رک کر پوچھا۔

”ارے پیغام دینے کا موقع ہی کہاں ملا تھا؟“ بانکے میاں نے کسی گنگناہ کی طرح سر جھکا کر کہا۔ ”میں چھوٹ کر آرہا تھا تو گوپی ناتھ مجھے سامنے مل گیا۔ اس نے اپنی لال لال آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ پولیس حوالدار اس وقت کسی سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ گوپی ناتھ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جھٹ اپنی انگوٹھی اتاری اور اس کا ڈھکن کھول کر کوئی چیز نکالی۔ پھر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ ”تم چھوٹ کر جا رہے ہو.....“ پھر یکایک وہ انتہائی دھیمی آواز میں آگے بولا۔

دھکے کے ساتھ دروازے کے دونوں پٹ دھڑام سے کھل گئے جس کی وجہ سے باہر سے اندر آنے والا اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑاتا ہوا رگھوپتی کے پاؤں کے پاس ہی لڑھک گیا۔ کوئی اس کا چہرہ دیکھ نہیں سکا تھا کیونکہ وہ منہ کے بل زمین پر گرا تھا۔ رگھوپتی اس موقع کا فائدہ اٹھا کر اس کی پیٹھ پر وار کرنے ہی جا رہا تھا کہ ٹھیک اسی وقت اس اجنبی نے اپنی گردن اونچی کی اور گھوم کر دیکھا تو رگھوپتی کا اٹھا ہوا ہاتھ جہاں تک اٹھا تھا وہیں رک گیا۔

”ارے بانکے میاں؟“ رگھوپتی نے اطمینان کا سانس لیا اور جلدی سے جھک کر بانکے میاں کے بازو تھام کر اسے کھڑا کر دیا۔ اتنی دیر میں تو وجے، شوہا، رانا اور شپرا بھی ان کے قریب آگئے تھے۔

”لگتا ہے تم لوگ کسی اور کا انتظار کر رہے تھے۔“ بانکے میاں اپنے کپڑے جھاڑنے کے بعد باری باری ان کے چروں پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”اندر تم لوگ اتنے سارے آدمی بیٹھے تھے، پھر دروازہ کھولنے میں اتنی دیر کیوں ہوئی؟“ ”یہ پوچھنے والے تم کون ہو؟“ کہہ کر رانا نے غصے میں اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن رگھوپتی نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا اور رانا سے کہا۔ ”یہ ہمارا دشمن نہیں، دوست ہے۔“

یکایک وجے کی یادداشت تازہ ہو گئی اور وہ آگے آکر غور سے بانکے میاں کو دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ ”ارے یہ تو الہ آباد تھا نے کا حوالا لاتی..... بانکے.....“

اتوار کی رات کاسینو میں جسے افیون، چرس اور ہیروئن کی سہلگنگ کے الزام میں پولیس پکڑ کر لے گئی تھی..... یہ وہی ہے نا؟“ شوہا نے اپنی یادداشت پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”پولیس نے اسے بہت جلد چھوڑ دیا؟“

”میں چھوٹ کر سیدھا میاں دوڑا آیا ہوں۔“ کہہ کر بانکے میاں نے ان پانچوں کی جانب سے اپنا منہ پھیر کر دروازہ بند کر دیا اور پھر گھوم کر آگے بولا۔ ”میں تم لوگوں کے لیے گوپی ناتھ کا ایک پیغام لایا ہوں۔“

یہ سنتے ہی وہ پانچوں اس کے اور قریب آگئے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے کے پاس لے جانے لگے۔ وجے نے اسے ایک صوفے پر بٹھا دیا تو شوہا نے کہا۔ ”میں

تھا؟“

”نہیں..... کچھ بھی.....“ کتے کتے بانگے میاں اس طرح اچانک رک گیا جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو۔ پھر یکایک ہی اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائے لگی اور وہ اچھل کر بولا۔ ”ارے ہاں..... یاد آگیا۔ جاتے جاتے اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا..... جئے ہشتہی ناتھ۔“

اور اس کے اس ایک جملے نے ان پانچوں کے چروں پر سے الجھنوں کے بادل دور کر دیئے اور اب ایک بار پھر بانگے میاں ان کی نظروں میں دیوتا سان بن گیا تھا۔ ”شباباش بانگے میاں۔“ رگھوپتی خوشی سے اس کی پیٹھ سلاتے ہوئے بولا۔ ”اب ہمیں گوپنی ناتھ کا پورا پیغام مل گیا ہے۔ ہم تمہارے احسان مند ہیں بانگے میاں۔ بولو اس کام کے بدلے میں تمہیں کیا چاہیے؟“

”میں نے کسی بدلے کی لالچ میں یہ کام نہیں کیا ہے۔“ بانگے میاں نے اس طرح منہ بنا کر کہا جیسے یہ بات اسے بہت بری لگی ہو۔ ”مجھے تو بس اتنا ہی کہنا ہے کہ اگر تم لوگ کوئی اچھا کام کر رہے ہو تو مجھے بھی اس میں شامل کر لو۔ تم لوگوں نے میری یہ بات منظور کر لی تو سمجھ لو کہ مجھے اپنے کام کا بدلہ مل گیا۔“

بانگے میاں کی اس پیشکش نے سب کو چونکا دیا تھا لیکن رانا تو بدحواس سا ہو کر بول اٹھا تھا۔ ”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم ہم میں سے نہیں ہو، اس لیے ایسا نہیں ہو سکتا.....“

رانا کے یہ جذباتی تیور دیکھ کر وجے کو سخت غصہ آیا اور وہ رانا کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”تم خاموشی سے بیٹھو رانا۔ اس کا فیصلہ مجھے کرنا ہے۔“ جس کی آواز سے ہمیشہ مٹھاس ٹپکتی تھی، آج اسی وجے کے اس غضبناک لہجے نے رانا کے جسم میں کپکپاہٹ سی طاری کر دی تھی۔ وہ نظریں جھکائے چپ بیٹھ گیا اور وجے بڑے ہی دردناک لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”بانگے میاں منشیات کا دھندہ ضرور کرتا ہوگا، شاید یہ اسمگلر بھی ہو لیکن یہ لوگوں کے دلوں کا چور نہیں ہے۔ اپنی جس بہن کے ہاتھ پیلے کرنے کے لیے اس نے گناہ کا یہ راستہ اختیار کیا تھا، وہی بہن آج بھائی کا منہ دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اسی لیے شاید ہم لوگوں کے ساتھ شامل ہو کر یہ اپنی بہن کو منہ دکھانے کے

”یہ انگوٹھی کاسینو والے رگھوپتی کو دے دینا..... بس اتنی دیر میں حوالدار اسے لے کر آگے بڑھ گیا۔“ بانگے میاں کی بات سن کر رگھوپتی نے وجے کی طرف دیکھا۔ رانا شہرا کو گھور رہا تھا اور شوبھا بانگے میاں کو تاک رہی تھی۔ ہر ایک کے دل میں الجھل سی مچی ہوئی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انگوٹھی بھیج کر گوپنی ناتھ کیا کرنا چاہتا تھا؟

”لیکن گوپنی ناتھ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ تم کاسینو والے رگھوپتی کو جانتے ہو؟“ رانا نے مشکوک نظروں سے بانگے میاں کو گھورتے ہوئے پوچھا تو ہر کوئی سوالیہ نظروں سے بانگے میاں کو دیکھنے لگا۔ جیسے انہیں خود بھی یہی سوال پوچھنا تھا۔ ”یہ بات تو پہلے میری بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔“ بولتے بولتے بانگے میاں کچھ سوچنے کے لیے رک گیا تو رانا اور شہرا کو یوں لگا جیسے وہ کوئی فرضی کہانی گھڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ”یوں تو گوپنی ناتھ کو حالات میں ہماری کوٹھری میں بند نہیں کیا گیا تھا۔ ہمارے برابر والی ایک چھوٹی سی کوٹھری میں اسے تنہا رکھا گیا تھا لیکن رات کے وقت میں چونکہ چلا چلا کر سب سے کہتا تھا کہ سالے پولیس والوں نے مجھے جوا بھی نہیں کھیلے دیا۔ مجھے یہ لوگ کاسینو میں سے پکڑ کر لے آئے ہیں، شاید گوپنی ناتھ کو میری یہ بات یاد رہ گئی ہو اور اسی سے اس نے اندازہ لگا لیا ہو کہ شاید میں کاسینو والے رگھوپتی سے بھی واقف ہوں۔“ بانگے میاں نے جب یہ تفصیل بتائی تو ان پانچوں کے چروں سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے انہیں بانگے میاں کے جواب سے تسلی نہ ہوئی ہو۔ بانگے میاں کے جواب نے ایک بار پھر انہیں شک میں مبتلا کر دیا تھا لیکن پھر بھی رگھوپتی اور وجے جلد بازی میں کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے وہ تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھے سوچتے رہے۔ ”سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم گوپنی ناتھ کی اس حرکت کا کیا مطلب نکالیں؟“

رگھوپتی نے ذرا دھیمے لہجے میں کہا اور بانگے میاں کی طرف دیکھنے لگا۔ ”بانگے میاں اگر تم سے اس نے کوئی بات کہی ہو تو تمہاری یہ محنت رائیگاں نہ جاتی۔“ وجے نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ”تم ذرا یاد کرو بانگے میاں، کیا گوپنی ناتھ نے اپنی مدد کے لیے ہمیں یہ انگوٹھی بھیجی ہوگی؟ کیا واقعی اس نے کچھ بھی نہیں کہا

قابل بننا چاہتا ہے اور تم ہو کہ اسے ایک بار پھر گناہوں کے دلدل میں دھکیل دینا چاہتے ہو؟ بولو جواب دو رانا؟“

لیکن رانا سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ کمرے میں تھوڑی دیر تک ایک گہرا سناٹا طاری رہا، پھر تھوڑی دیر بعد وجے نے رگھوپتی کے ہاتھ سے گولی ہاتھ کی انگوٹھی لے لی اور اسے بانگے میاں کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔ ”لو بانگے میاں..... ہم تو ہمشہتی ہاتھ کا نام لے کر اسے اپنی انگلی میں پہنتے ہیں لیکن تم اپنے خدا کا نام لے کر یہ انگوٹھی پہن لو اور ہم میں شامل ہو جاؤ۔ یقین کرو، ہم ایک نیک مقصد لے کر میدان میں اترے ہیں اور حیت نیکی کی ہی ہوتی ہے۔“

”انشاء اللہ.....“ بانگے میاں کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرانے لگی۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ اس پر اتنا بھروسہ بھی کر سکتے ہیں۔ چند لمحوں بعد جب اس نے انگوٹھی اپنی انگلی میں ڈالی تو اس وقت آپ ہی آپ اس کی پلکیں آنسوؤں سے بھاری گئیں لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک پرسکون سی مسکراہٹ تھی۔



دیوتاؤں کی سرزمین نیپال پر اترنے والی اماوس کی کالی اندھیری رات کو روشن کرنے کے لیے رنگ برنگ روشنیاں اپنی بھرپور کوشش میں مصروف تھیں۔ اونچے اونچے پہاڑوں کی گود میں بسا ہوا شہر کھنڈو جس کی سڑکوں پر روشنیوں، آتش بازیوں اور رنگینیوں کا ایک سیلاب سا امنڈا ہوا تھا۔ ہر طرف چمک چمک نظر آرہی تھی۔ ہر چہرہ مسرت و شادمانی سے دمک رہا تھا لیکن آس پاس کے اونچے اونچے پہاڑ ان روشنیوں اور رنگینیوں سے بے پروا ہو کر عبادت میں ڈوبے ہوئے کسی سادھو کی طرح چپ چاپ اور گم سم اپنی جگہ سٹھے ہوئے کھڑے تھے۔

اپنے ہر راجا کو دیوتا کی طرح پوجنے والی نیپال کی بھولی بھالی رعایا اب یوراج چندر بھوشن کو اپنے نئے راجا کے روپ میں دیکھنے کے لیے بے تاب نظر آرہی تھی۔ اسی لیے جشن تاج پوشی کو دیکھنے کے لیے لوگ شہر کی سڑکوں پر امنڈے چلے آ رہے تھے۔ سرشام ہی جہاں سناٹا چھا جایا کرتا تھا، اس ترائی اور پہاڑیوں کے اوپر رہنے

والے لوگ بھی اپنے اپنے گھروں سے اس طرح باہر نکل آئے تھے جیسے ابھی ابھی صبح کا سورج طلوع ہوا ہو۔ سب کے دلوں میں ایک ہی بات کی خوشی تھی کہ آج وہ رسم تاج پوشی کی قلم دیکھنے والے ہیں۔ آج سے انیس سال قبل جب مہاراجہ سری پنچ اندر بھوشن تخت نشین ہوئے تھے تو اس وقت وہ تخت نشینی کی تقریب نہیں دیکھ سکے تھے لیکن آج وہ اس سب سے بڑی رسم کے ایک ایک منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے بے قرار ہو رہے تھے۔

”جئے ہمشہتی ہاتھ۔“ سادھو کے لباس میں اپنی اصل شخصیت کو چھپا کر راج محل کی جانب روانہ ہونے سے قبل وجے نے رگھوپتی سے ہاتھ ملایا اور پھر انتہائی جذباتی لہجے میں بولا۔ ”میرے دوست ہو سکتا ہے کہ اب اس دنیا میں ہماری دوبارہ ملاقات نہ ہو لیکن دوسری دنیا میں ملنے کا وعدہ کر کے میں تم سے رخصت ہو رہا ہوں۔“ یہ سن کر رگھوپتی نے وجے کے پنجے کو اپنے ہاتھ میں دبا لیا اور دھیرے سے بولا۔ ”لیکن مجھے یقین ہے وجے کہ ہم دوبارہ ملنے کے لیے ہی جدا ہو رہے ہیں۔“

ٹھیک اسی وقت راج محل کے اونچے ٹاور پر لگی ہوئی بڑی سی گھڑی نے آٹھ بجنے کی اطلاع دی تو ان کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی دوڑ گئی اور پھر وجے ایک سادھو کی طرح جھومتا جھامتا راج محل کی جانب بڑھ گیا۔ ان دونوں دوستوں کو ایک دوسرے سے جدا ہوتے دیکھ کر کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی شوبھا کی پلکیں بھی بھیک گئیں۔ ابھی صرف پانچ گھنٹے قبل ہی ان دونوں دوستوں میں ہونے والی تو تو میں میں کی وہ چشم دید گواہ تھی۔ اصل میں رگھوپتی وجے کو راج محل میں جانے دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ وجے کو زندگی اور موت کے اس خطرناک کھیل سے دور رکھنا چاہتا تھا لیکن وجے کو اس نے اس کی دوسری ہی وجہ بتاتے ہوئے کہا تھا۔ ”تم دوسروں کا دکھ درد بانٹنے والے ایک رحم دل انسان ہو، اس لیے عین ممکن ہے کہ انتقام کی بالکل آخری گھڑی پر تمہارے اندر رحم کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ سادھو کے بھیس میں چھپی ہوئی تمہاری اصلیت اگر کسی پر ظاہر ہو گئی تو ہماری کنارے پر آئی ہوئی آزادی کی کشتی بھی ڈوب جائے گی۔“

لیکن وجے اس کی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے رگھوپتی کو مخاطب

کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”اگر فتح ہماری ہوئی تو اس کا سہرا ہم سب کے سر پر جانا چاہیے لیکن اگر ہماری شکست ہوئی تو اس کی ذمہ داری صرف اور صرف مجھ پر ہی عائد ہوگی۔ سابق مہاراجہ کا پاپ میں نے اپنے سر لیا تھا اور ہونے والے مہاراجہ کے گناہوں کو بھی میں ہی بے نقاب کروں گا۔“

دھیرے دھیرے آگے بڑھتی ہوئی شوبھانے نزدیک آکر رگھوپتی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا لیکن اس کی نظریں راج محل کے دروازے تک پہنچ جانے والے وجے پر ہی جبی ہوئی تھیں۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“ شوبھانے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی کوشش میں کہا لیکن رگھوپتی تو وجے کو محل کے اندر داخل ہوتا دیکھ رہا تھا۔

”میں اس شخص کو دیکھ رہا ہوں شوبھا۔“ رگھوپتی کھوئی کھوئی سی آواز میں بولا۔ ”کہ جس نے کسی لالچ کے بغیر اس دھرتی کو سچے دل سے پیار کیا ہے۔ جس نے اس دھرتی کو دیوی دیوتاؤں کی طرح پوجا ہے۔ جس نے اس ویش کی تاریخ کو اپنی روح کی گہرائیوں میں سمیٹ رکھا ہے۔ اس شخص نے کبھی کچھ پانے کی تمنا نہیں کی ہے۔ آج اس شخص کی جے جے کا سننے کے لیے میرے کان ترس رہے ہیں شوبھا۔“

بولتے بولتے رگھوپتی نے دیکھا تو وجے راج محل کے بڑے سے پھانک کے اندر جا کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

وجے جب راج محل کے درباری میدان میں بنے ہوئے بہت بڑے اسٹیج کے قریب پہنچا تو اس کے گیروے لباس پر بے شمار آنکھیں جم کر رہ گئیں۔ وہ سب اسے دیکھ کر یہی سوچ رہے تھے کہ شاید بھارت کا کوئی سادھو مہاتما اس تقریب کو دیکھنے کے لیے آیا تھا۔ اپنی گردن میں جھولتی ہوئی مالا پر انگلیاں پھیرتے ہوئے وجے نے چاروں طرف اپنی نظریں دوڑائیں تو اسے سب کچھ ویسا ہی نظر آیا جیسا اس نے آنے سے پہلے اپنے دل میں سوچ رکھا تھا۔ تیز روشنیوں سے جھللاتے ہوئے وسیع و عریض اسٹیج کے پتھروں پر سورگباشی مہاراج سری پنچ اندر بھوشن کا مجسمہ کھڑا تھا۔ جس کے دونوں جانب مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے شاندار صوفے رکھے ہوئے تھے۔ سامنے کی پانچ قطاروں میں تقریباً تیس صوفہ سیٹ غیر ملکی مہمانوں کے لیے مخصوص تھے۔ جن کے درمیان میں شاہی تخت سے مشابہت رکھنے والی ایک بڑی سی شاندار کرسی رکھی

ہوئی تھی۔ جس پر ہونے والا مہاراجہ پوراج چندر بھوشن آکر بیٹھنے والا تھا۔ اس کرسی کے پیچھے دو اور کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک پوراج چندر بھوشن کے چھوٹے بھائی دبھوشن اور دوسری کرسی پوراج کے چچا سورج بھوشن کے لیے مخصوص تھیں۔ ان دونوں کرسیوں کے پیچھے ایک مائیکروفون نصب تھا اور اس کے ٹھیک سامنے اسٹیج کے دوسرے سرے پر فلم کا ایک سفید پردہ دکھائی دے رہا تھا۔

شاہی خاندان کی عورتوں کے لئے جو حصہ مخصوص تھا، وہاں نگاہیں ڈال کر وجے کی آنکھوں نے جولی کو ڈھونڈ نکالا جو پوراج چندر بھوشن کی بیوی مینا دیوی اور پوراج کی چچی مینال دیوی کے پیچھے آشا کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جولی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وجے گھڑی بھر کے لیے اپنے آس پاس کے ماحول سے بے خبر ہو گیا۔

”مہاراج چلے آپ کو آپ کی سیٹ تک پہنچا دوں۔“ اچانک کسی کی آواز سن کر وجے چونک پڑا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو ایک خدمت گار سر جھکائے کھڑا تھا۔ وجے نے اپنے گیروے رنگ کے لباس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دعوت نامہ اس خدمت گار کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”آپ میرے پیچھے پیچھے تشریف لے آئیے مہاراج۔“ کارڈ پر لکھے ہوئے نمبر کو پڑھ کر خدمت گار نے بڑے ادب سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ زیادہ تر لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر آکر بیٹھ چکے تھے۔ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کی نظریں سادھو کے لباس میں ملبوس وجے کی جانب ہی اٹھی ہوئی تھیں۔ وجے جانتا تھا کہ خود کو چھپانے کے لیے وہ اپنا جو بھی بدل رہا ہے۔ وہ سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا کے اس کے لیے خطرے کا باعث ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی اس نے سادھوؤں جیسا لباس ہی منتخب کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جو شخص آسانی سے لوگوں کی نظروں میں آجائے، اس پر شاید ہی کسی کو کوئی شک پیدا ہو سکتا ہے۔

خدمت گار کی بتائی ہوئی جگہ پر بیٹھ جانے کے بعد وجے کی سماعت سے ایک سوال نکلا۔ اس کے پیچھے بیٹھا ہوا کوئی شخص شاید اپنے برابر والے سے پوچھ رہا تھا۔ ”یہ مہاتما جی کون ہیں؟“

”جے گرو دیو۔“ وجے دل ہی دل میں بولا۔ ان سنسنی خیز گھڑیوں میں بھی یہ سوال

دیکھا تو وہ آدمی اسے یوراج چندر بھوشن کی تخت نما کرسی کے پیچھے لگے ہوئے مائیک کے تاروں کو ٹھیک کرتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی سرخ ٹکینے والی انگوٹھی تھی۔ کھنڈو میں جن پانچ علاقوں میں تاج پوشی کی فلم دکھائی جانے والی تھی، ان پانچوں جگہوں پر لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکروں کا کنکشن اس مائیکروفون سے تھا یعنی جو کوئی بھی اس مائیک پر بولے گا تو اس کی آواز کھنڈو کے دور دراز علاقوں میں بھی سنائی دے گی۔

یکایک فوجی بینڈ بج اٹھا۔ شاہی خاندان کے افراد اور غیر ملکی معزز مہمان اپنی اپنی جگہوں پر آکر بیٹھ چکے تھے۔ وجے نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا تو آٹھ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ یوراج چندر بھوشن کو صرف ایک منٹ کی ہی تاخیر ہوئی تھی۔ وہ فوجی افسران اور پولیس کے مخصوص دستے کی سلامی لیتا ہوا آہستہ آہستہ اسٹیج کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کی قیمتی شاہی پوشاک جگمگاتی ہوئی روشنیوں میں اور بھی جھللا رہا تھی۔ اس کی داہنی جانب اس کا چچا سورج بھوشن چل رہا تھا اور بائیں جانب چھوٹا بھائی و بھوشن تھا۔

مہمانوں کی پہلی قطار میں کھڑے ہوئے تمام معزز مہمانوں سے ہاتھ ملاتا ہوا یوراج چندر بھوشن اپنی کرسی کی جانب بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ کبھی کسی ملک کے سفارت کار، کبھی کسی ملک کے وزیر خارجہ تو کبھی کسی ملک کے وزیراعظم سے مصافحہ کرنے کے بعد وہ دو تین رسمی جملوں کا تبادلہ کر کے مسکراتا ہوا آگے بڑھ جاتا تھا۔ یوراج چندر بھوشن کا یہ شاہانہ انداز دیکھ کر وجے دل ہی دل میں غصے سے کھول رہا تھا اور اندر ہی اندر چیخ و تاب کھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”کیئنے جب تیرا اصلی روپ لوگوں کو نظر آئے گا تو ان سب مہمانوں کی آنکھوں میں تجھ سے نفرت کی آگ بھڑکتی دکھائی دے گی۔ اگر تو اس وقت تک زندہ رہ گیا تو اپنا انجام آنکھوں سے دیکھ لے گا۔“

فوجی بینڈ کی دھن بند ہوتے ہی آپس میں سرگوشیاں کرنے والے ایک دم خاموش ہو گئے۔ وجے نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو معزز مہمانوں کے لیے مخصوص پانچ سو دس کرسیوں میں سے صرف دس بارہ کرسیاں ہی خالی تھیں۔ پیریدار اور دوسرے خدمت کار چپ چاپ اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہ گئے تھے۔ مہمانوں کو شرمٹ پیش کرنے والا

سن کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ جلدی اپنی مالا پر اپنی انگلیاں پھیرنے لگا۔

”آپ ٹھنڈا لیں گے مہاراج؟“ ٹرے میں شربت کے گلاس سجائے ایک دوسرے خدمت گار نے ادب سے جھک کر پوچھا تو وجے نے گردن ہلا کر انکار کر دیا۔ وجے کے انکار پر وہ خدمت گار پھر اس کے سامنے جھکا اور بہت ہی دھیمی آواز میں بولا۔

”جئے ہشہتی نا تھ۔“

وجے نے چونک کر نظریں اٹھائیں اور اس خدمت گار کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ وجے کو اس خدمت گار کی آنکھوں میں بھی آزادی کی چمک دکھائی دی۔ پھر اچانک اس کی نظر خدمت گار کے ہاتھ کی انگلی پر پڑ گئی۔ ایک انگلی میں سرخ نگ والی انگوٹھی جگمگ رہی تھی۔

”جئے ہشہتی نا تھ۔“ وجے نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر آشرवाद دینے کے انداز میں کہا تو خدمت گار شربت کی ٹرے کے ساتھ دوسرے مہمانوں کی جانب بڑھ گیا۔ راج محل میں تعینات کیے جانے والے اپنے تمام ساتھیوں کو سرخ ٹکینے والی انگوٹھی دے کر رگھوپتی نے انہیں تاکید کی تھی کہ جب انہیں وجے سادھو مہاراج کے ہمیں میں راج دربار میں نظر آجائے تو موقع پر پہنچ کر اس کی توجہ کسی طرح اپنی انگوٹھی کی جانب مبذول کرا لیتا۔

اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے وجے نے چاروں طرف نظریں دوڑانا شروع کیں۔ بڑے سے داخلی دروازے کے قریب راج دربار کے سپاہیوں کے جھرمٹ میں دو آدمی شاہی شہنائی نواز کے لباس میں ملبوس شہنائیاں بجا کر مہمانوں کا استقبال کرنے کے لیے ایک کونے میں کھڑے تھے۔ وجے نے دور ہی سے ان دونوں کی انگلیوں میں سرخ ٹکینے والی انگوٹھیوں کی چمک دیکھ لی تھی اور تب ہی اسے رگھوپتی کے کہے ہوئے الفاظ یاد آ گئے تھے۔ رگھوپتی نے کہا تھا۔ ”داخلی دروازے کے پاس دو آدمی تعینات ہوں گے جن کے لباسوں میں ایک ایک مشین گن اور دو دو بم ہوں گے۔“

وجے ابھی ان دونوں کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک جئے ہشہتی نا تھ کی آواز نکلتا ہوا ایک شخص اس کے قریب سے گزرنے لگا تو وجے نے چونک کر اس کی طرف

خدمت گار بھی اب اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ایک جگہ خاموش کھڑا ہو گیا تھا۔ وجہ کو یہ بات معلوم تھی کہ ان کا یہ ساتھی بیک وقت دو ہاتھوں میں پستول لے کر بہترین نشانے بازی کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے کوٹ کی دونوں جیبوں میں دو پستول موجود تھے۔

صدر دروازے کے اوپر جھروکے میں بیٹھے ہوئے دونوں شہنائی نواز نے اپنی اپنی شہنائیاں ایک جانب رکھ دی تھیں اور وجہ اس کا مطلب سمجھ گیا تھا کہ اپنی اپنی مشین گن کو ہاتھ میں لینے کے لیے وہ دونوں بالکل ہی تیار بیٹھے تھے اور ان کی نگاہیں دور بیٹھے ہوئے وجہ پر ہی جمی ہوئی تھیں کیونکہ ان سب کو پہلے ہی سے تاکید کر دی گئی تھی کہ جب تک وجہ اپنے گروے رنگ کے رومال کو اپنی جب سے نکال کر ہوا میں نہ لہرائے، اس وقت تک کوئی ہتھیار نہیں چلائے گا اور پھر ٹھیک آٹھ بج کر ستائیس منٹ پر یوراج چندر بھوشن نے اپنے داہنے ہاتھ کی انگلی اٹھائی۔ اس کا یہ اشارہ پا کر یوراج محل کا خاص اناؤنسر اپنی جگہ سے اٹھ کر دھیرے دھیرے یوراج کی جانب بڑھنے لگا۔ یوراج چندر بھوشن نے لکھی ہوئی تقریر کی ایک کاپی اسے دی جسے اپنے ہاتھ میں لے کر اناؤنسر تعظیم میں جھکا اور پھر مائیکروفون کی جانب گیا۔ یوراج چندر بھوشن کی لکھی ہوئی تقریر کو اپنی آواز میں سنانے سے پہلے اناؤنسر نے اپنی داہنی جانب نگاہ ڈالی تو اس وقت اس کے بالکل قریب بیٹھے ہوئے وجہ کی چمکتی ہوئی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں لیکن اناؤنسر وجہ کی حرکت سے بے خبر ہی تھا۔

تقریر کا پہلا ایک منٹ تو غیر ممالک سے آئے ہوئے سرکاری مہمانوں کا شکریہ ادا کرنے میں ہی گزر گیا۔ اس کے بعد اناؤنسر نیپال کے رسم و رواج اور وہاں کی تہذیب و تمدن کی تفصیل بتاتا رہا۔ اس تفصیل کے بعد اس نے رسم تاج پوشی کے بارے میں ہونے والے پروگراموں کی فہرست پڑھ کر سنائی اور اس دوران میں وجہ نے اپنا جھکا ہوا سر ایک مٹھکے سے اٹھایا اور بڑی دیر سے سینے کے اندر روکے ہوئے سانس کو منہ سے باہر نکال کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

اناؤنسر اس کی جانب توجہ دینے بغیر کہہ رہا تھا۔ ”معزز مہمانوں ابھی تھوڑی ہی دیر میں سامنے لگے ہوئے پردے پر سورگباشی ہمارا جہ سری شیخ کی تخت نشینی اور ان کی

موت کے بارے میں بیس منٹ کی ایک فلم پیش کی جائے گی۔ اس کے بعد نیپال کے لوک گیت اور رقص پیش کیے جائیں گے اور پھر یوراج چندر بھوشن جی کی تاج پوشی کی رسم ادا کی جائے گی اور پھر نیپالی کھانوں سے مہمانوں کی خاطر تواضع کے بعد آج کے پروگرام ختم ہو جائیں گے۔“

اناؤنسر ابھی آخری الفاظ بول ہی رہا تھا کہ وجہ اس کے بالکل برابر میں جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ مائیک کے قریب ایک سادھو کی موجودگی کئی لوگوں کے لئے باعث حیرت تھی۔ راج محل کے تمام عہدیداروں اور پروگرام ترتیب دینے والوں کے لیے یہ بات تو اور بھی حیرت ناک تھی کہ انہوں نے اپنے کسی پروگرام میں کسی سادھو کو تو مائیک پر بولنے کے لیے نہیں کہا تھا تو پھر یہ سادھو کہاں سے مائیک پر آگیا؟ لیکن محفل کے آداب کی توہین کے خیال سے کوئی اپنی جگہ سے اٹھ کر مائیک تک جانے کی جسارت نہیں کر پا رہا تھا۔

اناؤنسر نے آخری جملہ ادا کرتے ہوئے گردن گھما کر وجہ کی طرف دیکھا لیکن وجہ نے اسے سوال کرنے کا موقع دینے بغیر مائیک پر اپنا ہاتھ رکھ کر اس کا منہ بند کر دیا اور اپنے دوسرے ہاتھ میں دبا ہوا کانڈ کا پرزہ اناؤنسر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ بوکھلایا ہوا اناؤنسر یہ سمجھا کہ شاید انتظامیہ کی جانب سے کوئی نیا اعلان موصول ہوا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے جلدی سے کانڈ کے اس پرزے پر نظر ڈالی۔ وہ تحریر بے حد مختصر تھی لیکن اسے پڑھتے ہی اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ پرزے پر لکھا تھا۔ ”صدر دروازے کے اوپر جھروکے پر نگاہ ڈالو۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں مشین گنیں ہیں۔ اس لیے اگر تم نے ذرا بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو تمہارے ساتھ بے شمار لوگوں کی جانیں ضائع ہو جائیں گی۔ اس تحریر کو پڑھتے ہی اناؤنسر کی نگاہیں جھروکے سے جھانکتی ہوئی مشین گنوں کی ٹالیوں کی جانب اٹھ گئیں۔ اس کے بعد اس کا پورا وجود تھر تھر کانپنے لگا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر وہ نیچے گر گیا تو مشین گن سے نکلی ہوئی گولیاں اس کے جسم کو چھلنی کر دیں گی، اس لیے وہ ہمت کر کے چپ چاپ وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

”اناؤنسر نے ابھی ابھی جو پروگرام بتائے ہیں، ان کی ترتیب میں تھوڑی سی تبدیلی



پردے پر دکھائی جائے گی۔ اسے کسی دخل اندازی کے بغیر خاموشی سے آپ لوگوں کو دیکھنا ہے۔“ وجے کی آواز میں دھمکی نہیں تھی بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی یوگی مہاراج اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بھگتوں کو حکم دے رہا ہو اور اس حکم کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ ہر کوئی اپنی سانس روکے اس کی بات سننے کی کوشش کرنے لگا۔ وجے ابھی تک مائیک کے سامنے کھڑا ہوا اپنے گھمبیر لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”یہاں کئی ملکوں کے سفیر وزراء اور اعلیٰ عہدیدار مہمان کے طور پر آئے ہوئے ہیں، اس لیے میری سب سے گزارش ہے کہ جو قلم دکھائی جانے والی ہے، اس کو اگر کسی نے درمیان میں رکوانے کی کوشش کی تو وہ کوشش اس کے ساتھ ساتھ یہاں موجود بے شمار معزز مہمانوں کی جان بھی لے سکتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ایسا کوئی واقعہ رونما ہو جس سے ہمارے نیپال کا نام دنیا بھر میں بدنام ہو جائے۔ کھنڈو کے پاور ہاؤس پر ہمارے آدمیوں کا قبضہ ہو چکا ہے، اس لیے وہاں سے بجلی کی فراہمی ہر حالت میں جاری رہے گی۔ اس کے علاوہ ہم نے اس کا بھی پورا پورا انتظام کر رکھا ہے کہ یہاں راج محل کے مین سوئچ بورڈ کے ساتھ بھی کوئی غلط حرکت نہ ہو سکے۔ بس مجھے آپ لوگوں سے اتنا ہی کہنا ہے کہ اس قلم کو آپ لوگوں کے ساتھ ملک بھر کے لوگ دیکھیں گے۔ قلم ختم ہو جائے تو اس کے بعد آپ کو اس کے متعلق اپنا فیصلہ سنانے کا اختیار ہوگا۔ امید ہے آپ اپنا فیصلہ ضرور سنائیں گے۔“

اتنا کہہ کر وجے نے چاروں طرف ایک نظر ڈالی، پھر مائیک پر حکم دیتا ہوا بولا۔  
”یس اشارت۔“

دھیرے دھیرے راج محل کے وسیع و عریض ہال روم کی بتیاں ایک ایک کر کے بجھتی چلی گئیں اور پھر اسٹیج پر گئے ہوئے سفید پردے کے اوپر لگا ہوا سیاہ پردہ آہستہ آہستہ سرکنے لگا اور اس کے ساتھ ہی وہ ہزاروں آنکھیں جو ابھی تک وجے کو گھور رہی تھیں، وہ اس سفید پردے پر مرکوز ہو گئیں۔ ہال میں موجود ہر شخص کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا لیکن اس کے باوجود ان کی آنکھیں پردے پر چلتی پھرتی تصویروں کو دیکھنے کے لیے خاصی بے چین نظر آرہی تھیں۔

ہال میں موجود تمام لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ ان کے دائیں بائیں اور اوپر

کی گئی ہے۔“ اچانک مائیک پر گونجتی ہوئی وجے کی آواز نے سب لوگوں کو چونکا دیا تھا اور وہ سب مائیک کے سامنے کھڑے ہوئے وجے کو دیکھنے لگے۔ سادھوؤں جیسا گیروا لباس، گلے میں لٹکتی ہوئی موٹی موٹی مالاں، آنکھوں پر لگا ہوا سیاہ چشمہ اور سر پر بندھی ہوئی پیلے رنگ کی پگڑی۔ سب کی نگاہیں اس کی ایک ایک چیز پر جمی ہوئی تھیں لیکن ایک اجنبی آواز کو مائیک پر گونجتا سن کر یوراج چندر بھوشن تو اس قدر گھبرا گیا تھا کہ آداب محفل اور اپنے رتبے کا خیال بھول کر پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا تھا۔

”ابھی ابھی آپ لوگوں کو بتایا گیا تھا کہ سامنے لگے ہوئے سفید پردے پر سورگباتی مہاراجہ سری پنچ کی تخت نشینی کی قلم پہلے دکھائی جائے گی اور وہ قلم اس ہال کے علاوہ پورے نیپال کے کونے کونے میں موجود پروجیکٹروں کے ذریعے عوام دیکھ سکیں گے لیکن اس پروگرام میں تھوڑی سی جو تبدیلی ہوئی ہے، وہ یہی ہے کہ مرحوم مہاراجہ کی قلم کی بجائے پہلے ہمارے ہونے والے مہاراجہ سری یوراج چندر بھوشن کی ایک پرائیویٹ قلم دکھائی جائے گی۔“ وجے نے اپنا یہ اعلان مکمل کیا ہی تھا کہ یوراج چندر بھوشن اپنی شاہی کرسی سے اٹھتے ہوئے چلایا۔ ”کون ہے یہ گستاخ؟“

لیکن تب ہی وجے نے اپنے گہرے لبائے کے اندر سے اپنا پستول نکال لیا اور ہاتھ اٹھا کر ہوا میں ایک فائر کر دیا۔ ”خبردار“ فائر کی آواز کے ساتھ ہی وجے کی گردن آواز گونجی۔ ”اس جگہ اس وقت دنیا بھر سے آئے ہوئے تقریباً چھ سو مہمان موجود ہیں مگر یہاں میرے بھی سوا سو ساتھی موجود ہیں جن کے پاس مشین گنیں، پستول اور ہینڈ بم بھی ہیں۔“ اس کی اس بات کا اثر یہ ہوا کہ پورے ہال میں موت کا سناٹا چھا گیا۔ ایک جانب بیٹھے ہوئے فوج کے کمانڈر نے جلدی سے اپنا پستول نکالا اور وجے کے سینے کا نشانہ تاکنے لگا لیکن وہ ٹریگر پر رکھی ہوئی اپنی انگلی کا دباؤ نہ بردھاسکا۔ آس پاس ایسا خوف ناک سناٹا طاری ہو گیا تھا کہ تمام لوگ ایک دوسرے کی سانسوں کی آوازیں بھی صاف سن رہے تھے۔ ہر کوئی اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھا رہ گیا تھا۔

”یہاں بیٹھے ہوئے کسی بھی شخص کو ایک ذرا سی بھی آنچ نہیں آئے گی مگر اس کے لیے آپ سب لوگوں کو میری ایک شرط ماننا ہوگی اور وہ شرط یہ ہے کہ ابھی جو قلم

بھوشن.....

یکایک ہال کی ساری بتیاں اس طرح روشن ہو گئیں جیسے وہ قلم کے پردے پر ساکت ہو جانے والے منظر کو مٹا دینا چاہتی ہوں۔ ہال روم روشن ہوتے ہی ساری نگاہوں کا مرکز یوراج چندر بھوشن ہی تھا۔

اسٹیج کے ایک کونے میں پستول تانے کھڑے ہوئے وجے کی طرح سینکڑوں آنکھیں بھی یوراج چندر بھوشن کی اونچی کرسی کی طرف نفرت بھری نگاہ سے دیکھ رہی تھیں لیکن وجے کے پستول کی طرح ان سب کی نگاہوں کے زہریلے تیروں کو چھوٹنے میں بھی تاخیر ہو گئی تھی کیونکہ اپنی شاہی کرسی پر بیٹھے ہوئے یوراج چندر بھوشن کی گردن ایک جانب کو ڈھلک چکی تھی۔ اس کی داہنی کپٹی پر سے خون بہہ رہا تھا اور کرسی کے ہتھکڑے پر لگتے ہوئے اس کے داہنے ہاتھ کی مٹھی میں اس کا اپنا پستول دبا ہوا تھا۔ اپنے چہرہ کے بے نقاب ہونے کے منظر کو دیکھتے ہی یوراج نے اپنی جیب سے اپنا سائنس لگا ہوا پستول نکال کر اپنی کپٹی پر گولی مار لی تھی۔

قلم کے پردے پر روٹنے کھڑے کر دینے والے مناظر کو دیکھ کر لوگوں کو شدید جھٹکا لگا تھا اور دوسرا جھٹکا یوراج چندر بھوشن کی موت کا جھٹکا تھا۔ ابھی سارے لوگ چندر بھوشن کی لاش کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ اچانک پستول کا ایک دھماکا ہوا اور موت کا سا گہرا سناٹا ٹوٹ گیا۔ ہال میں روشنی ہوتے ہی وجے نے یوراج چندر بھوشن کی لاش کرسی پر ڈھلکی ہوئی دیکھی تھی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اپنی رسم تاج پوشی کے موقع پر بھی یوراج پستول لے کر آیا ہوگا۔ ابھی وہ حیرت سے اس کی لاش کو دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک گولی چلی لیکن اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھ پاتا۔ ایک جانب سے ایک عورت اچھل کر وجے کے سامنے ڈھال بن کر آگئی اور وجے کو لگنے والی گولی کو اس نے اپنے سینے میں اتار لیا اور تب اس کی آخری چیخ نے پورے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو کپکپا کر رکھ دیا۔

پھر اس سے پہلے کہ وجے کے سامنے آکر اس کی جان بچانے والی عورت اپنی چھاتی پکڑ کر نیچے گر جاتی، وجے نے جلدی سے اسے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا لیکن جب اپنی زندگی کی آخری سانس لیتی ہوئی اس عورت کے چہرے پر اس کی نظر پڑی تو

نیچے موت اپنا منہ کھولے کھڑی ہے۔ کسی بھی لمحے اندھیرے کا سینہ چیرتی ہوئی کوئی گولی آکر ان کا کام تمام کر سکتی ہے مگر پھر بھی سینکڑوں لوگ اپنی گردن سیدھی کیے پردے پر آنکھیں جمائے خاموشی سے بیٹھے تھے۔ یکایک پردے پر پرو جیکٹر کی روشنی پڑی اور ایک منظر متحرک ہو گیا لیکن وقت کی رفتار جیسے رک گئی ہو اور آنکھوں کے سامنے ایسے حیرت انگیز مناظر آگئے ہوں جن کو دیکھنے کی توقع ان آنکھوں کو نہ رہی ہو۔ سینکڑوں آنکھیں اس نقاب پوش سیاہ درندے کو دیکھ رہی تھیں جو ایک کم عمر لڑکی کی آموریزی کرنے میں مصروف تھا۔ دوسرے منظر میں وہی نقاب پوش ایک دوسری لڑکی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے سے پہلے اس کی نازک گردن میں اپنے دانت گاڑ کر اس کا خون چوس رہا تھا۔ اس کے سیاہ نقاب میں صرف اس کی آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے جن کی مدد سے وہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے خون میں لمت پت ہونٹ بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ایک کے بعد دوسرا منظر پردے پر آتا گیا۔ کبھی کسی کنواری دیوی کا وہ خون چوس رہا تھا تو کبھی کسی اور دو شیرہ کا۔ ایسے شیطانی منظر دیکھ کر ہر شخص کے روٹنے کھڑے ہو گئے تھے۔ ہر منظر پہلے منظر سے زیادہ بھیانک اور دردناک لگتا تھا لیکن اس کے باوجود ہال میں موجود چھ سات سو لوگوں کی نگاہیں پردے پر جمی ہوئی تھیں۔

لوگوں کو قلم کے منظر میں گم دیکھ کر وجے دھیرے دھیرے اپنی جگہ سے سرک کر اس طرف کھٹکنے لگا جہاں یوراج چندر بھوشن اپنی تخت نما کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت ہر گھڑی زندگی اور موت کے درمیان تنی ہوئی ایک باریک سی لکیر کی طرح لگ رہی تھی۔ وجے کو اطمینان تھا کہ ہر ایک آنکھ اس وقت قلم کے پردے پر جمی ہوئی ہے اور کوئی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا ہے۔ اس لیے وہ آرام آرام سے سرکتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ دو اور انسانی سائے ایسے تھے جو مختلف سمتوں سے اس کی طرف چھپتے چھپاتے بڑھ رہے تھے۔ یکایک قلم کے پردے پر نقاب پوش کے نقاب چیرنے والا آخری منظر آگیا۔ اس کا چہرہ بے نقاب ہوتے ہی وہ آخری منظر پردے پر ایک تصویر کی طرح ساکت ہو کر رہ گیا۔ اس بے نقاب چہرے کو دیکھتے ہی کئی لوگوں کے منہ سے بے اختیار ایک جملہ نکلا۔ ”ارے یہ تو یوراج چندر

لوگ جب سڑکوں پر نکل آئیں گے تو اس راج محل کی ایک اینٹ بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملے گی۔“ وبھوشن تھوڑی دیر تک سر جھکائے کچھ سوچتا رہا۔ یوراج چندر بھوشن کا پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ پستول سمیت آہستہ آہستہ مائیک کی جانب بڑھنے لگا۔ مائیک کے قریب آکر اس نے پہلے تو پورے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لیا۔ پھر اس کی نگاہیں شاہی کرسی پر پڑی ہوئی اپنے بھائی کی لاش پر جم گئیں۔ وبھوشن کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بھائی کی موت کا دکھ برداشت کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ چند لمحوں بعد اس نے گلا کھنکار کر کچھ بولنے کی کوشش کی ہی تھی کہ تب ہی ”یوراج چندر بھوشن..... مردہ باد..... راجا شاہی مردہ باد..... عوامی حکومت زندہ باد“ کے زوردار نعروں نے ہال میں بیٹھے ہوئے تمام معزز مہمانوں کو بری طرح چونکا دیا۔

دور سے آتی ہوئی ہزاروں لوگوں کے جوشیلے نعروں کی یہ آوازیں لمحہ بہ لمحہ محل کے قریب سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ سب کے کان اس جانب لگے ہوئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ لوگوں کا جم غیر چپٹا چلاتا ہوا راج محل کی جانب بڑھا چلا آ رہا تھا۔ ”سن لو وبھوشن۔“ وجے کی آواز ایک بار پھر گونج اٹھی۔ ملک بھر میں اس وقت جگہ جگہ یہی نعرے گونج رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ہی یہ ساری دھرتی اور نیپال کا آسمان بھی ان نعروں سے لرز اٹھے گا۔ وبھوشن اس سے پہلے کہ لاکھوں عوام کا ریلا راج محل میں داخل ہو جائے اور اس سے پہلے کہ تہماری خاموشی سب کچھ تباہ کر دے.....“ سائنلر ایک جھٹکے میں ہٹا دیا اور ٹریگر دبا کر ہوا میں ایک فائر کر دیا۔

”نہیں.....“ پستول کا دھماکہ تھمتے ہی وبھوشن کی آواز مائیک کے ذریعہ چاروں طرف پھیل گئی۔ ”قدرت کی عطا کی ہوئی اس خوبصورت سرزمین کو میں تباہ ہونے نہیں دوں گا۔ جس زمین پر ہشتہائی ناٹھ جیسے دیوتاؤں کا بسیرا ہو وہاں اب کوئی درندہ نہیں رہ سکتا۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ آج کی اس اندھیری رات کے بعد جو سورج طلوع ہوگا وہ نیپال کی آزادی کا سورج ہوگا۔ نیپال کے عوام کی حکومت کا سورج ہوگا۔“

وبھوشن کے اس اعلان کے ختم ہوتے ہی راج محل کے باہر کھڑے ہوئے ہزاروں

اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے منہ سے چیخ تو نکل تھی لیکن اس کی گونج اس کے سینے کے اندر ہی دب کر رہ گئی۔

”آشام؟“ وہ چیخ کر بولا۔ پھر دانت پیستے ہوئے اس نے گولی چلانے والے کی طرف دیکھا تو ایک طرف سے آشاکا شوہر ہری پرشاد ہاتھ میں پستول لیے پاگلوں کی طرح اس کی جانب لپکتا ہوا دکھائی دیا۔ نزدیک آکر وہ وجے پر دوسری گولی چلانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس کے پیچھے سے جولی نے اس پر چھلانگ لگا دی جس کی وجہ سے پرشاد اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اس کا پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا اور خود قلابازی کھا کر فرش سے ٹکرا گیا۔ دوسرے ہی لمحے وجے کے دو ساتھیوں نے آگے بڑھ کر پرشاد کو اپنے قابو میں کر لیا۔

”وبھوشن.....“ اچانک اسٹیج پر سے ہی وجے نے یوراج چندر بھوشن کے چھوٹے بھائی کو آواز دی اور آگے کہا۔ ”اس سے پہلے کہ یہاں اور زیادہ خون خراب ہو، تم مائیک پر جا کر یہ اعلان کر دو کہ یوراج چندر بھوشن کی موت کے بعد جو تخت و تاج تمہیں وراثت میں ملنے والا ہے، اسے تم تیاگ کر رہے ہو۔“ وجے کی گرجدار آواز سن کر ستائیس سالہ راج کمار وبھوشن دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ جب تھوڑی دیر بعد اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی تو ہر کوئی سانس روکے اسے دیکھ رہا تھا۔ وبھوشن اپنی جگہ سے اٹھ کر پہلے تو شاہی کرسی پر ڈھکی ہوئی اپنے بڑے بھائی کی لاش کو دیکھتا رہا۔ پھر جب وہ اس کے دہانے ہاتھ میں دبے ہوئے اس کے پستول کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے ذرا نیچے جھکا تو کئی لوگوں نے یہی سمجھا کہ ابھی ایک اور دھماکا سنائی دے گا اور پھر ایک اور لاش وہاں گر پڑے گی۔ سب سانس روکے وبھوشن کی طرف دیکھ رہے تھے کہ ایک بار پھر وجے کی گرجدار آواز اس خوفناک سنائے کو توڑ گئی۔ ”وبھوشن، آشاکا خون سے لت پت میرے ہاتھ میں دبے ہوئے میرے گھروے رومال کی طرف دیکھو۔ میرا رومال والا یہ ہاتھ اگر اونچا ہو گیا تو پھر بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ اماؤس کی اس گہری اندھیری رات میں ہم دیوتاؤں کی سرزمین نیپال پر سے راجا شاہی حکومت کا خاتمہ کرنے کی قسم کھا کر آئے ہیں اور اب ہمارے مقصد میں ذرا بھی تاخیر ہوئی تو پورے ملک میں فساد پھوٹ پڑیں گے۔ لاکھوں

سورج منگل کی رات کو ہی طلوع ہو گیا ہو۔ بیس منٹ کی قلم دیکھ کر ہی ان کے سارے عقیدے جلی ہوئی راگھ کی طرح اڑ گئے تھے۔ کنواری لڑکیوں پر ہونے والی درندگی کا منظر دیکھ کر فوجی افسروں کے سر اور سپاہیوں کے ہتھیار بھی شرم سے جھک گئے تھے۔ غصے کی آگ میں جلتے ہوئے بے شمار لوگوں کو نعرے لگاتے ہوئے راج محل کی طرف دوڑتا دیکھ کر خود رگھوپتی بھی حیرت زدہ رہ گیا تھا اور تب اس نے شوبھا سے کہا تھا۔ ”شوبھا ہم تو صرف اس کام کے لیے ایک ذریعہ بنے ہوئے تھے لیکن اب اگر ہم چاہیں بھی تو ان پھرے ہوئے لوگوں کو نہیں روک سکتے۔“ ”کسی بھی دیش کی پر جا جب درد کی شدت سے تڑپ کر مرنے مارنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہے تو اسے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔“ بولتے بولتے شوبھا نے جذبات سے بے قابو ہو کر رگھوپتی کا ہاتھ کس کر اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے سمندر کی بے قابو موجیں کناروں کے سارے بند توڑ کر نکل آئی ہوں۔ لوگوں کا سیلاب ہی تو تھا جو راج محل کی جانب بہا چلا آ رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے راج محل کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ”جئے ہشتہتی ناتھ“ کے نعروں سے فضا اس طرح گونج رہی تھی جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔

محل کے اندر سے جب گولی چلنے کی آواز سنائی دی تھی تو رگھوپتی چونک پڑا تھا کہ کس نے گولی چلائی ہوگی؟ یہ گولی کس پر چلائی گئی ہوگی؟ لیکن جب اس نے مائیک پر وجے کی آواز سنی جو راج کمار دھوشن کو مخاطب کر کے اسے تخت و تاج سے دستبردار ہونے کے لیے کہہ رہا تھا تو اسے ذرا تسلی سی محسوس ہوئی تھی ورنہ اس کا خیال تھا کہ کہیں گولی وجے پر نہ چلائی گئی ہو۔

پھر جب دھوشن نے مائیک پر آکر عوامی حکومت کا اعلان کیا تو رگھوپتی اور شوبھا مارے خوشی کے ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں ایک دوسرے سے لپٹ گئے لیکن تب ہی وجے کی بھاری اور انتہائی گھمبیر آواز نے ہزاروں لوگوں کے ساتھ ساتھ شوبھا اور رگھوپتی کو بھی چونکا دیا۔ مائیک کے ذریعے وجے کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ ”نیپال کے لوگوں اور نیپال میں تشریف لانے والے معزز مہمانوں۔ میں وجے کمار آریہ آپ سے مخاطب ہوں۔ وہی وجے کمار جو آج سے پینتالیس روز قبل سورگباشی

لوگوں نے ایک زبان ہو کر اتنے زوردار نعرے لگائے کہ آسمان گونج اٹھا۔ ”ہمارا نیپال امر رہے گا..... دیوتاؤں کی یہ دھرتی امر رہے گی۔“

ان نعروں کے جواب میں جب وجے نے پوری طاقت سے چلا کر ”جئے ہشتہتی ناتھ“ کا نعرہ لگایا تو جولی کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ وہ وجے کی جانب بڑھی اور اس کے ساتھ ہی ہال میں بیٹھے ہوئے مہمانوں میں بھی ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ سے اٹھ رہے تھے۔



ایک ناممکن سی نظر آنے والی بات اچانک ممکن ہو گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی معجزہ رونما ہو گیا ہو اور صرف چند منٹوں میں ہی ملک کی قسمت کا پانسہ پلٹ گیا ہو۔

شہری آبادی ہو یا گاؤں کی بستیاں ہوں۔ جنگل کا علاقہ ہو یا پہاڑوں کے آس پاس کی آبادی ہو۔ دوسری صبح کا سورج نکلنے سے پہلے ہی نیپال کے کونے کونے میں راجا شاہی حکومت کے خاتمے کی خبر پھیل چکی تھی۔

اپنے مذہب، اپنے رواج، اپنے عقیدوں اور اپنے اصولوں پر مکمل ایمان رکھنے والے اور ان سب چیزوں سے کبھی بٹاوت کرنے کا تصور بھی نہ کرنے والے نیپال کے لوگوں نے اس خبر کا تو ایک ہی مطلب نکالا تھا کہ یوراج چندر بھوشن کے جرم پر بھگوان سخت ناراض ہوئے ہیں۔ اس لیے نیپال پر سے راجا شاہی حکومت کا خاتمہ ہو گیا ہے..... رات جب لوگوں نے یوراج کے گناہوں کی قلم دیکھی تھی تو اس وقت ہی انہیں لگا تھا کہ ایسے مہاپاپ سے تو دھرتی کا سینہ پھٹ جانا چاہیے۔ پہاڑوں کو ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جانا چاہیے اور دریاؤں کے پانی کو سوکھ جانا چاہیے لیکن اس کی بجائے راجا شاہی دور کا خاتمہ ہو گیا اور یوراج چندر بھوشن جیسا شیطان اپنے ہاتھوں اپنی موت مر گیا۔ دیوتاؤں کا عذاب صرف راج محل پر ہی گرا تھا۔ عوام پر کسی قسم کا قہر نازل نہیں ہوا تھا اور اس بات سے وہ سب خوش تھے۔

نیپال کے عوام کے جوش و خروش کا تو یہ عالم تھا کہ جیسے ان کے لیے آزادی کا

ہمارا چہ چندر بھوشن کے گناہوں کا بوجھ اپنے سر پر اٹھا کر آپ سب کی نفرتوں کے تیر سہتا ہوا اپنی کوٹھی ہوئی بہن کو تلاش کرنے کے لیے اپنا یہ وطن چھوڑ گیا تھا لیکن آج وہی معمولی وجہ ہشتہائی ناٹھ کی مہمانی سے یوراج جیسے شیطان کا اصلی چہرہ آپ کے سامنے بے نقاب کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ یہ یوراج چندر بھوشن کے باپ ہی تھے جو آج نیپال کی دھرتی پر سے نام نہاد راجاؤں کی حکومت کے خاتمے کا سبب بنے ہیں۔ اس آزادی کا اصل سرا تو نیپال کے ان سوا دو سو نوجوانوں کے سر جاتا ہے جنہوں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر آزادی کے چراغ کو روشن کیا ہے لیکن ان سوا دو سو جانثاروں کے دلوں میں آزادی کی چنگاری بھڑکانے والے شخص کا نام ہے گوبی ناٹھ..... یہ گوبی ناٹھ وہی ہے جس نے آج سے پونے دو ماہ قبل صرف اپنے تین ساتھیوں کی مدد سے رائل نیپال بینک کے ستاون لاکھ روپے لے جانے والے جہاز کو اغوا کیا تھا۔ ایسا کر کے گوبی ناٹھ نے راجا شاہی حکومت کے خلاف اپنی بغاوت کا پہلا قدم بڑھایا تھا۔ گوبی ناٹھ اس وقت کھٹمنڈو کے سنٹرل جیل میں قید ہے، اس لیے ہمارا سب سے پہلا کام اسے جیل سے آزاد کرانا ہے۔“ وجہ نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ محل کے باہر کھڑے ہوئے ہزاروں لوگ ایک آواز ہو کر نعرے لگانے لگے۔ ”گوبی ناٹھ زندہ باد..... گوبی ناٹھ زندہ باد۔“

لوگوں کے یہ جوشیلے نعرے تھے تو پھر وجہ کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ ”اپنی اسی خوشی کے جوش میں ہمیں اس عورت کی قربانی کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے جو یوراج چندر بھوشن جیسے ناپاک درندے کا پہلا شکار بنی تھی۔ وہ عورت جو آزادی کا چراغ روشن رکھنے کے لیے اپنے ہی غدار شوہر کی گولی کا نشانہ بن گئی۔ اس بہادر عورت کا نام ہے آشا، جو آج مر کر بھی امر ہو گئی ہے۔ اس کی زندگی نے بہت سے مردوں کو بگاڑا ہو گا لیکن اس کے باوجود اس نے دیلش اور دیلش کی آزادی کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ دے کر اپنے سارے باپ دھو ڈالے ہیں۔ اس لیے اس کی ارتھی عزت و احترام سے محل سے ہی اٹھے گی اور آج تک جس شمشان میں راجا ہمارا جاؤں کی ارتھی جلائی جاتی تھی۔ اسی شمشان گھاٹ پر اس کی چتا روشن ہوگی۔“

آشا کی قربانی کا سن کر باہر کھڑے ہوئے رگھوپتی اور شوبھا دنگ رہ گئے۔ شوبھا کی

آنکھوں میں تو آنسو جھلملانے لگے تھے اور رگھوپتی ایک گہرا سانس لے کر خلا میں گھورنے لگا تھا۔ اس وقت وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اگرچہ وجہ پر چلائی جانے والی گولی کو آشانے اپنے سینے پر نہ روک لیا ہوتا تو نہ جانے کتنا بڑا سانحہ رونما ہو چکا ہوتا۔ وجہ کو اگر وہ گولی لگ جاتی تو چاروں طرف سے مشین گنتیں آگ اگلنے لگتیں اور ہینڈ بم پھٹنے لگتے۔ ایسا ہوتا تو نہ جانے کتنے ہی ملکوں کے سفیر اور وزیر اس تباہی کی لپیٹ میں آجاتے۔ آشانے اپنی جان دے کر صرف وجہ کی ہی جان نہیں بچائی ہے بلکہ اس نے سینکڑوں قیمتی جانوں کو ضائع ہونے سے بچا لیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے کسی زبردست خون خرابے کے بغیر جدوجہد آزادی کی کشتی کو بھی پار لگا دیا ہے۔

”آج کے بعد سے دنیا بھر کی نگاہیں ہماری ایک ایک حرکت پر مبذول ہو جائیں گی۔“ تھوڑی دیر بعد وجہ کی آواز پھر مائیک پر گونجنے لگی۔ ”یہاں بیٹھے ہوئے تمام لوگ ہمارے معزز مہمان ہیں اور مہمانوں کی خدمت اور ان کی حفاظت ہماری سب سے اہم ذمہ داری ہے۔ ان سب مہمانوں کو ہمیں یہاں سے بے حد عزت و احترام سے رخصت کرنا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ شاہی خاندان کے کسی فرد کی جانب اب ہمیں انگلی اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جس نے باپ کیا تھا، اسے اس کی سزا مل چکی ہے اور جو اس باپ میں ساتھی دار بنا ہوا تھا، اس ہری پرشاد کو اس کے جرم کی سزا ملے گی۔ جس کو ٹھہری سے ہمیں گوبی ناٹھ کو آزاد کرانا ہے، اسی جیل کی کوٹھری میں ہری پرشاد کو پہنچانے کا کام پولیس کا ہے۔“ اتنا کہنے کے بعد وجہ نے ”جئے ہشتہائی ناٹھ“ کا زور دار نعرہ لگایا تو محل کے اندر اور باہر کھڑے ہوئے لوگوں کے جوابی نعروں سے آسمان گونج اٹھا۔



ادھر بھارت میں بدھ کی صبح کو تمام اخباروں میں بھارت کے وزیر بے محکمہ کے کالے کرتوتوں کی کہانی کی تنگ دھڑنگ تصویروں کے ساتھ شائع ہوتے ہی پورے ملک میں سنسنی سی پھیل گئی۔ بھارت کی حکومت نے اپنے وزیر بے محکمہ کی نیپال کے ایک اسپتال میں ہونے والی موت کی خبر کو ابھی تک پوشیدہ رکھا ہوا تھا لیکن بھارت کے

اخباروں نے نیپالی اخباروں میں شائع ہونے والی خبروں کے حوالے سے ساری کمائی چھاپ دی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو حزب مخالف کی تنقید سے خود کو بچانے کے لیے کافی ہاتھ پاؤں مارنے پڑے..... پر شورام کے قلمی نام سے کسی نے اپنی کتاب میں ہندوستان کے وزیر بے محکمہ اور چند دوسرے وزیروں کے سیاہ کارناموں کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا تھا۔ جس کی وجہ سے اسمبلی اور اسمبلی کے باہر اس قدر شور شرابا ہونے لگا کہ حکومت کے لیے یہ بھی ظاہر کرنا مشکل ہو گیا کہ اس وزیر کی موت ہو چکی ہے اور اس کی آخری رسومات کہاں ادا کی جائیں گی۔ حکومت کو تو اب اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں لوگ اس کی ارتھی کے ہی چیتھڑے نہ اڑا دیں۔

ہندوستانی حکومت کو آخر حزب مخالف کے آگے اپنی شکست تسلیم کرنا پڑی۔ ”ٹائم بم“ نامی کتاب میں جن چار اور وزیروں کے نام شامل تھے، ان سے وزیر اعظم نے فوراً ہی استعفیٰ طلب کر لیا اور حکومت کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ ”ٹیٹم بم“ نامی کتاب میں لکھی ہوئی تمام باتوں کی تصدیق کے لئے فوراً ہی ایک عدالتی کمیشن قائم کیا جا رہا ہے۔ اگر کمیشن کی رپورٹ کے مطابق وہ سارے الزامات درست ہیں تو حکومت فوراً ہی مستعفی ہو جائے گی اور پھر مگر اس حکومت قائم کر کے وہ نئے انتخابات کا اعلان کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرے گی۔ بدھ کے روز ہی دوپہر کے وقت حکومت نے بڑی رازداری سے اپنے وزیر بے محکمہ دیون ورما کی لاش کو ایک لاوارث لاش کی طرح دور دراز کے ایک انجان شمشان گھاٹ روانہ کر دیا۔ اس لاش کے ساتھ صرف چار پانچ ہی کارندے تھے جنہوں نے اسے وہاں بڑی خاموشی سے چتا کے حوالے کر دیا۔

دوسری طرف ٹھیک اسی وقت نیپال میں بھی مہمان محل کے میدان میں یوراج چندر بھوشن کی لاش بھی آگ کی بھٹی میں جل کر اپنے گناہوں سے آزاد ہو رہی تھی۔ دونوں میں سے کسی ایک کی لاش پر بھی نہ تو کوئی آنسو بہانے والا موجود تھا اور نہ ہی کسی کو ان شیطان صفت لوگوں کی موت کا کوئی دکھ تھا۔

وزیر بے محکمہ دیون ورما کی بوڑھی ماں کو جب اپنے بیٹے کے سیاہ کارناموں کا علم ہوا تو اس نے گاؤں کے کنویں میں کود کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دنیا والوں سے منہ چھپا لیا

اور اپنے شوہر اور نیپال کے ہونے والے راجا یوراج چندر بھوشن کی شیطانی حرکتوں کو قلم کے پردے پر اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد اس کی بیوی بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔ پھر جب اسے ہوش آیا تو اس صدمے نے اس کا ذہنی توازن ہی بگاڑ دیا جس کے نتیجے میں ڈاکٹروں کو اسے مینٹل ہسپتال بھیج دینا پڑا تھا۔

پر شورام کے تخلص سے ”ٹائم بم“ نامی کتاب لکھنے والے مصنف کا اصلی نام معلوم کرنے کے بعد سی بی آئی کے جاسوس دہلی سے سیدھے الہ آباد کی ایک تنگ گلی کے ایک مکان میں پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر جاسوسوں کو پتا چلا کہ پر شورام کے اچانک لاپتہ ہو جانے کے بعد اس کی بیوی بست بیمار ہو گئی تھی اور آج صبح ہی دو تین اجنبی لوگ یہاں آئے تھے جو اسے اپنے ساتھ کہیں لے گئے ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ جانے کے بعد وہ بھی ابھی تک واپس نہیں آئی ہے۔

یہ سن کر سی بی آئی والے پریشان ہو گئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اخبار والوں کے ہاتھ یہ خبر لگ جائے۔ اس خبر کے پھیلنے سے حکومت اور پولیس کی کافی بدنامی ہونے کا خدشہ تھا۔ اسی لیے سی بی آئی اور پولیس والے اس خبر کے عام ہونے سے پہلے ہی پر شورام کی بیوی کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے دوڑ بھاگ میں مصروف ہو گئے۔ پوری رات میں انہوں نے الہ آباد کے ایک ایک گھر کی تلاشی لے ڈالی لیکن پر شورام کی بیوہ ساوتری کا کہیں پتا نہیں چلا اور تب لوگوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ خود حکومت نے ہی ساوتری کو غائب کر دیا ہے۔ صبح ہوتے ہی یہ افواہیں الہ آباد کی گلیوں سے نکل کر پورے ملک میں پھیل گئیں۔

اسی روز یعنی جمعرات کی صبح کے اخباروں میں ”ٹائم بم“ نامی کتاب کی لیڈی پبلشر شوہا ارون کے بارے میں ایک سرخی چمک رہی تھی۔ وفاقی وزیر دیون ورما کی زندگی پر سے پردہ اٹھانے کی ہمت کرنے والی شوہا زیر زمین چلی گئیں..... پی ڈی آئی خبر رساں ایجنسی کے مطابق یہ معلوم ہوا ہے کہ سنسنی خیز ناول ”ٹائم بم“ کے شائع ہونے تک کی کمائی بھی سنسنی خیز نہیں ہے۔ جس پریس میں یہ کتاب چھپی تھی، اس کے پتے پر جب پریس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی تو پتا چلا کہ اس پتے پر اس نام کا گھر پریس ہے ہی نہیں۔ پھر اخباری رپورٹروں نے کتاب کی پبلشر مس شوہا ارون کا گھر

ہوں کہ گھر جاسکوں اور گھر کے علاوہ میں کہیں بھی رہوں گا تو لوگ طرح طرح کے اندازے اور طرح طرح کی باتیں بنانا شروع کر دیں گے۔ پتا جی کے دل کو بھی چوٹ لگے گی۔ گھر اور اپنا وطن تیاگ دینے کے بعد میں تو محض اپنا ایک فرض ادا کرنے ہی یہاں آیا ہوں۔ جس وقت بھی یہاں کا کام ختم ہو گیا، میں اسی گھڑی وطن سے رخصت ہو کر تمہارے ساتھ چل پڑوں گا۔“

یہ سن کر جولی نے اپنے جسم میں ایک کپکپاہٹ سی محسوس کی تھی لیکن پھر بھی اسے نیپال چھوڑ کر جانے کی بات سے جو صدمہ ہوا تھا۔ اس کا اظہار اس نے اپنے چہرے سے نہیں ہونے دیا تھا مگر پھر بھی وہ کہہ گئی تھی۔ ”سورگباشی مہاراجہ کے پاپ کا قرض ادا کرنے کے بعد بھی.....؟“ بولتے بولتے وہ ایک لمحے کے لیے رکی اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں آگے کہا تھا۔ ”تم اگر مجھ سے چلنے کے لیے کہو گے تو میں ایک منٹ کی تاخیر کے بغیر تمہارے آگے آگے چل پڑوں گی لیکن تم اپنے وطن کو چھوڑنے کی ضد میں خود پر عائد ذمہ داری سے بچنے کی کوشش تو مت کرو۔“

جواب دینے کی بجائے وجہ ایک ٹک اسے دیکھتا رہا اور پھر کچھ کہے بغیر چپ چاپ مندر کے اندر داخل ہو گیا تھا اور اس کے بعد سے ہی ہشپتی ناتھ کا مندر آزادی کے متوالوں کے لیے ہیڈ کوارٹر کا روپ اختیار کر گیا تھا۔

بدھ کی صبح سے ہی اخباروں کے خاص ضمیمے نکلنے شروع ہو گئے تھے اور دن بھر نشر کی جانے والی خبروں میں بھی عوامی حکومت کی داغ بیل پڑنے کی تفصیل سنائی جانے لگی تھی۔ آزادی کی ان خبروں میں وجہ اور گوبی ناتھ کے نام سرفہرست تھے۔ اس لیے ملک کے کونے کونے سے لوگ وجہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہشپتی ناتھ مندر کی جانب چلے آ رہے تھے۔ آزادی کی اس جدوجہد میں شریک ہونے والے سوا دو سو نوجوانوں نے بھی مندر کے باہر ہی پڑاؤ ڈال لیا تھا۔ روس، امریکہ اور چین کی طرف سے آزادی کی جنگ لڑنے والے لیڈروں کو ایک نئی عوامی حکومت قائم کرنے کے لیے مدد کی پیشکشیں آنے لگی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ اپنا ہاتھ بڑھائیں، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

لیکن ملک میں ایک نئی جمہوری حکومت کی تشکیل کے لیے ملک میں پہلی بار عام

ڈھونڈ نکالا لیکن وہاں سے پتا چلا کہ شوبھا اپنے باپ کے ساتھ پندرہ روز قبل ہی گھر چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔ اس پاس کے لوگوں کا کہنا ہے کہ شاید ”ٹائم بم“ جیسے خطرناک ناول کو شائع کرنے کے بعد شوبھا حکومت کی سختی یا اپنی گرفتاری کے خوف سے ڈر کر اپنے باپ ارون آزاد کے ساتھ کہیں زیر زمین پوشیدہ ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی پتا چلا ہے کہ شوبھا کا باپ ارون آزاد ہندوستان کی آزادی کی جنگ کا ایک فوجی تھا۔ اس جنگ میں برٹش پولیس کی دو گولیاں اس کی ٹانگوں پر لگی تھیں جس کی وجہ سے وہ اپاہج ہو گیا تھا اور اس کی بیٹی شوبھا وفاقی وزیر بے محکمہ دیون ورما کے جال میں پھنس کر بی کال گرل کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئی تھی۔ ”ٹائم بم“ نامی کتاب میں وہ پوری تفصیل موجود ہے کہ دیون ورما لڑکیوں کو کہاں کہاں اور کس کس کے پاس لے جاتا تھا۔ اس کے علاوہ نیپال سے بھی ”ٹائم بم“ کے بارے میں یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ وہاں ابھی دو روز قبل ہی جو تبدیلی آئی ہے یعنی راجا شاہی حکومت کو ختم کر کے جمہوری حکومت کے قیام کا جو اعلان ہوا ہے۔ اس میں بھی اس ”ٹائم بم“ نامی کتاب نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے کیونکہ دیون ورما اور نیپال کے ہونے والے مرحوم راجا یوراج چندر بھوشن اس گھناؤنے جرم میں شریک کار تھے۔



کھٹمنڈو کا عظیم الشان ہشپتی ناتھ مندر نیپال کے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ہزاروں لوگ تھے جو صبح و شام مندر کے ارد گرد منڈلاتے رہتے تھے۔ مندر کے پچھواڑے والے گھاٹ پر آٹاشی کی اڑتی کی آخری رسم ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں ادا کی گئی۔ پھر لوگ آہستہ آہستہ وہاں سے رخصت ہونے لگے۔

پھر وجہ نے ہشپتی ناتھ مندر کو ہی اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔ اسے مندر کے ایک حصے میں ٹھہرتے دیکھ کر جولی نے پوچھا تھا۔ ”مگر وجہ میں مندر میں تمہارے ساتھ کیسے رہ سکتی ہوں؟ مجھے وہاں رہنے کی اجازت نہیں ملے گی۔“

”میں جانتا ہوں جولی۔“ وجہ نے جذباتی لہجے میں کہا تھا۔ ”کچھ دنوں کے لیے ہمیں ایک دوسرے سے الگ رہنا ضروری ہے۔ فی الحال میں اس پوزیشن میں نہیں

”نہیں وجہ۔“ کافی دیر سے خاموش بیٹھے ہوئے گولی ناتھ نے بڑے ہی مستحکم لہجے میں اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ ”ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں نے حکومت کا بینک لوٹ کر اپنی جس مہم کا آغاز کیا تھا، وہ تو محض میری نفرت کا اظہار تھا۔ اسے آزادی کی جدوجہد کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ وہ راجا شاہی حکومت کے اصولوں کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ میرے سوا دو سو ساتھی بندوق اور بم لے کر تھوڑا خون بہا سکتے تھے۔ تھوڑی لاشیں گرا سکتے تھے اور تھوڑی سی دہشت پھیلا سکتے تھے لیکن پھر بھی وہ راجا شاہی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک نہیں سکتے تھے۔ منگل کی رات کو ہم نے جو کر دکھایا ہے، اس کا سرا بے شک ہم سب لوگوں کے سر جاتا ہے مگر کامیابی کا اصل سرا تو ہمارے ہی سر جاتا ہے کیونکہ اگر تم ہمت نہ کرتے تو یہ کامیابی ہمیں اور نیپال کی عوام کو حاصل نہ ہوتی۔“ گولی ناتھ کی اس دلیل کے بعد گھنٹوں بحث ہوتی رہی۔ دلیلیں پیش کی جاتی رہیں۔ ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ وجہ کسی طرح ان کی بات کو مان لے لیکن وجہ کسی طرح بھی جھکنے پر تیار نہیں تھا۔

رگھوپتی نے جب یہ دیکھا کہ وجہ جب کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہے تو اسے غصہ آگیا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔ ”میرا تو خیال ہے کہ ہم سب کو ہی اپنا وطن چھوڑ کر چلے جانا چاہیے۔ پھر چاہے ہمارا پڑوسی ملک چین، بھارت یا سپرپاور امریکہ اور روس اس چھوٹے سے ملک کو گود لینے کی دوڑ دھوپ میں مصروف ہو جائیں۔ پھر چاہے اس دیش کے لوگ ہمیں بددعائیں ہی کیوں نہ دیتے رہیں کہ ان چند جذباتی نوجوانوں نے ہماری دیوتاؤں کی سرزمین کو غیروں کی گود میں دھکیل کر ہمیں پھر سے غلام بنا دیا۔“ بولتے بولتے رگھوپتی کی آواز پھٹ رہی تھی۔ ”میں پوچھتا ہوں کہ جب اس دیش کو آزادی کے راستے پر چلانے کی ہم میں صلاحیت ہی نہیں تھی تو کیا ضرورت تھی اسے راجا شاہی حکومت کے چنگل سے چھڑانے کی؟“ اتنا کہہ کر رگھوپتی نے تھوڑی دیر رک کر سب کے چروں کی طرف دیکھا۔ ہر کوئی چپ چاپ بیٹھا اس کو دیکھ رہا تھا۔ رگھوپتی کو لگا کہ اس کی بات کا ان لوگوں پر گہرا اثر ہونے لگا ہے، اس لیے وہ پھر بولا۔ ”وجہ کبھی کبھی قربانی دینے سے بھی مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ تم تو اپنی زندگی دیش کی بھلائی پر نثار کر دینے کے لیے تیار تھے تو پھر اب تھوڑے دن اپنے

انتخابات کرانے تھے۔ اندرونی اور بیرونی مسائل کو مد نظر رکھنا تھا۔ پڑوسی ملکوں سے رابطہ قائم کر کے ان سے اس سلسلے میں مدد طلب کرنا تھی۔ اس کے علاوہ انتخابات کے لیے بھی بے شمار کام سر پر آئے تھے اور ان سب کاموں کو خوش اسلوبی سے انجام دینے والا کوئی لائق شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ گولی ناتھ، رگھوپتی، رانا اور شپرا وغیرہ سب سوچتے سوچتے تھک گئے تھے۔

ان کا کہنا تھا کہ یہ اتنے بڑے بڑے کام تو وہ کبھی کر ہی نہیں سکتے تھے۔ راجا شاہی حکومت کو ختم کرنے کی دھن میں وہ آئندہ اقدام کے بارے میں سوچنا ہی بھول گئے تھے۔ ملک کو کس طرح اس کی منزل کی طرف گامزن کرنا ہوگا، اس پر تو انہوں نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ اس وقت دنیا بھر کے ملکوں کی نگاہیں ان کی جانب اٹھی ہوئی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ وہ پہلا قدم کس طرف اٹھائیں؟

ایکایک ان سب نے سوچتے سوچتے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر ان کی نگاہیں ایک جانب خاموش بیٹھے ہوئے وجہ کے چہرے پر جم گئیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سب کسی نتیجے پر پہنچ چکے ہوں اور اب انہیں وجہ کی اجازت کی ہی دیر ہے۔

”بس اب ہم نے فیصلہ کر لیا ہے۔“ اچانک رگھوپتی باری باری سب کی طرف نظر دوڑاتا ہوا بولا تو دوسروں کے ساتھ ساتھ وجہ نے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر پوچھا۔ ”کس کا فیصلہ؟“

”یہی کہ اب اس دیش کا صدر کون ہوگا؟ اور.....“ رگھوپتی نے کہا لیکن وجہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے آگے کی بات کہنے سے روک دیا اور خود ہی بولا۔ ”لیکن یہ فیصلہ تو آزادی کی مشعل روشن کرتے وقت ہی ہو چکا ہے رگھوپتی۔“ وجہ اپنے تمام ساتھیوں پر نظر ڈالتا ہوا بولا اور گولی ناتھ کے چہرے پر نگاہیں جمادیں۔ چند لمحوں تک تو وہ گولی ناتھ کو گھورتا رہا، پھر مسکراتا ہوا بولا۔ ”راجا شاہی کے خلاف سب سے پہلے بغاوت کا علم بلند کرنے والا گولی ناتھ ہی ہے اور ہم گولی ناتھ کو ہی اس کرسی پر بٹھائیں گے۔“



وطن کو دینے کے لیے کیوں تیار نہیں ہو؟

رگھوپتی کی یہ دلیل اتنی زوردار تھی کہ وجے کی جھکی ہوئی گردن ایک جھٹکے سے اوپر اٹھ گئی اور اس بار وہ انکار نہ کر سکا۔ اس کی خاموشی کو رضامندی سمجھ کر گوپی ناتھ اور اس کے سوا دو ساتھیوں نے بیک وقت جیسے ہشمتی ناتھ کے ایسے زوردار نعرے لگانے شروع کر دیئے کہ آسمان گونج اٹھا اور اس طرح نیپال کے پہلے صدر کا انہوں نے استقبال کیا تھا۔



بیساکھ منہی کے ستوار کی صبح ہی صبح ہزاروں نیپالی باشندے اپنے مقدس مندر ہشمتی ناتھ کے آس پاس جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ عورتیں، بچے، جوان اور بوڑھے اس طرح امنڈے چلے آرہے تھے جیسے کوئی دیوتا انہیں درشن دینے کے لیے مندر میں آگیا ہو۔

زرق برق کپڑوں میں ملبوس یہ سارے لوگ آج اپنے ملک میں ایک جمہوری حکومت کے قیام کی بنیاد رکھنے کے لئے آئے تھے۔ شہنائیاں، ڈھول اور بینڈ بج رہے تھے اور جئے ہشمتی ناتھ کے فلک شکاف نعروں سے ماحول گونج رہا تھا۔

آج ایک برہمن ہندو بیٹا شاہی تخت پر بیٹھنے والا تھا۔ یہ بات چند روز قبل تک ایک ناقابل یقین اور ناممکن بات تھی مگر یہ ناممکن سی بات ممکن ہو چکی تھی اور لوگ یہ معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔

ایکایک ہشمتی ناتھ مندر کا گھنٹا زور سے بج اٹھا اور آس پاس کھڑے ہوئے سارے لوگ سنبھل کر اس طرف دیکھنے لگے۔ مندر کے اندر وجے تقریباً آدھی رات سے ہی مادوی کی پوجا میں بیٹھا ہوا تھا۔ پجاری نے پوجا ختم کرنے کے بعد جب پرشاد کی تھالی اس کے سامنے رکھ دی تو وجے نے اپنے کانپتے ہاتھ سے تھوڑا سا پرشاد اپنے ہاتھ میں لے کر پہلے اسے اپنے ماتھے سے لگایا اور پھر اپنے منہ میں ڈال لیا۔ پھر بھگوان کو آخری پرنام کرنے کے بعد اس نے خود کو سنبھالا اور پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑانے لگا۔ ”میں آج جس کرسی پر

بیٹھنے جا رہا ہوں، اس کرسی کی لالچ کبھی بھی میرے دل میں نہ پیدا کرنا بھگوان۔ مجھے ہمیشہ اس چمک دمک اور غرور و تکبر سے دور رکھنا۔ مجھ میں اتنی ہمت پیدا کرنا بھگوان کہ میں کسی تفریق، کسی لالچ کے بغیر اپنے دلش کر خدمت کر سکوں۔“ بھگوان تو دلوں کے بھید جانتا ہے۔ میرے دل میں اس کرسی پر بیٹھنے کی کوئی تمنا نہیں ہے۔ یہ بات تو اچھی طرح جانتا ہے لیکن اب مجھے اگر یہ ذمہ داری سنبھالنی ہی ہے تو تو ہر قدم پر میری رہنمائی کرنا۔ میں نے تیرے ہی آسرے پر اتنی بڑی ذمہ داری قبول کی ہے.....“ آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور پھر تھوڑی دیر بعد اپنے آنسو پونچھ کر وہ مندر سے باہر آگیا۔ مندر کے دروازے پر ہی اس کے سارے ساتھی اس کا استقبال کرنے کے لیے کھڑے تھے۔ گزشتہ رات تک اس نے کافی آناکافی کی تھی اور اپنے ساتھیوں کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ ”دیکھو ہم لوگوں کو یہ شاہی ٹھاٹ باٹ زیب نہیں دیتے۔ ہمیں سادگی اپنانا ہوگی۔ میں نے تم لوگوں کی بات مان کر یہ عمدہ قبول کر لیا ہے۔ کل صبح میں مندر سے نکل کر پیدل ہی شہر کا دورہ کروں گا۔“

لیکن رگھوپتی کی دلیل کے آگے ایک بار پھر اسے اپنا سر جھکا دینا پڑا تھا۔ رگھوپتی نے اس سے کہا تھا۔ ”وجے ایک بار جس ہاتھی پر بیٹھ کر تم نے وطن چھوڑا تھا اور جس رعایا نے تمہیں نفرت سے دھتکار کر ملک سے باہر نکالا تھا، آج اسی ہاتھی پر سوار ہو کر تمہیں رعایا کا سلام قبول کرنا ہے۔ یہ تمہاری ہی نہیں بلکہ ہماری بھی عزت کا سوال ہے اور تمہیں ہماری یہ بات ماننی ہوگی۔“

”رگھوپتی عمدے کی یہ اونچائی بعض اوقات انسان کو انسانیت سے نیچے گرا کر انسان سے شیطان بنا دیتی ہے۔“ وجے نے بڑے ہی گھمبیر لہجے میں کہا تھا۔ ”پہلے آدمی اونچائی پر پہنچنے کے لیے بہت کچھ کرتا ہے۔ پھر اسے اونچائی سے نیچے کے لوگ بہت چھوٹے اور حقیر دکھائی دینے لگتے ہیں مگر خیر میں تمہاری خواہش کو ٹھکرا کر کوئی بھی بدشگونی نہیں کروں گا مگر یاد رکھنا آئندہ تم میں سے کوئی بھی مجھے شان و شوکت دکھانے کے لیے زبردستی نہیں کرے گا۔ اگر ایسا کیا گیا تو پھر ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ اس وقت جس کرسی پر بیٹھنے کے لیے میں رضامند نہیں ہوں، اسی کرسی سے چٹنے

ماں کو یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔ اس گھر میں آکر میں نے اس کی جگہ تو لے لی تھی لیکن تمہارے ساتھ ہمیشہ سوتیلی ماں جیسا سلوک ہی کرتی رہی تھی مگر آج ابھی اسی وقت اور اسی لمحے تم صرف گھڑی بھر کے لیے مجھے اپنی سگی ماں سمجھ کر میرے سینے سے لگ جاؤ۔ ویسے تو میں مطلبی عورت کسی کی بھی سگی ماں بننے کے لائق نہیں ہوں۔“

سوتیلی ماں کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر وجے گھڑی بھر کے لیے کشمکش میں پڑ گیا لیکن پھر اپنی دونوں جانب کھڑی ہوئی جولی اور شوہا کو دیکھ کر اس نے اپنے قدم بڑھا دیئے۔

سوتیلی ماں نے آرتی اتار کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر وجے نے آگے بڑھ کر اپنے سوتیلے بھائی کھیل کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا لیکن یہ تھوڑی سی تاخیر بھی اسے بری طرح کھٹک رہی تھی۔ اس کا دل تو دروازے سے نکل کر اپنے پتا جی تک پہنچ جانے کے لیے بے قرار تھا۔

”پتا جی۔“ کہہ کر وہ آنگن میں داخل ہو گیا تو اسے راج پروہت جی اوپر سے نیچے اترتے ہوئے دکھائی دیئے۔ جب دونوں کے درمیان صرف پانچ سات قدموں کا فاصلہ رہ گیا تو یکایک وجے کے قدم رک گئے۔ اپنے سامنے اپنے پتا جی کی ہڈیوں کے ڈھانچے کو کھڑا دیکھ کر اس کا سینہ پھٹ گیا اور آنکھیں چھلک گئیں۔ ”اچھا ہوا بیٹا کہ ابھی میرے جسم میں جان باقی ہے اور تم آگئے۔“ پتا جی کے کانپتے ہوئے الفاظ نے وجے کو تڑپا دیا اور باقی کا فاصلہ وہ ایک چھلانگ میں ہی طے کر کے اپنے باپ کے قدموں پر گر پڑا۔ اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں نے اس کے باپ کے قدموں کو بھگو دیا۔

”اٹھ جاؤ بیٹے۔“ باپ کے کانپتے ہوئے ہاتھوں نے بیٹے کے سر کو سہلایا۔ ”ایک بار میں نے تمہیں بالوں سے پکڑ کر اس گھر سے باہر نکالا تھا مگر آج اپنے دل کو چیر کر تمہیں آشیرواد دیتا ہوں۔ بھگوان تمہیں شہتی دے اور تمہاری عمر دراز کرے۔“ کہہ کر انہوں نے وجے کو اپنے سینے میں دبوچ لیا۔ باپ بیٹے کا یہ ملن دیکھ کر سب کی آنکھیں پر نم ہو گئیں۔

رہنے کے لیے میں انسان سے درندہ بننے سے بھی نہیں گھبراؤں گا۔“ بڑے بوجھل دل سے وجے مندر سے نکل کر ہاتھی پر سوار ہوا تھا اور پھر ہزاروں لوگوں کے جلوس میں اس کی سواری دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی۔

اپنے سوا دو سو مجاہد ساتھیوں کے قافلے میں رگھوپتی، گوپتی ناتھ سب سے آگے تھے اور وجے کے ہاتھی کے دائیں بائیں جانب جولی اور شوہا چل رہی تھیں۔ سواری آگے بڑھتی جاتی تھی اور جگہ جگہ سے لوگ اس میں شامل ہوتے جاتے تھے اور پھر دھیرے دھیرے یہ جلوس ڈیڑھ پونے دو میل جتنا لمبا ہو گیا۔ آس پاس کے مکانوں کی چھتوں، کھڑکیوں اور جھروکوں سے لوگ وجے پر پھولوں کی پتیاں برسا رہے تھے۔

لوگوں کی محبت اور عقیدت کی اس بارش نے وجے کی آنکھوں کو دھندلا دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا جال سا تن گیا تھا۔ سواری اب اس کے گھر کے قریب سے گزر رہی تھی۔ جس کی چھت پر اس کے پتا جی کھڑے اپنے آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں سے اپنے بیٹے کی سواری کو دیکھ رہے تھے۔ وجے اپنے آس پاس کے ابھرتے ہوئے نعروں کے شور سے بے خبر ہو کر اپنے پتا جی کی بہتی ہوئی آنکھوں کو دیکھتا رہا..... پھر آدھے منٹ کے بعد اسے احساس ہوا کہ وقت کی طرح اس کی سواری بھی اس کے گھر کے سامنے رک گئی ہے۔

”وجے اپنے پتا جی کا آشیرواد نہیں لو گے؟“ رگھوپتی نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اسے نیچے اترنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ اس طرح ہاتھی کی پیٹھ پر سے کود پڑا جیسے اس کا دل اس کے بس میں نہ رہا ہو۔ پھر جب گھر کے اندر جانے کے لیے اس نے قدم اٹھائے تو اس کا جی چاہا کہ وہ دوڑ کر اندر چلا جائے مگر اسے اپنے جذبات کو اپنے قابو میں رکھنا پڑا۔

دروازے پر پہنچتے ہی اس کے قدم اس طرح دھرتی پر چپک گئے جیسے سوتیلی ماں سے کیے ہوئے بن باس پر جانے کے وعدے نے اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دی ہو۔ ایک لمحے کے لیے اس کا جی چاہا کہ وہ واپس لوٹ جائے مگر تب ہی اسے اپنی سوتیلی ماں کی آنکھوں میں آنسو دکھائی دے گئے اور پھر اندرانی کی ایک تھر تھراتی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”وجے تم نے جس ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے، آج اسی

”راج پروہت جی۔“ رگھوپتی کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ ”آشیرواد آپ کو صرف اپنے بیٹے کو ہی نہیں دینا ہے بلکہ اپنی بہو کو بھی دینا ہے۔“ اتنا کہہ کر اس نے جولی کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے کیا تو جولی نے ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر انہیں پرنام کیا۔ راج پروہت جی نے خوشی سے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے جولی کی طرف دیکھا۔ پھر اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر بولے۔ ”جنگوان تمہیں ہمیشہ سسکی رکھے اور تم دونوں کا پیار سلامت رہے۔“

پر جیسے ہی جولی وجے کی سوتیلی ماں اندرانی کے پیر چھونے کے لیے جھکی ویسے ہی وجے نے ایک دھماکہ کرتے ہوئے کہا۔ ”پتا جی میں روکھی کو واپس لانے کے لیے گیا تھا لیکن وہ تو ہم سے ہمیشہ کے لیے روٹھ کر بہت دور جا چکی ہے۔“ بولتے بولتے اس نے اپنے درد کو دبائے کی کوشش کی، پھر آگے بولا۔ ”لیکن پھر بھی میں خالی ہاتھ واپس نہیں آیا ہوں..... یہ شوبھا ہے پتا جی..... اور یہی اب ہماری روکھی ہے..... میری بہن۔“

یہ سنتے ہی شوبھا چونک پڑی اور اس طرح دو قدم پیچھے ہٹ گئی جیسے اسے یقین ہی نہ آ رہا ہو لیکن اسی وقت وجے نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی تھام لی اور بولا۔ ”یہ تو پہلا جھٹکا تھا شوبھا! ابھی تو دوسرا جھٹکا باقی ہے۔“ اتنا کہہ کر اس نے رگھوپتی کی طرف گردن گھمائی اور مسکرا کر بولا۔ ”تھوڑے دنوں بعد ہمارے اس آنگن میں منڈپ بچے گا اور باجوں گاجوں کے شور میں رگھوپتی آکر تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔“

شوبھا اس طرح اچھل پڑی جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہو۔ پھر جب رگھوپتی سے اس کی نظریں ملیں تو وہاں بھی اسے وجے کی بات کی تصدیق نظر آئی۔ تب اس کے ہونٹ تھر تھرائے۔ ”لیکن رگھوپتی..... آپ تو میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں..... پھر بھی؟“

”ایسی کوئی بات بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے شوبھا۔“ رگھوپتی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جذباتی لہجے میں بولا۔ ”اگر روکھی مجھے مل جاتی تو وہ جس حال میں ہوتی اور جیسی بھی ہوتی تو اسے میں قبول کرتا یا نہیں؟ بس یہی سمجھ لو کہ میری جستجو کامیاب ہوئی ہے اور مجھے روکھی کے روپ میں تم مل گئی ہو۔“

پھر اس سے پہلے کہ شوبھا اور کچھ کہتی۔ آنگن کے دوسرے کونے سے ایک آواز سنائی دی۔ ”بڑے بھائی..... تم آگئے؟“ بولتے بولتے بوڑھا نوکر مان سنگھ اپنی جھکی ہوئی کمر پر ہاتھ رکھ کر وجے کے پاس آگیا۔ ”میں تو سب سے پہلے یہی کہتا تھا کہ دیکھنا ایک روز بڑا بھائی ضرور اس گھر میں واپس آئے گا اور دیکھ لو آج تم آگئے نا..... اب“ اور باقی کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے کیونکہ وجے نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے کو اپنے سینے میں چھپا لیا تھا۔



صبح کے ٹھیک سوا دس بجے راج محل کے سامنے والے وسیع و عریض میدان میں جئے بھشہتی ناتھ کے زوردار نعروں کے درمیان وجے کمار ولد گوری شکر آریہ نے نیپال کے پہلے جمہوری صدر کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ تو اس وقت غیر ملکی مہمانوں کے درمیان ایک طرف ”ٹائم بم“ کے مصنف پرشورام کی بیوہ بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ بدھ کے روز صبح سویرے ہی رگھوپتی کے دو خاص آدمی پرشورام کی بیوہ کو اس کے الہ آباد والے گھر سے نکال لے گئے تھے اور پھر بذریعہ ہوائی جہاز وہ اسے کھنڈو لے آئے تھے۔ اس وقت تک اس بیچاری کو معلوم نہیں تھا کہ حق گوئی پر جان دینے والے اس کے مصنف شوہر کی قربانی کے بدلے میں ایک غیر ملک یعنی نیپال کے اجنبی لوگ اس کی اتنی عزت افزائی کریں گے۔“

پرشورام زندہ باد کے فلک شکاف نعروں سے سارا ماحول گونج اٹھا تھا اور ان نعروں اور تالیوں کے شور میں جب وہ اسٹیج پر آئی تھی تو وجے نے اس کی گردن میں پھولوں کے ہار ڈال کر اس کا استقبال کیا تھا اور ہزاروں لوگوں سے اس کا تعارف کرانے کے بعد کہا تھا۔ ”ساوتری بہن، آپ کو بیوہ بنانے والے درندے کو تو دیوتا کی طرف سے اس کے گناہوں کی پوری پوری سزا مل چکی ہے لیکن آپ کے سر کے تاج کو کون واپس لا سکتا ہے؟ پرشورام آج اس دنیا میں زندہ نہیں ہیں لیکن ان کی یاد ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہے گی۔ ہم ان کی ہمت، جرات اور حق گوئی کو سلام پیش کرتے ہیں۔“ اتنا کہہ کر اس نے ٹوٹوں سے بھرا ہوا ایک بریف کیس پرشورام کی بیوہ

ساوتری دیوی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا تھا۔ ”آدمی کی جان کی قیمت تو کوئی بھی نہیں دے سکتا لیکن اس کی لکھی ہوئی کتاب کے بدلے میں ہماری طرف سے اگر آپ یہ حقیر سی بھیٹ قبول کر لیں گی تو یہ آپ کا ہم پر بہت بڑا احسان ہوگا۔“

ساوتری دیوی نے شکریہ ادا کر کے اس حقیر سی بھیٹ کو قبول تو کر لیا تھا لیکن اس وقت وہ یہ کہاں جانتی تھی کہ اس بریف کیس میں ڈیڑھ لاکھ روپے ہوں گے۔

”راجا شاہی حکومت ہو یا کوئی عوامی حکومت ہو۔“ مائیک کے سامنے کھڑے ہوئے وِجے کی آواز گونجی تو ہزاروں لوگوں کی طرح ساوتری کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔

وِجے کہہ رہا تھا۔ ”ہر دور میں شیطان اور درندے پیدا ہوتے ہی رہیں گے لیکن ان کو ختم کرنے کے لیے قدرت پر شورام اور گولی ناٹھ جیسے بہادر لوگوں کو بھی پیدا کرتی رہے گی اور اس لڑائی میں جیت ہمیشہ سچائی کی ہی ہوگی، انسانیت کی ہی ہوگی۔“

اور تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں وِجے کے آگے الفاظ سنائی نہیں دیئے.....

ختم شد